خانقاہ

کاوش صدیقی



خانقاہ

روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) میں شائع ہونے والا مقبول ترین ناول

کاوش صدیقی

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون 042-37232336, 042-37352332

http://kitaabghar.com
کتاب گھر کی پیشکش

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب		خانقاہ
مصنف		کاوش صدیقی
ناشر		گل فراز احمد (علم و عرفان پبلشرز، لاہور)
مطبع		زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ		زاہد ملک
سن اشاعت		فروری 2013ء
قیمت		-/500 روپے

.....ملنے کے پتے.....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ
اُردو بازار، کراچی

جہانگیر بکس
بوہڑ گیٹ، ملتان

رشید نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں: 0300-9450911

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

انتساب!

خواجہ پیا
کی محبتوں، شفقتوں، شدتوں
کے نام
کہ جن سے میں
ظفر مند ہوا

کاوش صدیقی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	خانقاہ	06
2	تمہیں ترک کیا میں نے	16
3	زندگی کی گزری بے برکت ساعتوں میں	26
4	جن پر میرے تجسس کی کتاب لکھی تھی	37
5	نادیدہ مہرے جو نظر نہیں آتے	49
6	بھائی کو کتے کھا گئے	59
7	لفظ تاثر کو منتقل کرنے میں بے بس ہو جاتے ہیں	71
8	شرط مٹی کا ڈھلنے پر راضی ہونا ہوتا ہے	83
9	بندہ ہم راز ہو جائے تو بوجھ کم ہو جاتا ہے	95
10	اپنی اپنی خواہشات کی گندگی میں لتھیڑ دیا	108
11	اپنی بے نیازی کا رُعب جمانا چاہتا تھا	121
12	کیسا بھید بھرا آدمی ہے اوپر سے سوکھا۔ اندر سے ہرا بھرا	133
13	سحر زدگی اور حیرانی کی ایک واردات	145
14	پست قامت عقلوں میں نکو	158
15	میں تجھ سے التجا کرتا ہوں تو اپنا عدل دکھا	171
16	جو پردہ ہے نگاہوں سے نگاہوں کے درمیان	184
17	جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں	198

http://kitaabghar.com

خانقاہ

خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اس کا سارا بدن ہچکیوں کے جھولے جھول رہا تھا۔ان آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔جن آنکھوں میں میرے عکس کے دیپ جلتے تھے۔وہ پھول سے رخسار، جو میرے قرب کے احساس کے ساتھ گلِ انار ہو جاتے تھے۔سپید پڑ گئے تھے۔چہرے کی شگفتگی نچڑے ہوئے لٹھے کی طرح ہو گئی تھی۔پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹ جن کی گلابیت سیاہ ہو رہی تھی۔ وہ سرو قد سراپا جو آپ اپنی بہار پر کھڑا جھومتا تھا۔خوف، اندیشے، اور رسوائی کے احساس سے خمیدہ ہوا جا رہا تھا۔

میری محبت، میرا عشق، میرا جنون، میرے حواس جب بھی کسی روپ میں مجسم ہوئے تو اس کی عبارت روحی کے وجود میں ڈھل گئی۔

میرا ماضی، میرا انتظار، میری کامیابی اور میری مایوسی میرے سامنے تھی۔

''اب۔۔۔اب میں کیا کروں؟'' اس نے بڑی مشکل سے جملہ ادا کیا اور میری طرف دیکھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا صرف ہم تھے۔مگر کیا ہم ہوتے ہیں؟ ہمارا ہونا تو کسی احساس کا باعث ہوتا ہے۔جب احساس ہی مفقود ہو جائے تو پھر اجسام کا تعارف، حوالہ کیسے بن سکتا ہے؟ مگر اس باوجود ہم تھے گریہ، مسلسل کی صورت!

''میں نے تو کہا تھا کہ انہیں جلا دو۔'' میں نے خط کی طرف دیکھا۔

''کیسے جلا دوں۔؟'' اس کے بدن میں خاکستر چنگاری بھڑک اٹھی۔پہلی بار کی طرح بارہ برس پہلے والے دن کی مانند۔

''کہاں رکھ سکو گی؟'' میں نے بہت آہستگی، بہت شکستگی سے کہا۔جیسے فلیش بیک آج کے منظر پر حاوی ہونے لگا ہو۔

زعفران کی خوشبو، چڑیا کی چہک، مردہ احساسات کی بو کبھی چھپ سکی ہے۔؟

''یہ تو میری زندگانی ہیں۔تمہیں کیا معلوم جب عورت کے اندر کے جذبات جاگتے ہیں۔اس کے اندر کی کھڑکیاں کھلنے لگتی ہیں۔ جذبوں کی دھوپ اندر جگہ بنانے لگتی ہے۔تو وہ لمحات، وہ معاملات، وہ واردات ہی تو آئندہ زندگی کا دیباچہ بن جاتی ہے۔جس پر ساری حیاتی کی بُنت ہوتی ہے۔

''تو پھر اب پچھتاؤ۔!'' بارہ برس جیسے حال میں بدل گئے۔

''تم اتنے بے مروت تو نہ تھے۔'' اس نے اپنی سپید انگلیاں چٹخائیں اور بے رحمی سے انہیں ایک دوسرے میں پھنسا کر موڑنے لگی۔ یہ اس کے ڈپریشن کی انتہا تھی۔

''نامحبت، ناپیسہ، ناتعلق، نامحبت کی حدت رہی پھر کاہے کی مروت؟۔''

''زندگی نے تمہیں بے رحم بنا دیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تمہارے متعلق سب یہی کہتے ہیں۔''

''جب کوئی تعلق کوئی واسطہ دل کو چھوتا ہی نہ ہو تو پھر راہ و رسم بڑھانے کا فائدہ۔؟ جب سارا وجود پتھر کا ڈھیر بن جائے ہر کوئی اپنی غرض کی چھینی سے اپنے مطلب کے خدوخال تراشنا چاہے تو پھر کیا کرے، بے مروتی، بے رخی، بے اعتنائی ہی سب سے بڑی پناہ گاہ ہوتی ہے۔

''لیکن میں تو تمہاری ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں بھڑک اٹھا۔ ''اس وقت ہماری محبت افلاطونی تھی۔ زندگی کے جمالیاتی پہلو آٹے کے کنستر سے زندگی کا جواز طلب کرتے تھے۔ زندگی کے پہیے چلانے کے لئے محبت اور جذبات نہیں۔ کرولا اور پراڈو کے ٹائر ضروری تھے۔ اور احساسات تو سورج مکھی کے پھول تھے۔ صبح ہوتی، سورج کے عشق میں جلتے جلتے اس کو تکتے تکتے شام کو اپنی چمک رو پہلی پتیوں کو مایوسی کی پیلاہٹ میں چھپا کر مرجھا جاتے۔ اور پھر ان کا سارا حسن، طاقت، تابانی، بے رحم آئل فلٹر کشید کر لیتے۔ یہ تھا تمہارا محبت اور تلخ حقائق کا تجزیہ۔۔۔ اور اب۔۔۔!

''جو کہنا چاہو کہو۔!'' وہ سر جھکا کے بولی۔

''تمہیں اختیار ہے۔ لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں کہ تم آج بھی پہلے سے زیادہ پریشان ہو۔!''

مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔

''لفظوں کو بے وجہ مروت کا زہر کیوں پلا رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''صاف صاف کہو نا کہ تم اب بھی پھٹیچر، تباہ حال اور معاشرے کی روتی، بلکتی، بے بس مخلوق میں شامل ہو، جن کا مایوسی اور نامرادی کا برزخ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ المعروف ناکام، احمق، آدرشی لوگ۔!''

وہ چپ رہی۔

پھر بولی ''لیکن اب کیا ہوگا۔؟''

''مخملیں قالین والے بڑے گھروں میں خوشحالی اور سکون کے درمیان اس کا حل ڈھونڈ لو۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' وہ یاسیت زدہ لہجے میں بولی۔ ''اور تم میرے فیصلے کی توجیہات کو سمجھ سکتے۔ میں نے محبت تو تم سے کی۔ لیکن قربانی اپنی بزدلی، کم ہمتی کی وجہ سے نہ دے پائی اور شائد اب بتانے کا فائدہ بھی نہ ہو۔''

''میں ماضی کی ڈگڈگی نہیں بجانا چاہتا۔'' میرا لہجہ بڑا بے مروت تھا۔

''شائد میں غلط تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی پہلی محبت سے کوئی بھیک لے سکوں گی۔!''

''ماضی کے مزارِ محبت پر چراغ جلانے سے اب کیا حاصل۔؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔ ''تم تو بڑے طمطراق سے چلی گئی تھیں۔ مگر میں نے تو اس محبت کو مزار نہیں بنایا۔ مزار بناتا تو دربار سجاتا، پھر میلہ لگتا، عشق کا ڈنکا بجتا۔ پھر تو میرے پردے میں بولتا، تیرے پردے میں میں بولتا، کیا ملتا؟ لنگر، روٹی، میٹھے چاول، بتاشے، بھنے ہوئے چنے، تازہ پھول جو گاہک کے انتظار میں باسی ہوتے یا مزار کی رونق بنتے اور مرجھا کر نابود ہو جاتے۔ ہر صورت میں عشق کا، پھریرا میری کامیابی کا سہرا تیرے ہی سر سجتا۔''

دفعتاً میں بے قابو ہو گیا۔ میں نے گلاس اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا۔

''دفعان ہو جا ڈرامے باز، سود خور، مردار گدھ دفعان ہو جا۔۔۔!''

گلاس بڑی زور سے دیوار پر پڑا اور کرچیوں کی صورت ہمارے درمیان پھیل گیا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے خط کو دیکھا اور اس خط کو بڑی زور سے مٹھی میں بھینچ لیا اور بھاری بھاری قدموں سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ ننگے پاؤں کانچ کے ٹکڑوں سے گزرتی ہوئی گئی ہے، اور اپنے پیچھے اپنے پیروں سے رستے ہوئے ننھے ننھے لہو کے قطرے چھوڑ گئی ہے۔

باہر کسی نے پردہ اٹھایا کمرے میں روشنی داخل ہونے لگی۔ کانچ کے ٹکڑے روشنی کو منعکس کرنے لگے اور درمیان میں پھیلے ہوئے لہو کی بوندوں کو جلا بخشنے لگے۔

☆.....☆.....☆

حسب معمول عشاق کی محفل جمی تھی۔ طوطئ شکر مقال کی چہک سب سے دل آویز تھی، اور عشاق کا ہجوم انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ میں جا کر خاموشی سے پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ میں یہاں عقیدتاً نہیں عادتاً آتا تھا۔ مجھے ان خرافات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کسی کا بچہ نہیں ہو رہا ہو تو وہ دعا کے لئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ کسی کو پولیس تنگ کر رہی ہے تو وہ تحفظ کی درخواست لئے چلا آ رہا ہے۔ کسی کو کینسر ہے تو وہ شفاء کے لئے لوٹیں لگا رہا ہے۔ عجیب گورکھ دھندا بنایا ہوا تھا لوگوں نے۔ بہت ماننے والے تھے ان کے۔ کوئی کہتا تھا کہ ملک کا ہر بڑا آدمی ان کا مرید ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ بڑے بڑے سیٹھ ان کی مرضی کے بغیر دم نہیں مارتے۔ اسٹاک ایکسچینج کے بروکر ان کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ گویا قادری سرکار اپنی ایک متبادل اسٹیٹ چلا رہے ہیں۔

مجھے سوچتے ہوئے ہنسی آ گئی۔

میرے برابر بیٹھے ہوئے عقیدت مند نے غصے سے مجھے دیکھا اور زیر لب مجھے بولا۔ ''کیا پاگل ہو؟ جو آپ ہی آپ ہنس رہے ہو؟''

میں نے زبان نکال کر اسے چڑائی، وہ بڑی طرح بھنا گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ''باہر نکل پھر بتاتا ہوں''

''ابے یہاں پہلوانی کرنے آیا ہے کیا۔؟'' تیسرا جو گردن گھسیڑے ہم دونوں کو چونچیں لڑاتا دیکھ رہا تھا غصے سے بولا۔

''تو دیکھ نہیں رہا یہ کیا کر رہا ہے؟'' وہ بولا

''تو چپ کرا گلا پاگل ہے۔ تو بھی پاگل بنے گا کیا۔؟'' اس نے فیصلہ صادر کیا۔

اس کی بات سن کر بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ چند لمحوں میں۔۔ صرف چند لمحوں میں، ذرا سے رویئے کو دیکھ کر ہم کتنی جلدی فیصلے صادر کر دیتے ہیں۔

وہ دونوں پھر اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ بڑے دھیمے، دلنشیں انداز میں کہہ رہے تھے۔

''جب طلب عادت بن جائے تو شوق ختم ہو جاتا ہے۔ جب شوق ختم ہو جائے تو جستجو مر جاتی ہے۔ اور اگر جستجو مر جائے تو طلب بھیک کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ اور بھیک اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ نہ مقامات ملتے ہیں۔ نہ سفر طے ہوتا ہے، فقط وقت کا زیاں ہوتا ہے۔''

''سبحان اللہ۔۔۔'' مریدوں کا ایک شور اٹھا۔

''طلب کے لئے، مقامات کے لئے اور سب سے بڑھ کر مرشد کی توجہ کے لئے مسلسل شوق، مسلسل جستجو چاہئے۔'' ایک مرید نے بے ساختہ کہا۔

''کسی طرف سے احترام آمیز لہجے میں کہا گیا۔ ''سرکار اجازت ہو تو اپنی تشنگی مٹالوں۔!''

قادری سرکار نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔

''سرکار شوق کی انتہا کیا ہے۔؟''

''عشق۔۔۔!''

''اور سرکار عشق کی انتہا کیا ہے۔؟''

فرمایا ''حیرت۔۔۔!''

پھر حیرت کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد کیا ''حیرت وہ مقام ہے۔ جہاں ایسا تحیّر ہے کہ سوائے باری تعالیٰ کے وجود کے کسی اور وجود کو ثبات نہیں ہے۔ حیرت ہر شے کو فنا کر دیتی ہے اور فقط ذات باری کا ادراک رہ جاتا ہے، اور ذات باری تعالیٰ ہی حیرت کی انتہا ہے!''

''سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔!'' چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔ قادری سرکار اٹھے، ایک مرید نے جھٹ جوتیاں آگے کیں اور بہت سہج سہج کر انہیں پہنانے لگا۔

میں مریدوں میں بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مسکرائے اور زیر لب بولے۔

وہ بہت دور تھے کم از کم ہمارے درمیان پچاس افراد کا فاصلہ ہوگا۔ مریدوں کا شور تھا۔ مختلف آوازیں تھیں۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے زیر لب میرے کان میں کہا ہو۔ ''محبت گزیدہ میرے پاس آؤ۔۔۔!''

پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ اور دروازے سے باہر کی طرف دوڑنے لگا۔

☆.....☆.....☆

دوڑتے دوڑتے میں افسر درزی کے تھڑے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں منہ کھولے سانس لے رہا تھا۔ زبان، حلق سب بری طرح خشک ہو رہے تھے۔ کسی نے مجھے پانی کا پیالہ پکڑایا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر غٹا غٹ پینا شروع کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں پیالہ خالی ہو گیا۔ پانی پی کر ذرا سانس ٹھکانے آئی تو میں نے اردگرد دیکھا اور پھر بری طرح چونک گیا۔

یہ افسر درزی کا تھڑا نہیں تھا۔ کسی جگہ کی اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، میں کسی پہاڑی کے دامن میں اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کے نچلے حصے پہ بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایک ملنگ تھا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے۔؟'' میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

''کیا بات ہے۔؟'' اس ملنگ نے، جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بڑی نرمی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔!'' دفعتاً بے بسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کم مائیگی، بے چارگی، نامرادی جیسے بے شمار سیاہی مائل کالے، بھورے رنگ میرے اوپر چھا گئے اور میں بلک بلک کر رونے لگا۔

''کیا ہو رہا ہے۔؟'' کسی نے میرے شانے پر شفقت آمیز تھپکی دی۔ ''رولو۔! رونے سے کثافت دھل جاتی ہے۔ زنگ چھٹنے لگتا ہے۔'' ملنگ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں کہا۔

دفعتاً میں نے سر اٹھایا تو میرا دماغ حیرت کے جھٹکے سے شل ہو گیا۔

وہ ملنگ نہیں قادری سرکار تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک دل آویز من موہنی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے مخاطب کو اپنے دائرے میں قید کر رہی ہو۔

اگلے ہی لمحے میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

''تم یہ میرا چھوٹا سا کام کر دو۔!'' میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''یہ چھوٹا سا کام ہے۔؟'' قدیر چیخا ''جب بھی آتا ہے کوئی نا کوئی پنگا کھڑا کر کے آتا ہے۔ احمق کا پٹھا۔''

میں چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

''تو خود ہی بتا اتنی جلدی سب کچھ ہو سکتا ہے۔!'' میرے اوپر وہ اپنے جملوں کا ردِعمل نہ دیکھ کر دھیما پڑ گیا۔

''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔؟'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''ایک لمحے میں زندگی مل سکتی ہے۔، موت آ سکتی ہے۔ دکھ، سکھ کی خبر آ سکتی ہے۔ زلزلہ آ سکتا ہے۔ کیا نہیں ہو سکتا۔؟''

''کاش میں احمق کا پٹھا تجھ جیسے احمق کے پٹھے کا دوست نہ ہوتا۔'' وہ اتنی بے چارگی سے بولا کہ بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔

''یہ کیا ڈرامہ ہے۔؟'' قدیر نے میری ہنسی کی پرواہ کئے بغیر میرے ہاتھ سے کاغذات کا پلندہ چھین لیا۔

''یہ خطوط ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کس نے، کس احمق کے پٹھے کو لکھے ہیں۔'' احمق کا پٹھا قدیر کا تکیہ کلام تھا۔

''مجھ احمق کے پٹھے نے تیری اماں کو لکھے ہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

قدیر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ میرے سر کا نشانہ لیکر پھینکا۔ میں اپنے جملے کے شعوری ردعمل کے لئے تیار تھا۔ میں نے جھکائی دی اور کپ سیدھا ہوا میں اڑتا ہوا قدیر کے ابا کے ماتھے سے جا ٹکرایا۔ جو دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

''پاجی، گدھے کے بچے باپ کو پھوڑ دیا۔'' یہ قدیر کے ابا کا تکیہ کلام تھا۔

قدیر ہڑبڑا کے دوڑا ''ابا۔۔۔ ابا میں نے آپ کو نہیں مارا تھا۔ یہ احمق کا پٹھا جھکائی دے کر بچ گیا۔''

''تو تنزیل کو مار رہا تھا پاجی۔۔۔ گدھے کے بچے۔۔۔'' وہ کراہتے ہوئے دفتر کی سیٹھی پر ڈھیر ہو گئے۔

میں اس تمام عرصے میں خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔

قدیر نے جلدی سے جیب سے رومال نکالا اور منہ کی بھاپ سے گرم کر کے ان کے ماتھے کو سیکنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے زوردار تھپڑ قدیر کے منہ پر پڑا اور ساتھ ہی قدیر کے ابا گرجے۔ ''پاجی، گدھے کے بچے سگریٹیں پی پی کر باپ کو سینک رہا ہے۔''

''ابا آپ تو بس۔۔۔!'' قدیر کے گالوں پر ابا کی پانچوں انگلیاں چھپ گئی تھیں۔ دراصل تھوڑی دیر پہلے وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا اور پھر ابا کی سینکائی کرنے لگا۔ تو اس کو یاد ہی نہ رہا کہ اس کے منہ میں سگریٹ کی باس بھری ہوئی ہے۔

اس سے پہلے کہ مزید کوئی اور واقعہ رونما ہوتا قدیر کی اماں نے دروازے سے سر نکالا۔ ''ارے میں کہتی ہوں صبح سے یہاں پڑے کیا کر رہے ہو۔ قدیر کے ابا اندر آ جاؤ چائے تیار ہے۔!''

''اس پاجی کے جوتے کھانے آیا تھا۔'' قدیر کے ابا نے دانت کچ کچا کر قدیر کو دیکھا اور اپنا ماتھا سہلاتے، پیر پٹختے ہوئے اندر چلے گئے۔

قدیر کے ابا کے اندر جاتے ہی اندر دبی ہوئی ہنسی نے گویا حلق کا راستہ پکڑ لیا اور ہم دونوں قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے، پیٹ دُکھنے لگا، پسلیاں توبہ توبہ کرنے لگیں، کھل کر ہنسنا بھی بدن کے کتنے حصے متاثر کرتا ہے۔ یہ ہمیں آج پتا چل رہا تھا۔

''یہ سب تیری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' قدیر پیٹ پکڑ کے کراہا۔

''ہر چیز کسی نہ کسی سبب سے مشروط ہے۔!'' میں نے فلسفانہ کہا۔

''فلسفہ مت جھاڑ۔!'' قدیر بھنا کر بولا۔ ''یہ بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔؟'' اس نے کاغذوں کا پلندا ہاتھ میں پکڑ کر لہرایا۔

''وہ روحی آئی تھی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا۔۔۔؟'' مارے حیرت کے قدیر کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''وہ آئی تھی۔۔۔ اتنے برسوں کے بعد۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔!'' میں نے کہا۔

''کیوں۔؟''

''بہت پریشان تھی۔ میرے خط اس کے میاں نے دیکھ لئے تھے۔ اس کی ازدواجی زندگی شدید بھونچال سے دوچار ہے۔''

''جہنم میں جائے!'' قدیر نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔، بہت بڑی آدمی بننا چاہتی تھی نا۔، وہ ۔۔۔ بن گئی۔؟ اُن کے گھر چلی گئی جن کے باتھ روم دو۔ دو مرلے کے ہوتے ہیں۔ اور دل ننھے، چھچھورے۔۔۔!''

قدیر میرے ماضی کا گواہ تھا۔ روحی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم سب ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ وہ ہماری محبت کا راز دار تھا۔ ایک ایک لمحے کا شاہد تھا۔

ان دنوں جب روحی میرا جنون تھی، جذبہ تھی، احساس تھی۔ پھر ایک پارٹی میں اس کو ارسلان نے دیکھ لیا۔ جو کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور جس کے گاڑیوں کے شوروم ملک بھر کے تمام بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے روحی کے گھر اپنے والدین کو بھیجا اور پھر وہی ہوا جو کہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ کم مائیگی، بے چارگی، افلاطونی محبت، روپے کی گرمی، وسائل کی حدت، امارت کے اصولوں سے ہار گئی۔

مگر ملکیت میں شراکت کہاں ہوتی ہے اور پھر وہ عورت، جس کو اپنی سطح سے نیچے اتر کر اٹھایا جائے۔

یہی مرحلہ روحی کی زندگی میں آ گیا تھا۔

''تو سچ کہتا ہے لیکن۔'' میں نے ایک گہری سانس لیکر کہا ''میں بے مروت نہیں ہوں۔!''

''پھر کیا کرے گا۔؟'' قدیر نے پوچھا۔

''ان کو فٹافٹ چھاپ دے۔۔۔'' میں نے کاغذات کے پلندے کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ خطوط ہیں جو راز بک شیلف میں سجا ہو، وہ اپنا سحر کھو دیتا ہے۔''

قدیر ایک پرنٹنگ پریس چلاتا تھا، کمپوزنگ، ڈیزائننگ، بائنڈنگ اس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر مسئلہ تھا تو صرف وقت۔!

''لیکن یہ چار دن میں کیسے چھپے گا۔؟''

''ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔!'' میں نے ہنس کر کہا۔

پتا نہیں میری ہنسی میں کیا تھا کہ قدیر نے مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو آپ کے اندر تک اُتر جاتے ہیں، آپ کی ہر کیفیت کے نکتہ رس بن جاتے ہیں۔ نہ آپ ان سے کچھ چھپا سکتے ہیں، بتانے کی تو شائد، انہیں ضرورت ہی نہیں ہوتی، قدیر ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا، میرا دوست۔۔۔!

☆.....☆.....☆

پتا نہیں! قدیر نے کیا جادو دکھایا۔ کتاب مکمل ہو کر میرے ہاتھ میں تھی۔ پانچ دن میں اس نے کتاب چھاپ دی تھی۔ نام بھی کتاب کا اُس نے خود ہی رکھا تھا۔ ''سندیسے جو کھو گئے'' روحی کے خطوط کے ساتھ ساتھ اس میں دیگر لڑکیوں کے نام کے خطوط بھی شامل تھے۔ اب روحی کے خطوط ایک راز کی بجائے ایک کتاب کی صورت سامنے آ گئے تھے، بلکہ یہی نہیں قدیر نے چار پانچ سکہ بند ادیبوں کے قلمی تاثرات بھی اِن میں شامل کر دیئے تھے۔

وہ کتاب مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''یار مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ تو اتنا اچھا رائٹر ہے۔؟''

''یار یہ تو مجھے بھی نہیں پتا تھا۔'' میں نے فراغ دلی سے اعتراف کیا۔

''لیکن جن لوگوں سے رائے تو نے لکھوائی ہے۔ وہ تو بڑے مشہور و معروف ادیب ہیں۔ اتنی جلدی انہوں نے کیسے پڑھ لی۔؟''

میں واقعتاً حیرت زدہ تھا۔

''ابے سب ہم سے کتابیں چھپواتے ہیں۔ سال سال بھر کا ادھار کرتے ہیں میں نے سب کو بلوایا، چائے پلائی، ایک ایک خط پکڑایا اور کہا کہ پڑھ کر رائے لکھ دیں۔ انہوں نے لکھ دی۔!'' قدیر ہنسا۔

''ایک خط پڑھ کر پوری کتاب پر رائے دے دی!'' میں بے حد حیران ہوا۔

''ابے دیگ کے چند ہی چاول چکھے جاتے ہیں یا پوری دیگ کھائی جاتی ہے۔؟'' قدیر نے کہا۔ ''احمق کے پٹھے پہلے تعلقات کی بنیاد پر بانس پر چڑھا دیتے ہیں۔ اگر وہ باصلاحیت ہو اور ان سے آگے نکل جائے تو پھر خود ہی اس کے پیچھے لٹھ لیکر پڑ جاتے ہیں۔ ادب شدب کچھ نہیں، سب کاروبار و مصلحت۔'' قدیر نے چند جملوں میں ادب کا نقشہ کھینچ دیا۔

پھر میری طرف جھک کر بولا۔ ''ایک بات بتا!''

''بول۔؟''

''روحی کو تو میں جانتا ہوں۔۔۔ پر دیگر لڑکیاں کون ہیں۔ کب تیری زندگی میں آئیں۔ مجھے کیوں نہیں پتا چلا۔؟''

''روحی کے سوا کوئی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''باقی سب لڑکیاں تو تخیل کی پیداوار ہیں۔ روحی کی ازدواجی زندگی بچانے کیلئے جھوٹ گھڑنا اور لکھنا پڑا تو کیا ہوا۔ میں اس کو کچھ نہ دے سکا تو کم از کم اس کی ازدواجی زندگی تو بچا لوں۔ اس کے تین بہت ہی پیارے پیارے بچے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

قدیر نے اپنی انگلیوں سے میرے آنسو پونچھے، جو نہ جانے کب بہہ نکلے تھے۔

آنسو۔۔۔ جذبے۔۔۔ انتقام اور محبت کسی میں ہمارا، اختیار کہاں ہوتا ہے۔؟

''یار تو اس کو بہت پیار کرتا ہے آج بھی۔!''

''محبت بھولنے کے لئے نہیں ہوتی۔، دھیمے، دھیمے جلنے کے لئے ہوتی ہے۔، اس کی آنچ تا زندگی ساتھ دیتی ہے۔ بشرطیکہ آپ

کے اندر سچائی ہو۔ روحی تو مجھ پر نازل ہوئی تھی صحیفہء محبت کی طرح۔!''

قدیر کچھ نہ بولا۔ بس چپ رہا۔

ہم دونوں کے درمیان خاموشی رقص کرتی رہی اور ہم دونوں چپ کی مار سہتے رہے۔

☆.....☆.....☆

''تمہاری کتاب آئی تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔!'' میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ دالان میں اماں بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بولیں۔

''اماں قدیر نے چھاپ دی۔!'' میں نظریں چراتے ہوئے تخت کے ایک کونے پر ٹک گیا۔ آدھے صحن میں دھوپ اتر چکی تھی۔ اماں کے پاندان کی تھالی میں پانوں کے ساتھ ساتھ بہت ساری بیلے کی کلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مومی کا شوق تھا۔ وہ صبح ہی صبح سارے پھول توڑ کر کچھ میرے سرہانے اور کچھ اماں کے پاندان میں رکھ دیتی تھی۔

''اچھی کتاب ہے۔!'' اماں نے تبصرہ کیا۔

میں نے کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں اور تاثرات میں طنز کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔

''جو دوسروں کی عزت سنبھالتے ہیں وہ بڑا مرتبہ پاتے ہیں۔'' اماں دھیمے سے بولیں۔

''جی۔۔۔؟'' میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''تمہیں معلوم نہیں ان ۱۲ برسوں میں تم نے کیا حاصل کیا۔؟'' انہوں نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ بس ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولیں ''جب انسان دھیرے دھیرے کسی جذبے کے تحت سلگتا ہے۔ تو پھر اس کی روح میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لفظوں کا ذخیرہ تو تعلیم و معاشرہ ہمارے اندر بھر دیتا ہے۔ مگر ان کو برتنے کا سلیقہ ہمارا اپنا، اپنا ہوتا ہے۔ اور اسی سلیقے سے پہچان بنتی ہے، تمہیں اندازہ نہیں کہ تم لکھ سکتے ہو۔!''

''اماں۔۔!'' میں تخت پر پھیل کر، اماں کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔ اماں بہت نرم مزاج تھیں۔ مگر تربیت کے معاملے میں بہت سخت تھیں، غصہ بہت آتا تھا۔ کھری سیّدانی تھیں۔ جلال کا، جمال کا پیکر!

انہوں نے سر دتا ایک طرف رکھا اور میرا سر سہلانے لگیں۔

''مجھے اچھا لگا کہ میرا بیٹا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ جو دوسروں کو آسانی دیتے ہیں اللہ انہیں آسانی دیتا ہے۔ محبت کو برداشت کرنا ہی اصل مردانگی ہے۔ یہ بہت بوجھ ہوتی ہے، بہت وزنی۔۔۔!''

اماں کی انگلیوں کا لمس، لہجے کا رس، انداز کے گداز سے پتا نہیں کیوں میرے اندر اتھل پتھل مچ گئی اور اندر کا سارا غبار باہر نکلنے لگا۔

یہ مائیں خدا کی طرح اندر تک اُتری ہوئی ہوتی ہیں۔ سب کچھ جانتی ہیں۔ مگر چپ رہتی ہیں۔ آہستگی سے زندگی میں حصہ بنی رہتی ہیں اور طاقت دیتی رہتی ہیں، آگے بڑھنے کی، حالات کو فتح کرنے کی، مسلسل مہمیز دیتی رہتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

''زندگی مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے۔!'' وہ کہہ رہے تھے۔

مریدین، عقیدت مند، نہایت احترام سے ان کے ارشادات سے مستفید ہو رہے تھے۔

''بعض اوقات ہمیں احساس ہوتا ہے کہ شائد ہم بے تکی زندگی گزار رہے ہیں۔ صبح شام کچھ نہیں ہو رہا۔ سب کچھ ضائع ہو رہا ہے۔ مگر یہی بظاہر زیاں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ یاد رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی بہت سی صلاحیتوں کا علم نہیں ہوتا۔ اوٹ پٹانگ زندگی، گزر اوقت، کسی حادثے کے باعث، کارآمد ہو جاتا ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتیں منظر عام پر آجاتی ہیں۔

اگر آپ غور کریں تو آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑے عروج والے، بڑے نام والے ہوتے ہیں۔ مگر انڈے کی طرح حادثے کی ضرب سے ٹوٹتے ہی بہہ جاتے ہیں اور خالی خول رہ جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو بہت لش پش ہوتے ہیں۔ معتبری کا جھنڈا، نسب کا حصار انہیں بلند تر کرتا رہتا ہے، مگر پیاز کے چھلکے کی مانند جب ان پر اُفتاد آپڑتی ہے تو پرت اُترتے، اُترتے کچھ نہیں بچتا، بے روح، بے فکر کھوکھلا۔ ماجرا سامنے آتا ہے اور ہاتھ میں صرف بُورہ جاتی ہے۔ تیسرے وہ ہوتے ہیں جو سیپ کی طرح، صدف کی طرح، پانیوں میں لہروں سے لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، اور سخت سیپ کا خول توڑ کر دیکھو تو اندر سے نہایت آب دار موتی نکلتا ہے۔ بھرپور روح کے ساتھ۔ ہتھیلی پر رکھو، تو ہتھیلی سج جاتی ہے۔

اور دوستو۔! آدمی تو تیسری ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ سچے، مہنگے، مگر انہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔'' وہ گہری سانس لیکر خاموش ہو گئے۔

''سبحان اللہ۔۔۔واہ۔۔۔واہ۔۔۔حضور نے کمال کر دیا۔ سرکار کی مثالیں، سبحان اللہ۔۔۔'' مریدوں کے جملے، نعرۂ ہائے تحسین، عقیدت بے ساختہ باہر آرہی تھی۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا قادری سرکار دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کے اندر کچھ تھا۔۔۔لیکن مجھے ادراک نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں وہاں کیوں آتا تھا؟

میں انہیں محویت سے دیکھنے لگا۔

دفعتاً ان کی نگاہیں میری طرف مرتکز ہو گئیں۔ پھر جیسے سناٹا سا طاری ہو گیا۔

اچانک شور ہونے لگا۔ ہٹو بچو کی آوازوں نے ماحول بدل دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ پولیس کمانڈوز خانقاہ کے بیرونی دروازے کو گھیر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

تمہیں ترک کیا میں نے

دیکھتے ہی دیکھتے تیس چالیس کمانڈوز نے صحن کو بھر دیا ان میں سے کسی نے درشت لہجے میں عقیدت مندوں اور مریدین کو پیچھے ہو جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ مصلحت پسند عقیدت مندوں نے باہر کا رُخ کر لیا۔ جبکہ اکثریت نے دیواروں سے چپک کر وہیں رہنے کو ترجیح دی، بعض مریدوں نے احتجاج شروع کر دیا۔ مگر قادری سرکار نے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا، سرگوشیاں، آوازیں یک لخت اس طرح تھم گئیں کہ جیسے کسی نے اچانک پر شور ڈیک کا والیم آف کر دیا ہو۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

چند ہی لمحوں میں ایک سرو قد آدمی دو گھوڑے بوسکی کا کرتا، کڑکڑاتا ہوا گھیر دار شلوار، سیاہ واسکٹ زیب تن کئے ہوئے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا۔

اس پر نظر پڑتے ہی کئی آوازیں تحیر آمیز لہجوں کے ساتھ بلند ہونے لگیں ''ارے یہ۔۔۔ یہ تو شاہ صاحب ہیں! یہ کیسے آ گئے؟ ان کا یہاں کیا کام۔۔۔؟؟''

شاہ ہارون گیلانی بہت اہم منسٹری کے وزیر تھے۔ مرکزی حکومت میں ان کے خاندان کے کئی نامور لوگ شامل تھے۔ ان کی سیاسی وسعت کا یہ عالم تھا کہ لوگ یہ معلوم نہیں کر پاتے تھے کہ یہ اپوزیشن میں زیادہ ہیں یا حکومت میں۔۔۔ بڑے ٹھسے کے وزیر تھے۔ ان کے جلال کے قصے زباں زدِ عام تھے۔

شاہ ہارون گیلانی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے قادری سرکار کے آگے جا ٹھہرے۔

قادری سرکار ایک نرم سجل مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے، چند لمحے دونوں دیکھتے رہے ایک دوسرے کی آنکھوں میں، پھر میں نے دیکھا کہ قادری سرکار کے سامنے شاہ ہارون گیلانی کی نگاہیں جھک گئیں۔

''کیسے ہیں آپ سرکار۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''الحمد للہ۔!'' قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔ ''تشریف رکھئے۔۔۔!'' انہوں نے سامنے پڑے ہوئے موڑھے کی جانب اشارہ کیا، جو ان کے ایک نادیدہ اشارے پر کسی مرید نے بڑی پھرتی سے لا کر یہاں رکھ دیا تھا۔

''کچھ گفت و شنید کے لئے حاضر ہوا تھا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور اپنے اردگرد دیکھا۔

''ہماری تو صرف شنید ہو گی!'' قادری سرکار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔!'' دفعتاً جیسے شاہ ہارون گیلانی کے کروفر کا سلسلہ معاً ٹوٹ گیا۔ رعونت کا چھلکا تڑخ گیا اور اندر سے غرض بہنے لگی۔

''میں تو صرف دعا کے لئے حاضر ہوا ہوں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''علاقے میں ضمنی الیکشن ہو رہے ہیں۔ ہمارے مخالف بھی آہستہ آہستہ طاقت پکڑ رہے ہیں۔ لوگ ان کے ساتھ ہو رہے ہیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بڑے تحمل سے درخواست گذاری، مگر اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ان لوگوں کو انسان نہیں بلی، کتے سمجھ رہا تھا۔ جو اس کی راہ میں آ کر راہ کھوٹی کر رہے تھے۔

''وہ طاقت نہیں پکڑ رہے۔'' قادری سرکار نے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''وہ خلا کو بھر رہے ہیں جو تم لوگوں کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہو رہا ہے۔''

''کیا مطلب سرکار میں سمجھا نہیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بے اختیار کہا۔

''تم لوگوں سے صرف ووٹ کا، غرض کا، رشتہ رکھتے ہو۔ ان کی پیداوار، ان کی صلاحیتیں، سب رہن رکھ لیتے ہو، مگر ان کے حقوق، ان کے حالات پر توجہ نہیں دیتے۔ یاد رکھو! معاشرے کے کچلے ہوئے، پسے ہوئے لوگ اگر اکھٹا ہو جائیں، تو پھر انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔

''سرکار یہ تو کتابی باتیں ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور دھیمے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں رعونت اور صدیوں کا طمطراق تھا۔

''یہ کتابی باتیں نہیں حقائق ہیں۔ ذرا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر غور کرو، واحدانیت اور مساوات پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، دعوت پر لبیک کہنے والے امراء تھے یا عام، مزدور، غلام۔'' قادری سرکار نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک طرف تم ضمنی الیکشن میں جیتنا چاہتے ہو، دعا کے لئے آئے ہو۔ دوسری طرف تمہارے گماشتے لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں۔ اجتماعی آبروریزی کرتے ہیں۔ بدترین ظلم کرتے ہیں۔ بارہ سالہ طالب علم کو خدمت نہ کرنے پر شکاری کتوں سے نچواتے ہیں۔ دوڑاتے ہیں اور ان کی چیخیں یہاں، ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں۔!'' قادری سرکار کا لہجہ برہم ہونے لگا۔

''پرسوں جس لڑکی کی تمہارے منیجر طارق نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اجتماعی آبروریزی کی، جانتے ہو وہ کون تھی۔۔۔؟''

شاہ ہارون گیلانی کا منہ حیرت کی شدت سے کھل گیا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے رونما ہو گئے۔ سوالیہ نگاہیں قادری سرکار کے ہونٹوں پر تھم گئیں۔

''وہ بچی ہمارے مرید کی نہیں، ہماری بیٹی تھی۔ ہماری بیٹی ہے۔!''

ایک لمحے کیلئے تو مجھے لگا کہ جیسے حیرت، صدمے اور خوف سے شاہ ہارون گیلانی کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

''جب تک پیر، اپنے مریدوں کو، اپنی اولاد، اپنی آل، اپنا کنبہ نہیں سمجھتے وہ پیر نہیں بن سکتے۔ تم کیا خدمت کرو گے ہماری؟۔ تم ایک باپ کے آگے اس کی بیٹی کی آبروریزی کے مقدمے میں مجرم بن کر آئے ہو۔ شاہ ہارون گیلانی۔!'' قادری سرکار کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ شاہ ہارون گیلانی ہی نہیں، ہم سب کانپ گئے۔ میرے لئے نرم دل، شفیق، مہربان نگاہوں والے، میٹھی سجل مسکراہٹ لئے قادری سرکار کا یہ روپ اتنا انوکھا، اتنا نیا تھا کہ شائد مجھے حیرت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''سرکار۔!'' شاہ ہارون گیلانی آہستگی سے بولا۔

قادری سرکار چپ رہے۔

''سرکار۔'' شاہ ہارون گیلانی اٹھ کران کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''مجھے معاف کر دیجئے۔!''

''حجاج بن یوسف نے صرف سندھ سے ایک بیٹی کی پکار پر لشکر اسلام کو بھیج دیا تھا۔'' قادری سرکار کا لہجہ انتہائی پر تاسف تھا ''اور اس آج اس مملکتِ اسلامیہ کے کونے، کونے سے بیٹیوں کی، مظلوموں کی، چیخیں بلند ہو رہی ہیں اور تم لوگ خدا کے عذاب سے بے خبر ہو۔ جو بہت جلد سب کو اپنی گرفت میں لینے والا ہے۔ اللہ سریع الحساب!۔''

شاہ ہارون گیلانی اٹھا۔ سر کے اشارے سے اجازت طلب کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

قادری سرکار نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گئے ہوں۔ اچانک دو آنسو، ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکلے اور نیچے ڈھلک گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس لمحے وہ کس وجہ سے آبدیدہ ہوئے ہیں۔ مظلوم کی کراہ سے، حاکموں کی مجرمانہ لاپرواہی سے یا اس عذاب کے خوف سے جو معاشرے میں انصاف اور مساوات نہ ہونے کے باعث ہمیں گرفت میں لینے والا ہے۔

☆.....☆.....☆

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔!'' انجان نمبر سے آواز آئی۔ نمبر اجنبی تھا، مگر بولنے والی میری تنہائیوں کی رفیق، میرے خوابوں کی رانی، میرے خیالوں کی جنت تھی۔ جس کے ریشمی تصور سے دل و دماغ تقویت پاتے تھے۔

روحی کی آواز، میں لاکھوں آوازوں کے شور میں شناخت کر سکتا تھا۔

''کیوں۔؟'' مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی اور میری نظر دیوار گیر ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر پڑی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

''تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''شکریئے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا مجھے اس لمحے خود اپنی آواز، اپنا لہجہ، اپنا تاثر پرایا لگا۔

''تم نے میری ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچا کر مجھے دوبارہ زندگی دی ہے۔!'' اس کی آواز گیلی ہو گئی آنسوؤں نے اس کا حلق بھر دیا تھا۔

جس کا گلوگیر ہونا بھی مجھے برداشت نہ تھا۔ اب رو رہی تھی اور مجھے سارے جذبے پرائے پرائے سے لگ رہے تھے۔

''میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔!'' میں نے سکون سے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر سوئچ آف کر دیا۔

پتا نہیں کیوں میری نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ عجیب سی بے چینی مجھ پر طاری ہونے لگی تھی۔

''کیا یہ روحی کے بچھڑنے کی کسک ہے۔؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا اس کی یاد، اس کی آرزو ابھی بھی میرے اندر

موجود ہے۔؟'' سوال در سوال اٹھ رہے تھے۔

میں نے روحی کو تصور کی نگاہوں سے دیکھا اور چونک گیا۔ آج روحی کا تصور لمحے کے ہزارویں حصے کی طرح روشن نہیں تھا۔ وہ جو آنکھیں بند کرتے ہی، تنہا ہوتے ہی، میرے وجود پر ریشم کی طرح پھیل جاتی تھی۔

وہ ریشمی روحی آج نہیں تھی۔ ''آج کیوں میرے دل میں اس کی شدت نہیں؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور روحی کے سراپے کو اجالنے کی کوشش کی۔

مگر یہ کوشش بھی سعیِ لاحاصل رہی۔

میں نے شعوری طور پر دوبارہ کوشش کی، روحی کی ستواں ناک، غزالی آنکھیں، دراز خم دار پلکیں، صبیح رخساروں، نازک صراحی دار گردن، رس سے بھرے گلابی ترشے لبوں کا، سرو قامتی، میدے اور گلاب سے گندھی رنگت کا، لمبے، اخروٹی بالوں کا، مگر سوائے دھندلے سے خاکے کے کچھ نہ بنا۔

''یہ کیا ہوا۔؟'' دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے میں اندر سے خالی ہو گیا ہوں۔ مگر اس خالی پن کا احساس دکھ سے عاری تھا۔

پھر اچانک جیسے روحی کا ہیولیٰ روشن ہونے لگا۔ اس کے چہرے کا خدوخال واضح ہونے لگے۔

''تم آ گئیں۔!'' میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔

''ہاں میں آ گئی۔''

''ہاں ہم آ گئے۔!'' اچانک جیسے دو آوازیں ایک جیسی ٹیون سے جنم لینے لگیں۔

میں نے دیکھا، روحی کا روشن ہیولیٰ، قادری سرکار کے روشن ہیولے میں مدِغم ہو رہا تھا اور چند ہی لمحوں میں قادری سرکار کا ہیولیٰ اپنی پوری تابانی سے روشن ہو گیا۔

''روحی کہاں گئی۔!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''خود ہی تو دست بردار ہوئے ہو، تسلیم و رضا کا پیکر بن کر۔!'' وہ بولے۔

''میں کب دست بردار ہوا۔؟''

''جب اس کی ازدواجی زندگی بچانے کے لئے کتاب لکھی۔ اس کے بچوں کا احساس کیا۔ دوری کو تسلیم کیا، تو پھر ترک کی منزل میں داخل ہو گئے!۔''

''ترک کی منزل۔!'' میری حیرت دیدنی تھی۔ ''یہ کیا ہوتی ہے۔؟''

''ہمارے پاس آؤ محبت گزیدہ۔'' انہوں نے میرے ہاتھوں پر تھپکی دی، جو شدت سے آپس میں بندھے ہوئے تھے۔ اپنی ہی انگلیوں کی رسیوں سے!

مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ ائیر کنڈیشنڈ کی شوں شوں کی، ہلکی ہلکی آواز کے سوا اگر کوئی آواز تھی، تو وہ میرے بے تحاشا دھڑکتے دل کی تھی۔ جو یوں چل رہا تھا، اچھل رہا تھا، کنپٹیوں میں یوں پٹخنیاں کھا رہا تھا کہ جیسے پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔

مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا اور میں ہوش و خرد سے لاپرواہ، بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

قادری سرکار کون تھے، کہاں سے آئے تھے، ان کا کیا حدود اربعہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ شہر کے ایک معروف حصے میں بنی حویلی ان کا مسکن تھی۔ خوبصورت، پرشکوہ حویلی۔ کوئی کہتا تھا کہ ان کو کلیم میں ملی ہے۔ کسی کا خیال تھا بٹوارے سے پہلے ان کے والد کسی ریاست میں دیوان کے عہدے پر فائز تھے اور تقسیم کے وقت پاکستان آ کر یہاں رچ بس گئے تھے۔

قادری سرکار اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، گفتگو کے فن سے آشنا، تحقیق کے آدمی بات سادہ اور آسان طریقے سے یوں کرتے کہ مخاطب کے دل میں اتر جاتی۔ روزمرہ کی زندگی سے ایسی تشبیہات اور استعارے لیتے کہ سامنے کی، برتی ہوئی چیز میں، ایک نیا پن معلوم ہونے لگتا اور یوں لگتا کہ آج سے پہلے یہ بات اس طرح کیوں نہ سمجھائی گئی، بتائی گئی۔ ان کے مداح، بے شمار عقیدتمندوں اور مریدین کا دن رات تانتا بندھا رہتا۔

خود سوائے اشد ضرورت کے باہر نہ نکلتے۔ مگر خوشی غمی میں سب کی شریک ہوتے، مگر عموماً یہ ہوتا کہ شادی کرتے ہی جوڑا دعاؤں کے لئے حاضر ہو جاتا۔ کسی کے ہاں بچہ ہوتا تو قادری سرکار کے ہاں حاضری دیکر نام رکھوایا جاتا۔ کوئی نئی ملازمت پر جاتا، بیرون ملک روانگی ہوتی، ان کے پاس حاضر ہو کر دعائیں لیکر جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ نجانے کیا معاملہ ہے، کبھی کسی سے ان کو مانگتے نہ دیکھا، شائد انہیں دستِ غیب حاصل تھا۔ یہ ان کے مریدین، عقیدت مندوں کی رائے تھی۔

ایک اور، رائے یہ تھی کہ انہیں تسخیر خلق کا علم آتا تھا۔ جو بھی آپ کے پاس آتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے، ان کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

اگر کبھی قادری سرکار سے ان باتوں کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ مسکرا دیتے۔

ایک مرتبہ ایک مرید نے بااصرار سوال کیا۔ ''سرکار کیا واقعی تسخیر کا علم ہوتا ہے۔؟''

آپ نے فرمایا ''کیوں نہیں ہوتا۔۔۔؟ اگر تسخیر کا علم نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے چاند، ستاروں کو، مظاہر فطرت کو کیوں مسخر فرماتا۔''

''میرا مطلب ہے کہ انسانوں والا علم تسخیر۔!'' مرید نے گڑبڑاتے ہوئے عرض کی۔

قادری سرکار کہا۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق گفتگو کرو، جب تمہاری بات سادہ، آسان، دوسرے کے مسئلے کے حل کے عین مطابق ہوگی۔ اس کی شعوری سطح کو متاثر کرے گی تو وہ نہ صرف تمہاری بات کو سمجھے گا بلکہ مانے گا بھی۔!''

وہ ذرا ٹھہرے اور مرید کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''کچھ سمجھ میں آ رہا ہے!''

وہ بے ساختہ بولا۔ ''حضور سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث پاک آج پہلی بار میرے دل میں نقش ہو گئی ہے۔ آج سے پہلے یہ حدیث شریف سنی تھی لیکن سمجھ میں آج آئی ہے۔''

قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔ ''یہی انسانوں والا علم تسخیر ہے۔!''

تو ایسے تھے قادری سرکار۔!

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سرہانے اماں بیٹھی تھیں اور تسبیح پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہی تھیں۔ مومی میری ہتھیلیاں سہلا رہی تھی، مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر مومی جلدی سے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔!''

''مجھے۔۔۔ مجھے کیا ہوا تھا۔۔۔؟'' مجھے بولتے ہوئے بے حد نقاہت ہو رہی تھی۔

''کچھ نہیں رات کسی وقت بخار بہت تیز چڑھ گیا تھا۔'' اماں نے میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ''اب تو بخار کم ہے۔!''

اتنے میں قدیر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو تین پلاسٹک کے شاپرز تھے۔

مجھے آنکھیں کھولے دیکھ کر وہ ہنسا۔ ''آ گیا۔۔۔؟'' اس نے بمشکل اماں اور مومی کو دیکھ کر زبان دبا کر اپنا جملہ روکا اور جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ''آ گیا ہمارے پٹھے کو ہوش!''

''اللہ کا شکر ہے۔'' اماں مجھے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''میں ذرا شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔!'' اماں کی عادت تھی۔ جب کوئی مسئلہ آتا، پریشانی ہوتی، اماں فوراً شکرانے کے نفل مان لیتیں اور آج تک میں نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھا کہ کبھی اماں کے نفل پورے نہ ہوئے ہوں۔

اماں کو اللہ میں پر اس قدر اعتماد تھا کہ جیسے اللہ میاں نے ان سے ہر بات پوری کرنے کا وعدہ کر رکھا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے تھے، بس ٹھیک ہی تھے۔ مگر اماں نے فوراً چالیس نفل مان لئے۔

میں نے پوچھا۔ ''اماں کیا میں واقعی گریڈ لے لوں گا۔؟''

''ہاں اللہ میاں ضرور دیں گے۔!'' وہ پر یقین لہجے میں بولیں۔

''اماں آپ کو اتنا یقین کیسے ہے۔؟''

''اگر تو مجھ سے کوئی فرمائش کرے گا تو میں پوری کروں گی یا نہیں۔؟'' اماں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' میرا لہجہ پُر یقین تھا۔

''تو بیٹا جی۔! اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ یقین، اعتبار اور بھروسے کا مستحق ہے۔'' اماں نے چند جملوں میں اللہ سے اپنے تعلق کی

وضاحت کردی۔

''تو پھر کیا ہوا۔؟'' قدیر دھپ سے میرے بیڈ پر بیٹھا، پورا بیڈ ہل کر رہ گیا۔

میں چند لمحوں میں ماضی سے حال میں آ گیا۔

اماں کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔ مومی میرا سر سہلا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، قدیر نے کہا۔ ''مومی یہ شاپرز اندر لے جاؤ اور میرے لئے گرما گرم فٹافٹ چائے لے آؤ۔'' اس نے شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔

''بھائی آپ کیلئے بھی چائے لاؤں۔؟'' مومی نے بہت پیار سے میرے رخسار کو چھوا۔

''ہاں۔!'' میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

مومی شاپرز اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''مجھے کیا ہوا تھا۔؟''

'عالم بے ہوشی میں تھا، احمق کے پٹھے!'' مومی کے جاتے ہی قدیر نے اپنا روائتی انداز اختیار کر لیا۔

''صبح ہو گئی۔!'' میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''ہاں جی۔!'' وہ منہ چڑانے کے انداز میں بولا۔ ''تیسری صبح۔!''

''کیا؟۔'' مارے حیرت کے میں کہنیوں کے بل اٹھ گیا۔

''اور کیا؟'' وہ بولا۔ ''ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی صدمہ، کوئی شاک پہنچا ہے۔'' قدیر نے بتایا۔ ''اماں نے ہمیں ہاسپٹل نہیں جانے دیا، بولیں ''ٹھیک ہو جائے گا!'' پھر میری طرف دیکھ کر بولا ''اماں کو کچھ معلوم ہے۔؟''

''یار کچھ بھی تو نہیں ہوا۔''

''پھر تو بے ہوش کیوں رہا؟ احمق کے پٹھے'' قدیر نے دانت نکوسے۔ ''ہم سے چھپا رہا ہے۔؟''

''قسم سے۔!'' میں نے ایمانداری سے کہا۔ ''کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔''

قدیر غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا، ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ میں مسلسل سوچتا رہا کہ کیا ہوا تھا، میرے ساتھ؟ مگر مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرا ذہن سادہ تھا کسی سلیٹ کی مانند۔

تھوڑی دیر میں مومی چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی، مکھن، ابلے ہوئے انڈے اور بسکٹ تھے۔

''بھائی چائے کے ساتھ کچھ کھا بھی لیں۔!'' وہ بولی۔

قدیر نے کہا۔ ''فکر نہ کرو میں اس کو حلق تک بھر دوں گا۔''

مومی ہنسی اور ہم دونوں کو دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ مومی میری اکلوتی بہن تھی۔ ہمارے گھر کی رونق، روشنی اور زندگی بھی۔

قدیر کے ساتھ ناشتہ ختم کیا ہی تھا کہ اماں اندر آ گئیں۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھ پر دم کیا اور بولیں۔ ''تمہارے سرہانے دوا رکھی ہے کھالو۔۔۔!''

قدیر نے اٹھ کر گولیوں کے پتے اٹھائے اور دو، دو گولیاں مختلف پتوں سے نکالیں، مجھے دیں اور میں نے گلاس بھر پانی کے ساتھ انہیں نگل لیا۔ اس کے بعد میں لیٹ گیا۔

پتا نہیں کیوں اعصاب بے جان سے ہونے لگے تھے۔؟ قدیر اور اماں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر تک تو ان کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے سرہانے سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈالا اور دھیمے دھیمے گھونٹ لینے لگا۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور مومی نے اندر جھانکا اور مجھے بیدار دیکھ کر اندر آ گئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔؟'' اس نے پوچھا اور خالی گلاس میرے ہاتھ سے لیکر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہوں۔! تم کیسی ہو۔؟'' میں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔

میرے ہاتھ تھامنے کی دیر تھی کہ جیسے بند ٹوٹ گیا اور وہ مجھ سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگی۔

میں اسکے سر کو تھپکی دیتا رہا۔ ہم دونوں بھائیوں پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ لیکن ہم دونوں کے درمیان جو دوستی، جو تعلق، جو پیار تھا، اس کو شائد لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی بہنیں خدا کی رحمت کی طرح نازل ہوتی ہیں، خالص اور مصفاء روشنی کی طرح جو آپ کو اُجال دے۔!

وہ اپنی سسکیوں کے درمیان یہی پوچھتی رہی۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔؟''

''تم جیسی پیاری بہن کی موجودگی میں مجھے کیا ہو سکتا ہے۔؟''

''بھائی کوئی تو بات ایسی ضرور ہے جو کہ یا تو آپ مجھے بتا نہیں رہے یا پھر شائد آپ کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔!'' مومی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ مومی کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ جیسے مجھے کہیں دھکیلا جا رہا ہے۔ کسی طرف بھیجنے کی تیاری ہے۔ لیکن کون کر رہا ہے، کہاں بھیجنا چاہتا ہے؟، مجھے کچھ نہیں معلوم۔!'' احساس بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کوئی سمت واضح نہیں، زندگی کس رُخ کو اختیار کر رہی ہے، راستے کہاں جائیں گے۔ اور پھر کیا میں اپنے آپ کو کھو رہا تھا۔؟ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔؟ اچانک ایک سوال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا۔

''نہیں بھائی!'' مومی نے مداخلت کی۔ ''آپ کو کچھ نہیں ہو رہا۔''

میں نے مومی کی طرف دیکھا۔

اس نے میرے خیال کو پڑھ لیا تھا۔ ''آپ صرف الجھ گئے ہیں'' اس نے رسانیت سے کہا۔ چند دنوں میں اس کیفیت سے نکل آئیں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بعض اوقات خیالات، تاثر کی تحریر کی صورت، چہرے کی اسکرین پر روشن ہو جاتے ہیں اور پھر ہم سے نزدیک، ہمیں سمجھنے والے اس تحریر کو با آسانی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر قدرت ہمارے ساتھ ایسے لوگوں کو نتھی نہ کرے تو پھر ہم اپنے ہی آسیب کا شکار ہو کر فنا ہو جائیں۔

☆.....☆.....☆

تین چار دن کے بعد جیسے میں اپنے آپ میں آ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ چیزوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ لوگوں سے رابطہ بڑھنے لگا۔

قدیر کا فون آیا۔ ''کدھر ہے تو احمق کے پٹھے!'' اس نے سلسلہ ملتے ہی کہا، ''ساری دنیا تجھے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جلدی سے پریس پہنچ'' اس نے جھٹکے سے فون بند کر دیا۔

میں فون رکھ کر نہانے کیلئے باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر میں نے اماں کو خدا حافظ کہا اور قدیر کے پریس چل پڑا۔

جس وقت میں قدیر کے پریس پہنچا وہاں پندرہ بیس لوگ جمع تھے۔ قدیر اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، اور کئی لوگ اس کی میز کے گرد جمگھٹا لگائے بیٹھے تھے۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا قدیر نے بلند آواز میں کہا۔

''لو جی آ گئے اپنے تنزیل جی۔!''

کئی گردنیں میری طرف گھوم گئیں۔

''تو اُٹھ۔!'' قدیر نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔ ''اپنے تنزیل جی کیلئے جگہ خالی کر دے!''

وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا، اور کرسی خالی کر دی۔

میں قدیر کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

قدیر نے کہا۔ ''لو جی یہ اپنے تنزیل جی ہیں۔ ''سندیسے جو گم ہو گئے'' کے خالق۔ اب آپ لوگ جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھو!''

پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا'' یہ اپنے شاعر، ادیب ہیں، ان سب کو آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا، اس لئے میں نے ان سب کو پریس بلا لیا۔۔۔!''

قدیر کمرشل کتابوں، کہانیوں کیساتھ ساتھ ادبی کتابوں کو بھی چھاپتا تھا۔ حالانکہ قدیر کے ابا اس بات کے سخت مخالف تھے کہ قدیر کسی بھی ایسی کتاب کو چھاپے، جس کا ذرا سا بھی تعلق ادب سے ہو، انکا کہنا تھا کہ یہ حرام خور سارا دن لفظوں کی جگالی کرتے ہیں، کام دھام نہیں کرتے اور

پیسے مار جاتے ہیں۔ مگر قدیر کی کچھ اپنی ہی فطرت تھی۔ وہ اپنے باپ کی بھرپور مخالفت کے باوجود ادیبوں کی کتابیں چھاپنے میں پیش پیش رہتا تھا۔

''تنزیل جی آپ نے تو کمال کر دیا۔ پہلی ہی کتاب میں اس قدر بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں کہتا ہوں واللہ نظر نہ لگے!'' ایک دھان پان سے صاحب بولے۔ انہوں نے لکھنوی اسٹائل کا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ چہرے مہرے سے پچاس کے پیٹے میں معلوم ہو رہے تھے۔

''ارے جمالی صاحب۔!'' قدیر نے میرے بولنے سے پہلے ہی مداخلت کی۔ ''ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپنے جا رہا ہے۔''

''واہ بھئی واہ۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں،

''ہماری تو ایک کتاب بھی دو سال میں ختم نہیں ہوتی۔'' جمالی صاحب نے کہا۔

''ارے جمالی صاحب کسی کی سمجھ میں آپ کا فلسفہ آئے تو کوئی خریدے۔۔۔ تبصرہ نگار تک کہہ دیتے ہیں کہ بھئی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی پرنٹنگ اور جلد بندی ہے۔!'' کسی نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''ارے چھوڑیں غزالی صاحب آپ کی شاعری کون سی بک رہی ہے۔ ہر غزل کی زمین کسی استاد کی چرائی ہوئی لگتی ہے۔!''

''گویا غزالی صاحب شاعر نہیں قبضہ گروپ ہیں۔!'' کسی نے ٹکڑا لگایا۔

چاروں طرف سے قہقہے اُبل پڑے۔

''یہ سب ہمارے شاعر، ادیب، کالم نگار، دانشور ہیں۔'' قدیر نے میرا ان سے تعارف کروانا شروع کر دیا۔

وہ سب بیک وقت بہت اچھے، بہت دلچسپ، فقرے باز، حاسد، ٹانگ کھینچنے والے، بخیے ادھیڑنے والے، جلے پر نمک چھڑکنے والے، پیار کرنے والے اور چاہے جانے والے تھے۔

ہر آدمی کے اوپر کتنی ہی پرتیں ہوتیں ہیں، ساری حیاتی پرت در پرت بندہ کھلتا ہی رہتا ہے۔

پندرہ بیس منٹوں کے بعد تعارف اور ہلے گلے کا مرحلہ ختم ہو گیا۔ چائے آ گئی، ساتھ میں سموسے، بسکٹ، دال موٹھ اور لوکی کا حلوہ تھا۔ قدیر دوست دار آدمی تھا۔ اس کے اندر بندے کو سمو لینے کی صلاحیت تھی۔

''یار جمالی۔'' غزالی نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ ''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟''

''کیوں کوئی خاص بات۔؟'' جمالی نے چمچہ بھر کے حلوہ منہ میں بھرا۔

''ہاں آج قادری سرکار کی پیش گوئی چھپی ہے۔'' غزالی نے کہا۔ ''انہوں نے آئندہ سیاسی سیٹ اپ کیلئے بڑی اہم پیش گوئی کی ہے''

''کیا۔۔۔؟'' ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ مجھے ان آوازوں سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ لوگوں کے لئے قادری سرکار کا نام نیا نہیں ہے۔

☆.....☆.....☆

زندگی کی گزری بے برکت ساعتوں میں

''کیا پیش گوئی کی ہے قادری سرکار نے۔؟'' آشفتہ ناز نے اپنے لمبے گھنگھریالے بالوں کو زور سے جھٹکا، ساتھ ہی اپنا ہاتھ فضاء میں لہرایا۔

''انہوں نے کہا ہے کہ ضمنی انتخابات کے نتیجے میں حکمران جماعت میں پھوٹ پڑنا شروع ہو جائے گی۔!'' غزالی نے بتایا۔

''ضمنی انتخابات سے اپ سیٹ کیسے ہو سکتا ہے۔؟'' اظہر صدیقی نے کہا۔ ''ضمنی انتخابات تو عموماً حکمران جماعت ہی جیتتی ہے۔''

اظہر صدیقی ایک قومی اخبار کا کالم نویس تھا اور اس کے تجزیے بہت پر مغز ہوتے تھے۔

''معلوم نہیں۔'' غزالی نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''لیکن انہوں نے کہا ہے کہ ضمنی الیکشن کے نتائج حکمران جماعت کو بہت مہنگے پڑیں گے اور اسی سے اپ سیٹ سامنے آنا شروع ہو جائے گا۔!''

''یار یہ پیر ہیں یا سیاستدان۔؟'' احمد عبدالحیٔ نے سر کھجایا۔ وہ ٹی وی پر آنے والا ایک معروف دانشور تھا۔ اس کی بڑی ڈیمانڈ تھی ۔ کیونکہ وہ اپنے مخاطب کے بخیئے ادھیڑنے میں ملکہ رکھتا تھا۔

''تم بھی ان سے ایک بار ضرور ملو۔!'' جمالی نے کہا۔ ''بلکہ ان کو کسی پروگرام میں بلواؤ۔!''

''یار میں مذہبی ٹائپ کے پروگرامز میں نہیں پڑتا۔'' احمد عبدالحیٔ نے حسب عادت کندھے اُچکائے اور چائے کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

''کیونکہ مجھے اسلام کا پتا نہیں۔!'' سہیل دانش نے مسکرا کے کہا۔ وہ بھی ایک معروف ادیب تھا۔

''دراصل میں غیر ضروری اسلام میں نہیں اُلجھتا۔'' احمد عبدالحیٔ نے خوش دلی سے کہا۔ ''جتنے اسلام کی مجھے ضرورت ہے، وہ مجھے معلوم ہے۔ الجھنے والے، لڑانے والے اسلام سے میں الرجک ہوں۔!''

''معاف کیجئے گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس کا اسلام کے حوالے سے نکتہء نظر پسند نہیں آیا۔

''اسلام ایک دین ہے۔'' میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''اور دین تمام زندگی سے علاقہ رکھتا ہے۔ دین یا تو پورے کا پورا قبول کرنا پڑتا ہے، یا پورے کا پورا رد کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کے معاملات دیکھو اور منتخب کرو، کی اجازت نہیں دیتے۔!''

''آپ کو غصہ آ رہا ہے۔!'' احمد عبدالحیٔ نے مسکرا کے کہا۔ ''بات کو ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ مولوی نے اسلام کو کیا دیا۔؟''

''یہی اندازِ فکر غلط ہے۔!'' میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ ''یہ کہئے کہ مولوی نے اسلام سے کیا لیا۔ کیا سمجھا۔؟ اور پھر دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام بحیثیت دین مولوی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ فرد کی ذمہ داری ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ پوچھا، یا سوچا کہ

مولوی نماز پڑھانے سے کیوں انکار نہیں کرتا۔؟ سب سے سخت ڈیوٹی موذن کرتا ہے۔ گرمی، سردی، برسات کسی موسم میں، کسی وقت اذان کا ناغہ نہیں کرتا اور ہم جیسے آدمی اس کو کیا دیتے ہیں۔؟ نہ اچھی تنخواہ، نہ اوور ٹائم، نہ اولڈ ایج بینی فٹس، نہ سالانہ چھٹیاں، نہ بونس اور نہ اپنی بیٹی کا رشتہ۔۔۔! پھر بھی آپ مولوی کو بُرا کہتے ہیں۔؟"

"بات یہ ہے اپنے تنزیل جی۔!" احمد عبدالحیٔ نے کہا۔ "اپنا اپنا نکتہء نظر ہے۔!"

"غلط۔!" اظہر صدیقی نے مداخلت کی۔ "تنزیل جی کا نکتہء نظر، دلیل کے عین مطابق ہے۔ تم جیسے لوگ فیشن کے نام پر اسلام کا استحصال کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ صرف الفاظوں کے اُلٹ پھیر سے باتوں کے محل تعمیر کرتے ہیں، مگر ان کی اصلیت کوئی نہیں ہوتی۔"

"اظہر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" آشفتہ ناز نے کہا۔ "تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اگر اسلام کو نہیں مانتے تو نہ مانو، مگر اس کی روح کو سمجھے بغیر اس پر گفتگو نہ کرو، یہ بھاری پتھر ہے، چوم کر چھوڑ دو۔!" آشفتہ ناز ہنسا۔

احمد عبدالحیٔ نے چاروں طرف دیکھا، مگر اس سے کوئی اس کو آسانی دینے کی کیفیت میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں بہر حال منافق نہیں ہوں۔!" وہ بولا۔ "جو صحیح سمجھتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں۔!"

"اس کو منافقت نہیں گٹ ججتی کہتے ہیں۔" قدیر نے ہاتھ کو ہلایا، جیسے بحث کو ختم کرنا کا اشارہ کر رہا ہو۔

"کیا آپ قادری سرکار کے بہت قریب ہیں۔؟" اظہر صدیقی نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں تو۔!" میں نے جواب دیا۔ "میری تو آج تک اِن سے گفتگو نہیں ہوئی!"

"اچھا!" اظہر صدیقی نے مجھے دیکھا اور بولا۔ "مگر آپ کا انداز استدلال تو قادری سرکار جیسا ہے۔!"

میں صرف اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں۔؟ میری تو کبھی قادری سرکار سے گفتگو تو کجا، بات تک کی نوبت نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں گاہے بگاہے خانقاہ چلا جاتا تھا۔ پھر وہ مجھ پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔؟

بے شمار سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔

☆.....☆.....☆

"یہ کیا کیا تو نے کُتی دے پُتر۔!" شاہ ہارون گیلانی کا جلال پورے عروج پہ تھا۔ "میری عدم موجودگی میں تیری یہ جرات، تو لڑکیاں اٹھائے، تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے آگا پیچھا کیا ہے۔؟"

"شاہ جی۔!" مینجر طارق نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر شاہ ہارون گیلانی کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"بک کیا بکنا ہے۔؟" لمحے بھر میں شاہ ہارون گیلانی کی چھٹی حس نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

"شاہ جی۔!" طارق لپک کر شاہ ہارون گیلانی کے پیروں میں جا بیٹھا اور ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "شاہ جی ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ آپ کے نمک خوار ہیں۔ حکم عدُولی کی طرف ہمارا دھیان بھی جائے تو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔"

شاہ ہارون گیلانی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا، صرف طارق کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے رہے۔

وہ سر جھکا کے آہستہ سے بولا۔ ''شاہ جی جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ ماشاء اللہ سے چھوٹے شاہ جی جوان ہو گئے ہیں۔!، بس جی۔!'' اس نے شاہ ہارون گیلانی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

''جی بس پہلا ہی موقع تھا۔ نرگس کو چھوٹے شاہ جی نے دیکھا، تو طلب کر لیا۔ مگر وہ الہڑ مٹیار بڑی ڈھیٹ نکلی، کچھ شاہ جی کی نئی نئی جوانی اور ناتجربے کاری، دو بندے اور بھی تھے، وہ بھی چھوٹے شاہ جی کے دوست ہی تھے، شہر سے آئے تھے۔ بس جی وہ زندہ بچ گئی، بے برکتی ہو گئی۔ ورنہ بات باہر نہ جاتی۔ وہ تو سوہنے سائیں کا شکر ہے کہ اس نے چھوٹے شاہ جی کو پہچانا نہیں۔ میں ہی اس کو لے کر جا رہا تھا۔ مجھ کو ہی پہچانتی ہے۔ تو پھر میں کیا کرتا۔؟ سارا الزام اپنے سر لے لیا۔!'' مینجر طارق کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شاہ ہارون گیلانی نے پیروں کو سمیٹ لیا۔

طارق مینجر ویسے ہی بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف شاہ ہارون گیلانی کے سگار سے اٹھنے والے دھویں کے مرغولے ہوا میں چکراتے رہے۔

''شاہ جی۔!'' مینجر طارق نے پوچھا۔ ''اجازت ہو تو پوچھ لوں، شہر میں کوئی بات ہو گئی ہے کیا۔؟''

''ہونہہ۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ہنکارا بھرا۔

''کسی چینل والے کو خبر لگ گئی کیا۔؟''

''اگر یہ بات ہوتی تو میں پریشان ہوتا۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''دراصل قادری سرکار اس معاملے میں آ گئے ہیں۔''

''کیا۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی یہ بات سن کر مینجر طارق یوں اچھلا جیسے اس کو بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔

لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔

''اب کیا ہو گا۔؟'' وہ سر سراتے ہوئے لہجے میں بولا ''یہ تو بہت بُرا ہوا۔''

''ہاں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''سوچنا پڑے گا۔؟''

''شاہ جی اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔''

''کہو۔!''

''کیوں نا لڑکی سے نکاح کے دو بول پڑھوا لوں، میرے ہی اوپر الزام ہے نا۔ میں اس سے، اس طریقے سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ اور پھر سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ مسئلہ عزت کی بحالی کا ہے۔ پورے گاؤں کے سامنے نکاح کروں گا۔ اب کیا سرکار کے لئے اتنا

بھی نہ کرسکوں، تو پھر لعنت ہے میرے نصیب پر۔!'' منیجر طارق سخت جذباتی ہوگیا۔

شاہ ہارون گیلانی نے غور سے اس کو دیکھا اور بولے ''سوردے پتر، اس پر دل آ گیا ہے کیا تیرا۔؟''

منیجر طارق نے سر اٹھا کے ہارون گیلانی کو دیکھا اور شرمیلے سے لہجے میں بولا۔ ''شاہ جی دل تو اب رہا نہیں، اگر دل رکھتے تو پھر، ہر حکم کیسے بجالاتے۔؟''

شاہ ہارون گیلانی نے منیجر طارق کو ایک زوردار لات رسید کی۔ طارق لڑھک کر سرخ دبیز قالین پر اوندھا ہوگیا۔ پھر بڑی پھرتی سے سیدھا ہوا۔ اور شاہ ہارون گیلانی کے قدم پکڑ کے بولا۔ ''سب آپ کی برکتیں ہیں۔''

شاہ ہارون گیلانی نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی دیکھے بغیر اس کی طرف اچھال دی۔ منیجر طارق نے جھک کر نوٹوں کی گڈی اٹھالی اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

شاہ ہارون گیلانی نے طمانیت سے ایک گہری سانس لی۔ اور بڑا سا دھواں کا مرغولہ ہونٹوں سے خارج کیا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں کیوبن سگار کی مہک پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن شاہ ہارون گیلانی نے نرگس کے باپ تاج دین کو بلوایا۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا حویلی میں حاضر ہوا۔

ریاضے کمدار نے اطلاع دی۔ ''شاہ جی! تاج دین آ گیا ہے۔''

''اسے بٹھاؤ'' شاہ ہارون گیلانی نے جواب دیا۔ ریاضے کمدار نے سر جھکایا اور باہر آ کے تاج دین کو بادام کے درختوں کے نیچے بچھی چارپائی پر بٹھادیا۔

''خیر تو ہے نا۔؟'' تاج دین نے حیرت آمیز گھبراہٹ سے پوچھا۔ ''اس سے پہلے تو کبھی شاہ جی نے مجھے نہیں بلوایا۔!''

''پتا نہیں۔!'' ریاضے کمدار نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''تجھے معلوم ہوگا یا پھر شاہ جی کو۔!'' اور چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔

چاروں طرف حویلی کا صحن پھیلا ہوا تھا۔ کئی ایکڑوں میں بنی اس حویلی کے چاروں طرف بادام، آم، امرودوں، شہتوتوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں پھولوں کی وسیع و عریض کیاریاں تھیں۔ درختوں، پھولوں کے کنج کے وسط میں قائم حویلی، کم و بیش پچاس سالوں سے پورے کروفر سے ایستادہ تھی۔ سہ منزلہ حویلی سے بلند اردگرد کے سارے علاقے میں کوئی عمارت نہ تھی۔ کیونکہ کوئی دوسرا شاہ ہارون گیلانی نہیں تھا۔ اس کے بالکل عقب میں پرانی حویلی تھی۔ جو کہ اب اجناس کے ذخیرے اور کمی کمینوں کو درست رکھنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

صدر دروازے سے حویلی کے مرکزی پورچ تک دائرے میں سڑک گھومتی ہوئی جاتی تھی۔ سیاہ سڑک کے دونوں جانب

خوبصورت ملکی غیر ملکی پھولوں کی قطار در قطار کیاریاں تھیں اور مرکزی دروازے سے حویلی کے پورچ تک ایک سیدھی، بیس فٹ چوڑی نہر بہتی تھی۔ جس میں سفید سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ اور درمیان میں بہت خوبصورت کہیں مور، کہیں عورت، کہیں سورج مکھی کے سنگِ مرمر کے فوارے لگے ہوئے تھے۔ جن میں پوشیدہ رنگین روشنیاں خاص خاص مواقع پہ روشن کی جاتیں تھیں۔ جو لحہ بہ لحہ رنگ بدلتی رہتی تھیں۔ سفید سنگِ مرمر کی طویل نہر میں سنہری رنگین مچھلیاں، ننھے منے سے کچھوے، سفید مرغابیاں تیرتی تھیں۔ نہر کے درمیان میں سنگِ مرمر کی چار جگہ شہ نشینیں بنیں ہوئی تھیں۔ جن میں راتوں کو مہمان بیٹھتے تھے۔ غرض حویلی کیا تھی۔؟ پریوں کا محل تھی۔ ایسا محل جس کی لوگ شائد خوابوں میں بھی تمنا نہ کر پاتے ہوں۔

تاج دین عرف تاجا چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیوں بلایا گیا ہے۔

اس جیسے معمولی آدمی کو شاہ ہارون گیلانی سے ملنے کا پیغام جائے۔؟ اُن سے، جن سے ملنے کے لئے لوگ ترستے ہیں۔!

بعض اوقات معلوم ہی نہیں ہوتا کہ قسمت مہربان ہو رہی ہے یا کسی نئے امتحان میں مبتلا کر رہی ہے۔ واہ قسمت کی پری نجانے کس سے اپنی جادو کی چھڑی سے کونسا نیا منظر تخلیق کر دے۔!

وہ سوچتا رہا، اور الجھتا رہا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ سورج چڑھے آیا تھا۔ اب سورج نصف دن گذار چکا تھا۔ مگر ابھی تک طلبی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس دوران کئی بار ریاضے کمدار نے اندر باہر کے چکر لگائے مگر اس کو کچھ نہ کہا، نہ بتایا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی بھولی بسری شے ہے، جس کو لا کر سب بھول گئے ہوں۔

عصر کے قریب اچانک حویلی کے اندرونی دروازے پر ہلچل ہوئی۔ شاہ ہارون گیلانی کے مخصوص کمانڈوز، گارڈز نظر آنے لگے، ان میں سے چار پانچ تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے آئے اور پھر وہ چلتے چلتے چند لمحوں میں تاجے کے پاس پہنچ گئے۔

ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ”تم ہی تاجے ہو۔؟“

”ہاں۔۔۔ہاں جی۔۔۔!“ تاج دین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں ہی تاجا ہوں۔“

”چلو۔! تمہیں شاہ جی نے طلب کیا ہے۔!“

”چلیں جی۔!“ تاجے نے ان کے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

وہ چلنے کو تو چل رہا تھا، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیوں طلب کیا گیا ہے۔

وہ چلتے ہوئے حویلی کے عقب میں بنی ہوئی پرانی حویلی کی طرف پہنچ گئے اور پرانی حویلی کے اندر غلام گردش سے گزر کر، وہ کافی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے۔ اندر ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ جس میں شاہ ہارون گیلانی ایک بھاری بھرکم دیوان پر بیٹھے تھے اور ایک کمدار اُن کے پاؤں دبا رہا تھا۔

تاجا کچھ فاصلے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیر بے جان ہو رہے تھے۔ یوں

لگ رہا تھا کہ جیسے اب اس کی جان نکل جائے گی۔

''چل آگے چل۔!'' کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اور گھٹنوں کے بل شاہ ہارون گیلانی کے سامنے گر پڑا۔

''تو تم ہوتا جے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری بھرکم آواز بلند ہوئی۔

''جی سرکار۔!'' اس نے جلدی سے گھٹنوں کے بل کھڑے کھڑے ہاتھ جوڑے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے شاہ ہارون گیلانی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ ان کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو اس کو محسوس ہو رہی تھی۔ کیو بن سگار سے بنتا ہوا دھواں اس کو اپنی ناک میں جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔؟''

''سرکار جی غلام کو کیا خبر۔!'' تاج دین عرف تاجے نے بدستور ہاتھ جوڑے جوڑے کہا ''مائی باپ نے طلب کیا ہے۔ تو ضرور ہی کوئی حکم ہوگا۔ جی ہم تو حاضر ہیں۔''

''نرگس کہاں ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں پوچھا۔

ان کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ تاجے کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بدن میں سینکڑوں سانپ رینگنے لگے ہوں۔ مارے خوف و دہشت کے اس کی شلوار گیلی ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

''جج۔۔۔جج۔۔۔جی وہ تو چلی گئی۔!'' تاجے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''کہاں چلی گئی۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے گرج کے پوچھا۔

''جی۔۔جی شاہ جی اس کو قادری سرکار لے گئے۔۔۔!'' تاجے نے ہاتھ جوڑے۔

''کیا۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا سارا کروفر ڈھیلا پڑ گیا۔ تنے ہوئے اعصاب، اُبلتی ہوئی قہر برساتی ہوئی سرخ آنکھیں، بدن کا تناؤ، جیسے یکدم رخصت ہونے لگا ہو۔

اچانک ۔۔۔بالکل اچانک، کسی الہام کی طرح، لمحے کے ہزارویں حصے میں، تمام زندگی کی گذری بے برکت ساعتوں میں سے، جیسے مرتے کو زندگی مل جائے، کسی پھسلتے ہوئے کو کسی چٹان کا، کسی پتھر کا، کو نا مل جائے۔ کسی ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ مایوس، نامراد، ناکام، ناشاد کو جیسے کُن فیکون کا ادراک ہو جائے۔ بعینہ ایسے ہی۔ تاج دین عرف تاجے کو لمحہء نابود میں لمحہء قیام میسر آ گیا ۔ یہ خیال اس پر وارد ہو گیا کہ اس کے لئے قادری سرکار کا نام کسی اسم اعظم کی طرح ہے۔ جو اس کو ہر مشکل سے نکالنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

کبھی کبھی فرد خود کو کتنی تیزی سے معتبری کے حصار سے نکال کر، نا اعتباری کی دھوپ میں کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ لوگ جنہیں کوئی

کچھ نہیں سمجھتا۔ بے نام۔ بے چہرا۔ بے وقعت لوگ معتبری کی بلندی پر فائز ہو جاتے ہیں۔

کمال ہے اے کن فیکون والے۔۔! اے عزت اور ذلت کے تخت الٹنے والے۔۔! اے سلام تو کمال در کمال، تیری ہستی لازوال حقیقتوں کو اُجالتی ہے۔

صدیوں کا ادراک لمحے بھر میں تاج دین عرف تاجے کے کاسۂ سر میں سما گیا۔

ٹھہراؤ۔ سکون۔ طمانیت۔ نے اس کے بدن کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔

''کب لے گئے وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی آواز بلند ہوئی۔

تاج دین عرف تاجے کو جیسے صدیوں کو سفر نے لمحہ نابود سے لمحہ موجود میں لا کھڑا کیا۔

''شاہ جی۔۔۔ وہ تو اسی دن، رات کو لے گئے تھے۔!'' تاجے نے کہا۔ اس کو اپنی آواز کے ٹھہراؤ اور لہجے پر خود بھی تعجب ہوا۔ کیا یہ اس کی آواز تھی۔؟ اس کا دل چاہا کہ وہ کچھ بول کر اپنی آواز خود ہی دوبارہ سنے۔ مگر شاہ جی کے احترام میں چپ رہا۔

''کیا خود آئے تھے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کے قدرے ڈھیلے لہجے نے لمحے بھر میں اس کی آرزو پوری کر دی۔

اچانک جیسے تاجے کے لہجے میں عقیدت، محبت اور پیار کے ہزاروں دیپ روشن ہو گئے۔

''انہوں نے نرگس کی حالت دیکھی تو بولے ہم اپنی بیٹی لے جا رہے ہیں۔'' تاجے نے لمحے بھر کو خاموشی کا سہارا لیا، پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''شاہ جی ہماری کیا مجال کہ ہم قادری سرکار کو انکار کریں۔ وہ تو جی ہمارے مرشد پاک ہیں۔ ہماری اولاد تو کیا۔! ہمارے بدن کی بوٹیاں بھی مانگ سکتے ہیں۔ بھلا ہم کیسے منع کر سکتے ہیں۔؟''

''کیا تم نے اس کی مریدی کر لی ہے۔؟'' دفعتاً جیسے شاہ ہارون گیلانی کے بدن کو غصے کا تپ چڑھنے لگا۔

''جی ہم نے اُن کی، قادری سرکار کی، بیعت حاصل کر لی ہے۔ جی یہ تو اعزاز کی بات ہے نا۔!'' تاجے نے غیر محسوس انداز میں قادری سرکار کے احترام کی حدود واضح کر دیں۔

''مگر تم، تمہارے پرکھے، یہ سارا علاقہ تو ہمارا مرید ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے اس کو کڑی نگاہوں سے گھورا۔

''جی سرکار ہم سب تو آپ کے والد جنتی شاہ جی کے مرید تھے۔'' تاجے نے کہنا شروع کیا۔ ''مگر جنتی شاہ جی کے پردہ کرنے کے بعد جب آپ نے گدی سنبھالی تو کسی کو بھی تجدیدِ بیعت کے لئے طلب نہیں کیا۔ اور بیعت نہ لی۔ قادری سرکار فرماتے ہیں۔ جب تک مرشد حیات ہوں بیعت فسخ نہیں ہوتی۔ یا تو پیر و مرشد خود کسی سے بیعت کی اجازت دیں۔ یا مرشد پاک پردہ فرما جائیں۔ تو بیعت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر فیض کیلئے یا تو مرشد کے خلیفہء مجاز سے یا کسی سے بھی جس پر آپ کو یقین ہو کہ یہ اللہ والا ہے۔ اس کی تجدیدِ بیعت کر لیں۔'' ''جی یہ تو شریعت کی بات ہے تو پھر ہم لوگ شریعت سے کیسے مکر سکتے ہیں جی۔۔۔!'' تاجے نے بڑے غور سے شاہ ہارون گیلانی کو دیکھا۔ ایک لمبا وقفہ لیا، اور گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ''جی جب تک گلے میں مرشد کے نام کا پٹہ نہ ہو۔ زندگی کیسے آگے چلے گی۔ قیامت

میں کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لے جائے گا۔؟'' اس نے کمال معصومیت سے سوال کیا۔ ''کون اللہ کی۔۔۔سوجھنے رب کی پہچان کروائے گا۔؟''

شاہ ہارون گیلانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کے مضبوط قلعے کی بُرجیاں گر رہی ہیں۔

''تو تم ان کے مرید ہو گئے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی میں ہی کیا، سارا علاقہ ہی ان کا مرید بن گیا ہے۔۔۔!'' تاجے نے بتایا۔ اس کے انداز میں بلا کی لاپرواہی، بلا کا سکون تھا۔

شاہ ہارون گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے تاج دین عرف تاجا، تاج دین نہ رہا ہو۔ پھیل کر سمندر ہو گیا ہو۔ جس میں ان کی ذات ڈبکیاں کھا رہی ہو۔

''کیوں مرید ہو رہے ہیں۔ سب لوگ ان کے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے بے دھیانی میں سوال کیا۔

لمحے بھر کے ہزارویں حصے میں اچانک تاج دین عرف تاجے کو یہ احساس ہوا کہ وہ یہاں کی کمین تاجا نہیں۔ بے وقعت، بے نام، بے آسرا تاجا نہیں، ایک جیتے ہوئے سپہ سالار کا نمائندہ ہے۔!

''پتا ہے جی کیوں۔!'' تاجے نے کامل سکون سے جواب دیا۔ ''وہ تو بس بندے کو اتنا پیار دیتے ہیں۔ اتنا مان دیتے ہیں کہ بس نہال کر دیتے ہیں، اُجال دیتے ہیں۔ شہد کر دیتے ہیں۔!'' تاجے کی آنکھیں، فرطِ محبت سے، وفورِ جذبات سے، بے پناہ التفات کے احساس سے بند ہو گئیں۔ اس کا رواں، رواں اپنے مرشد کے پیار کی بارش میں بھیگ گیا۔

''کیا کہتے ہیں وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے دھیمے سے پوچھا۔

''جی وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نرگس کو لیجا رہے ہیں۔ تمہیں شاہ ہارون گیلانی بلائیں گے تو بتا دینا۔!'' تاجے نے بے خودی کی کیفیت میں جواب دیا۔

شاہ ہارون گیلانی کے منہ سے بے ساختہ ایک لمبی سانس جاری ہو گئی۔ انہیں لگا کہ جیسے بے پناہ گھٹن ہو رہی ہے۔ وہ تیزی سے اُٹھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ان کے پیچھے پیچھے ان کے کمدار، کمانڈوز بھی باہر نکل گئے۔ تاجا اکیلا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وسیع و عریض ہال خالی تھا۔ تاجے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے باہر آ گیا۔ طویل غلام گردش خالی تھی۔ دھوپ ماند پڑ گئی تھی۔ زرد ا گئی تھی۔ وہ حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ اس کے آس پاس لوگ پھر رہے تھے، مگر وہ ان کے بیچ میں سے گزرتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل آیا۔ اسے کسی نے نہ روکا، نہ ٹوکا۔ وہ حویلی سے باہر آ کر بڑی سڑک سے اُتر کر کھیتوں والی تنگ پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اپنے گھر جانے کے لئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ بہت مطمئن۔ اس کو اسم اعظم مل گیا تھا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ بحیثیت فرد وہ معتبر ہے۔ اور معتبر ہونے

کے احساس نے اس کے اندر تک سکون بھر دیا تھا۔اس کو معتبر کرنے والے قادری سرکار تھے۔

☆.....☆.....☆

شاہ ہارون گیلانی اپنے سٹڈی روم میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔کیوبن سگار ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔مگر وہ اندر ہی اندر بے کلی، بے چینی، غصے، اکتاہٹ اور شدید رنج میں مبتلا تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سینکڑوں میل دور بیٹھا ہوا شخص ان کے مضبوط قلعے میں اتنی کامیابی سے اپنی فتح یابی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔کہاں غلطی، کہاں بھول، کہاں بے احتیاطی ہوئی ہے۔۔!سوال در سوال ان کے اندر جنم لے رہے تھے۔

وہ بہت گھاگ، بہت منجھے ہوئے، بہت طاقتور سیاستدان تھے۔ہوا کا رخ پہچاننے میں ملکہ رکھتے تھے۔ہر قدم اتنا ناپا تلا، سوچ کر، سمجھ کر، اعداد و شمار کو، نفع و نقصان کی بنیاد پر مرتب کر کے اٹھاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف ان کو مات نہیں دے سکتا تھا۔پھر وہ قادری سرکار کو کیا سمجھتے۔؟

قادری سرکار۔۔۔!وہ تو بس یہی سمجھ رہے تھے کہ علاقے میں ان کے چند سو مرید ہونگے۔مگر دیگ کے ایک ہی دانے نے ان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

قادری سرکار سے ان کی ملاقات ملک نیاز نے کروائی تھی۔وہ ٹرانسپورٹ کا وزیر تھا۔شاہ ہارون گیلانی اس کی ساری ہسٹری جانتے تھے۔ایک کھٹارا سی بس سے اس نے اپنے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔اور دس سال کے قلیل عرصے میں اس کا شمار ملک کے چند بڑے ٹرانسپورٹرز میں ہونے لگا تھا۔وہ اس کی ساری وجہ قادری سرکار کی دعائیں قرار دیتا تھا۔قادری سرکار سے ان کو پہلی ہی ملاقات میں کچھ بھی خاص نہیں لگا تھا۔سوائے اس کے کہ قادری سرکار بہت کم اور بہت نپا، تلا بولتے تھے۔سنتے زیادہ تھے۔اور سینکڑوں جملوں کا جواب دو، چار مختصر جملوں میں دے دیتے تھے۔

وہ ان کو عام پیروں سے مختلف تو لگے تھے، مگر بس اس سے زیادہ نہ انہوں نے توجہ دی، نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس کی۔یہ تو ضمنی انتخابات میں، ان کو پتا چلا کہ اس حلقے میں ان کے مریدین کافی ہیں۔تو وہ قادری سرکار کے پاس چلے گئے تھے۔مگر وہاں ان کو ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے وقتی طور پر پسپائی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔مگر اب وہ سوچ رہے تھے کہ ان کا فیصلہ بروقت تھا۔

اندر ہی اندر سرنگ بن گئی تھی۔لیکن کیسے۔؟

تب اچانک ہی قادری سرکار کی آواز جیسے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھر آئی۔

"تم لوگوں سے صرف غرض کا، ووٹوں کا رشتہ رکھتے ہو۔ان کی پیداوار، ان کی صلاحیتیں سب رہن رکھ لیتے ہو۔مگر ان کے حقوق، ان کے حالات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔یاد رکھو معاشرے کے کچلے ہوئے، پسے ہوئے لوگ اگر اکٹھا ہو جائیں تو پھر انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔۔یہ حقائق ہیں۔ذرا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کی دعوت پر غور کرو۔وحدانیت اور مساوات پر سب سے پہلے ایمان

لانے والے، دعوت پر لبیک کہنے والے، امراء تھے، یا عام مزدور، غلام۔۔۔۔؟''

''کیا ہونے والا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کے ماتھے سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ کیا کچلے ہوئے لوگوں کو سہارا دینے، انہیں ہمارے برابر کھڑا کرنے والا آ گیا ہے۔؟'' انہوں نے زور سے سر جھٹکا۔

سگار میں سے موٹا سا گل جھڑا۔ سگار سلگتا ہوا، ان کی انگلیوں کو جلن کا احساس دینے لگا تھا۔ انہوں نے جلدی سے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اور اپنے گرد و پیش یوں دیکھنے لگے کہ جیسے کسی کی موجودگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''کوئی ہے۔؟'' انہوں نے چلا کر کہا۔ مگر لمبی چوڑی سٹڈی روم میں تنہائی کے علاوہ دوسرا کوئی ساتھی نہیں تھا۔

وہ باہر خوف کو تلاشنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر یہ بھول رہے تھے کہ خوف اندر سے جنم لیتا ہے اور برگد کی طرح اپنی جڑیں چاروں طرف پیوست کر لیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''آدمی آدمی کے زخم کا مداوا ہے۔ آدمی ہی زخم کھاتا ہے۔ آدمی ہی زخم دیتا ہے اور پھر آدمی ہی زخم کا مداوا بن جاتا ہے۔'' قادری سرکار کہہ رہے تھے۔ ان کے مریدین، عقیدت مند، مداح سر جھکائے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ''لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم سیکھتے نہیں۔ حالات، واقعات ہمیں اپنے، اپنے طریقے سے سنبھلنے کا، جاننے کا موقع دیتے ہیں۔ مگر ہم ہر واقعہ، ہر حادثے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اور پھر اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ اکثر اوقات قدرت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ہم اس واقعے، اس حادثے کی گہرائی میں جائیں۔ اس کو سوچیں، سمجھیں، اس کا تجزیہ کریں اور اس طرح سے تربیت لیں۔ یہ تربیت کا وہ ربانی پہلو ہے۔ جس کے ذریعے خدا نے اپنے انبیاء علیہ اسلام کو، اپنے پیاروں کو، اپنے اولیاء کو تربیت دی۔ یہ علمِ لدنی کا ظاہری حصہ ہے جو کہ ہر اُس شخص کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ آگے لے جانا چاہتا ہے۔ مگر افسوس آدمی پر۔! وہ ان باتوں کو، واقعات کو، حادثات کو، سمجھنے کی، ان پر غور کرنے کی، زحمت ہی نہیں کرتا۔ بس قسمت کو کوستا، اور تقدیر کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔!'' قادری سرکار خاموش ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے اچانک کائنات سنسان ہو گئی ہو۔

چند لمحے ایسی ہی کیفیت طاری رہی۔ پھر سبحان اللہ۔۔۔ الحمدُ للہ کا ایک شور اٹھا اور یوں لگا کہ جیسے کائنات بیدار ہو گئی ہو۔

قادری سرکار کے درس عام عالموں، پیروں، واعظوں، پروفیسرز نما سکالرز سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ وہ بات کو انتہائی آسان حقیقتوں سے شروع کرتے اور ایسی جگہ لا کر ختم دیتے جہاں سے انسان کچھ نا کچھ سوچنا شروع کر دیتا ہے۔

میں بھی سوچ رہا تھا۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ کہیں قادری سرکار مجھ سے تو مخاطب نہیں تھے۔؟ ہاں ایسا ہی ہے۔ میری محبت نے مجھے بارہ سال تڑپایا۔ راتوں کی نیند حرام کی، سکھ، چین، آرام، کیریئر سب اس کی نذر ہو گیا۔ سارا جیون زخم، زخم ہو گیا۔ آدمی زخم دیتا ہے۔ وہ روحی تھی۔ آدمی زخم کھاتا ہے۔ وہ میں تھا۔ اور آدمی ہی زخم کا مداوا بنتا ہے۔ وہ بھی میں تھا۔ کیا ہو رہا ہے۔؟ میرے اندر بے چینی

پھیلنے لگی۔ میں نے خانقاہ کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وحشت ہونا شروع ہوگئی۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سُنیئے۔۔۔!'' میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

ایک نرم چہرے والے شخص نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ ہی تنزیل ہیں۔؟''

''جی ہاں۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کو قادری سرکار بُلا رہے ہیں۔'' اس نے مجھے پیغام دیا۔ ''آپ اندر تشریف لے آئیں۔!''

''کیا۔؟'' حیرت نے مجھے جکڑ لیا۔ ''قادری سرکار مجھے بُلا رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ کیا ہونے والا ہے۔؟'' بے شمار اجنبی سوالات نے مجھے گھیر لیا۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

جن پر میرے تجسس کی کتاب لکھی تھی

''شاہ جی ضمنی الیکشن میں آٹھ دن رہ گئے ہیں۔'' ریاضے کمدار نے شاہ ہارون گیلانی کو رپورٹ پیش کی۔

شاہ ہارون گیلانی اس وقت اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آٹھ، دس افراد ان کے اردگرد جمع تھے۔ جو کہ ان کے سیاسی معاملات میں معاون تھے۔

''فضل اللہ کیا کہتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے سوال کیا۔

''شاہ جی اس کے ساتھ ساری گل بات ہو گئی ہے۔ کہتا ہے کہ اٹھارہ لاکھ تو ہمارے خرچ ہو گئے ہیں۔ آٹھ دس اوپر ہوں گے تو بات بنے گی۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔

اس ضمنی انتخابات میں سات امیدوار حصہ لے رہے تھے۔ فضل اللہ آزاد امیدوار تھا اور موجودہ وقت میں اس کے حامی اچھے خاصے تھے۔

''ٹھیک ہے پچیس لاکھ روپے دو۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے لاپرواہی سے کہا۔ ''پردہ مانا کیسے۔؟''

''شاہ جی۔!'' ریاضے کمدار نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''میں نے اس کو سمجھایا کہ اگلے الیکشن میں ڈیڑھ برس رہ گیا ہے۔ تو ضمنی میں جیت کر کیا لے گا۔ نا تیری کوئی لابی ہے نا بولی۔ ہر پارٹی اگلے الیکشن پر نظر جمائے بیٹھی ہے۔ جب مضبوط پارٹی کسی اور کو سپورٹ کرلے گی تو تجھے اتنا بھی نہیں ملے گا اور پھر شاہ جی خود اس سیٹ پر کسی کو کھڑا کر دیں گے۔ جس کے ساتھ شاہ جی ہوں گے ووٹ تو سارے اسی کو ملنے ہیں۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یوں سودا پکا ہو گیا۔''

''اور حفیظ داپتر کیا بولتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''تو بول۔'' ریاضے کمدار نے ایک دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا نام اقبال تھا۔ جس کو سب بالا کہتے تھے۔ اس کے بائیں کان میں موٹی سی ایک سونے کی بالی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے اندر ایک سرخ یاقوت پڑا ہوا تھا۔

''شاہ جی سرکار۔۔۔!'' بالے نے اطمینان سے کہا۔ ''حفیظ داپتر تو میمنہ نکلا۔ ایسی شعلہ بیان تقریریں کرتا تھا کہ مانو آگ لگا دے گا۔ میں سیدھا اس کے پاس گیا اور ریحانہ بجلی کی سی ڈی اس کو دکھائی اور جس میں ریحانہ بجلی کی تباہ کن کارکردگی اور آخری سین میں بے چاری کے چنے پڑ ہے جا رہے تھے۔ بس جی میں نے تو پھر اس کو یہی کہا تیری تین بہنوں کے لئے نو بندے کافی ہوں گے یا بارہ۔ بس جی وہ تو فوراً ہی ڈھے گیا۔ پندرہ منٹ میں ہی اس کو ہل ہلا کر تپ چڑھ گیا۔ میں نے دستبرداری کے کاغذات پر سائن انگوٹھے کروائے اور علاج

کے لئے لاکھ روپیا دیکر چلا آیا۔!'' بالے نے بتایا اور شاہ ہارون گیلانی کی طرف دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ اور نظریں جھکا کر قالین کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہ ہارون گیلانی چند لمحے اس کو دیکھتے رہے۔ پھر جیب سے ایک گڈی نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔

بالے نے بڑی عقیدت سے گڈی کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر اٹھا شاہ ہارون گیلانی کی طرف بڑھا۔ نوٹوں کی گڈی شاہ جی کے پیروں سے مَس کر کے چوم کے جیب میں رکھ لی۔

تاج کمدار نے کہا۔ ''پھر ایک مسئلہ ہے شاہ جی۔!''

''کہو۔۔!''

''ایک امیدوار ایسا بھی ہے جس نے ابھی تک انتخابی مہم نہیں چلائی۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔ وہ تو اپنے کاغذات بھر کے ایک پنچائیت کر کے گھر بیٹھ رہا ہے۔!''

''وہ کون ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی چھٹی حس اچانک بیدار ہونے لگی۔ ''کیا نام ہے۔؟''

''خادم حسین نام ہے جی اس کا۔۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔

''کیا ہے اس کا آگا پیچھا۔؟'' بے ساختہ شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''ایم اے، بی ایڈ ہے۔ اس کے باپ کی چار کلے زمین ہے۔ ایک چھوٹا سا سکول اپنی زمین پر بنایا ہے۔ پہلے شہر میں رہتا تھا۔ پھر واپس آ گیا۔ کہتا ہے کہ حکم ہوا ہے کہ جو سیکھا ہے اس کو آگے پھیلاؤں۔ گاؤں والوں نے ہی اس کو کھڑا کیا ہے۔ اس کے پاس تو روپیہ پیسا بھی نہیں ہے جو کماتا ہے وہ وہیں سکول، میں بچوں کی کتابوں، کاپیوں، کپڑوں پر خرچ کر دیتا ہے۔ شادی نہیں کی، باپ ہے، دو بہنیں ہیں، ایک چھوٹا معذور بھائی ہے۔!''

''انتخابی مہم کیوں نہیں چلا رہا ہے۔؟''

''کہتا ہے کہ ووٹ مانگنا، خود کو سرداری کے لئے پیش کرنا خلاف سنت ہے، یہ اللہ کے بندوں کی مرضی ہے کہ وہ کس کو اہل سمجھتے ہیں۔''

''اس کے پیچھے کون ہے۔؟'' بے ساختہ شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''نہ کوئی جماعت، نہ کوئی زمیندار، نہ ٹھیکے دار۔!'' ریاضے کمدار نے کہا۔ ''بس اللہ بیلی ہے۔!'' اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''گدھے۔!'' پتا نہیں کیوں شاہ ہارون گیلانی کو جلال آ گیا۔ ''تو اس کو معمولی سمجھتا ہے۔ جس کا اللہ بیلی ہو۔!''

بولتے ہوئے سب چپ ہو گئے۔ جیسے اچانک ہی سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

''شاہ جی سچ کہتے ہیں۔ ریاضے۔!'' منشی عبدالکریم کی آواز بلند ہوئی۔ ''جس کا اللہ بیلی ہو اس کو دنیا کی کیا فکر۔۔۔! یہ ہمیشہ اللہ والے، شاہ جی جیسے لوگ سمجھتے ہیں۔ چل اٹھ شاہ جی سے معافی مانگ۔!''

''معاف کر دیں شاہ جی۔'' ریاضے کمدار کو تو جیسے اس صورت حال سے نکلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر شاہ ہارون

گیلانی کے پیروں سے لپٹ گیا۔

پھر شاہ ہارون گیلانی کے غصے سے سب ہی لرزتے تھے۔ان کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں تھی کسی میں۔حکم عدولی، غصے، ناراضگی کا شکار ہونے والے ان گنت لوگوں کے احوال ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھے۔بعض اوقات تو انتہائی معمولی غلطی، بے ارادہ، بے اختیار غلطی بھی ظلم اور تشدد کا سبب بن جاتی تھی۔

شاہ ہارون گیلانی کے سنگین لہجے میں اسکرین کی طرح ان کو تمام معاملات کی جھلک نظر آجاتی تھی۔

''خیال کیا کر۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے پاؤں سمیٹ لئے۔

''ذرا اس خادم حسین کو تو بھی کبھی بلاؤ۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ریاضے کمدار کو حکم دیا۔

''جی اچھا جی۔!'' ریاضے کمدار نے سر جھکا کر کہا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

اچانک شاہ ہارون گیلانی کے بلیک بیری موبائل سے ایک دلکش قومی ترانے کی دھن بلند ہونے لگی۔

''ہیلو۔!''

''شاہ جی ہم بول رہے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ایک لحظہ دیر نہ لگائی آواز پہچاننے میں۔

''آپ۔آپ کیسے ہیں۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔وہ سب تیزی سے اٹھے اور الٹے پاؤں باہر نکل گئے۔

چند لمحوں میں ڈرائنگ روم خالی ہو گیا۔

''آپ کب آئے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ بے حد نرم رسیلا ہو گیا۔

تین چار دن ہو گئے ہمیں واپس آئے۔مگر تم نے ہماری خبر ہی نہ لی۔!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جب حکم ہو حاضر ہو جاتا ہوں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ان کے لہجے سے نرمی، مروت، تابعداری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''پھر صبح آجاؤ۔! کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ہمیں واپس درگاہ بھی جانا ہے۔!'' آواز میں بلا کی لاپرواہی تھی۔

''جی بہتر ہے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے حامی بھر کے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ان کے وسیع فراغ بے شکن ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

یہ ڈرا کے رکھنے والے خود بھی کسی سے اندر ہی اندر ڈرتے رہتے ہیں۔بعض اوقات روایتوں کی طرح ڈر بھی لوگوں میں نسل در نسل سرایت کرتا رہتا ہے۔اور ویسے بھی اکثر بڑے آدمیوں کا ضمیر خوف اور لالچ کے خمیر سے گندھا ہوتا ہے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی ملک کی بہت بڑی، بہت محترم، بہت عظیم الشان درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔وہ درگاہ جس کا سنتے ہی دل فرط عقیدت سے، نگاہیں احترام کے بوجھ سے پلکوں کا بوجھ اٹھانا چھوڑ دیتی تھیں۔اس درگاہ سے وابستگی نسلوں کا فخر سمجھی جاتی تھی۔دو چار ہی

درگاہیں تھیں جہاں سے تعلق رکھنا کھرے سید ہونے کی علامت تھا۔اور پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی دونوں ہی چیزوں کیلئے معتبر تھے۔

جس ملک میں تعلیم کا تناسب معہ دستخط کے نام پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا سمیت 22 فیصد سے زیادہ نہ ہو۔ جہاں آج بھی دوسری شادی کے لئے بدکاری کا الزام لگا کر قتل کرنا ایک سماجی رویہ سمجھ کر تسلیم کیا جاتا ہو۔ جہاں عورتوں کی بے حرمتی کو بھی نسلی فخر سمجھا جاتا ہو۔جس معاشرے میں عورت،لڑکا رکھنا باعث فخر سمجھتا جاتا ہو۔اس معاشرے میں پیر کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ جب جہل کا یہ عالم ہو کہ دنیا اور آخرت اعمال کے بجائے پیروں کی خوشنودی پر منحصر کر دی جائے۔تو پھر وہاں المیے،خوف،ڈر،سماجی جرائم کا رونما ہونا اور اخلاقی قدروں کا پامال ہونا ایک عام سی بات رہ جاتی ہے۔

ہندوستان کی نسلی عصبیت آج بھی کسی نہ کسی روپ میں نام بدل کر ہمارے اندر رہتی ہے۔ذاتوں کی تقسیم کا نظام جو کہ مسلمانوں نے گذشتہ بارہ سو برسوں میں جذب کیا تھا۔ کلمے کو اختیار کرنے کے باوجود اسے اپنے اندر سے ترک نہ کر سکے۔ایسا معاشرہ ترقی کر کے،مذہب،سیاست اور معیشت کی طاقتور تکون بن گیا تھا جہاں سب نے اپنے اپنے کارٹل بنا لئے تھے۔اس کارٹل سے باہر رہنا ناممکن تھا اور دوسرا کوئی کارٹل والوں کی مرضی کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اس طاقتور تکون کا ایک بہت اہم حصہ تھے۔ان کے جاری کئے ہوئے نسب نامے ذات کے ارفع ہونے کی دلیل تھے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ مرید تھے۔لطف کی بات یہ تھی ان درگاہوں کی سجادہ نشینی بھی یقینی اور بے یقینی کے حصار میں ڈولتی رہتی تھی۔ ہر گدی کے درجن،درجن بھر دعویدار تھے۔مقدمات،اعتراضات،شکوک اور شبہات سے بھرے ہوئے سجادہ نشین مسکراتے چہروں،چمکتی ہوئی عباؤں جبہ اور دستاروں کے سائے تلے عقیدت اور محبت کے چراغ جلائے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

شاہ ہارون گیلانی کی سیاہ مرسیڈیز،پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی وسیع و عریض کوٹھی کے پورچ میں جا رکی۔ وہ صرف ایک ڈرائیور، ایک گارڈ کے ہمراہ ہی آئے تھے۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے آگے بڑے بڑوں کا کروفر ڈھیلا پڑ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ سیاسی،سماجی،اور مذہبی تینوں ہی حلقوں کی مثلث کی ان دیکھی طاقت تھے،وہ طاقت جو بعض اوقات دکھائی تو نہیں دیتی ہے لیکن محسوس لازمی ہو جاتی ہے۔

جونہی شاہ ہارون گیلانی کی گاڑی کا دروازہ کھلا لپک کر سہیل آگے بڑھا۔ سہیل پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا خاص آدمی تھا۔"زہے نصیب آج شاہ جی تشریف لائے،ہماری قسمت جاگی۔!" وہ بے حد تپاک سے بولا،

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے اور پوچھا۔" کیسے ہو سہیل بڑی سیر سُور کرتے پھر رہے ہو۔؟"

"بس جی شاہ جی پیر صاحب کے اردگرد ہی رہتا ہوں۔ہم پروانوں کی تو وہ ہی شمع ہیں،ان ہی پر ایک دن جل مر جائیں گے۔!" سہیل نے برجستہ جواب دیا۔

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے اور سہیل کی معیت میں اندر داخل ہو گئے۔ابھی صبح کے پانچ ہی بج رہے تھے۔مگر چاروں طرف دن

چڑھے کی چہل پہل تھی۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر وقت محو عبادت رہتے ہیں۔ کبھی سوتے نہیں ہیں، ان کی اس کرامت کے بے شمار گواہ تھے۔ عرس کے دنوں میں محافل میں ان کو مسلسل جاگتا دیکھ کر ان کے مریدین ان پر واری صدقے جاتے تھے۔ لیکن مخالف کہتے تھے کہ وہ نیند نہ آنے کی دوا کھاتے ہیں، یہ سچ تھا، مگر وہ نیند آنے کے لئے دوا کھاتے تھے۔ وہ انسومینیا کے مریض تھے، یعنی وہ بیماری جس میں نیند ہی نہیں آتی۔، بس اونگھ سی آجاتی ہے۔ اندر کا منظر دیدنی تھا۔ انتہائی خوبصورت نشست گاہ تھی، انتہائی مہنگے قالین، سیاہ چمڑوں کی دبیز نشستیں، اردگرد فرانسیسی دریچوں پر سرسراتے ہوئے باریک جارجٹ وشیفون کے پردے، ہر نشست کے سامنے بے حد نفیس برتنوں میں پھل اور میوہ جات رکھے ہوئے تھے۔ خوبصورت مہکتے ہوئے گلدستوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ بتدریج بلند ہوتی ہوئی نشستوں میں سے اونچی وسیع، فراغ نشست پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے مغل شہنشاہ کا دربار، بھرپور ادب، احترام، تکلف اور خوف لیا ہوا احساس چاروں جانب رچا بسا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ وسیع وعریض نشست گاہ میں کوئی نہیں تھا۔ سہیل انہیں بٹھا کر دبے قدموں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک شاہ ہارون گیلانی ادھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر آرام دہ انداز میں نشست پر نیم دراز ہو گئے۔ پتا نہیں کتنی دیر گزری تھی کہ مدھم شور سے انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اندر داخل ہو رہے تھے۔ شاہ ہارون گیلانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی آگے بڑھ کر بغل گیر ہوئے، مصافحہ کیا، اور جب تک پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اپنی نشست پر بیٹھ نہیں گئے کھڑے رہے۔

''یہاں آئیں ہمارے پاس۔'' پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے انہیں مخاطب کیا۔ ''یہاں بیٹھئے۔''! انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر اپنے پاس ہی جگہ بنالی۔ شاہ ہارون گیلانی ان کے پاس بیٹھ گئے۔

''آپ نے یاد کیا۔ کوئی ضروری بات تھی۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے آہستگی سے پوچھا۔

''آپ کے علاقے میں کون کھڑا ہو رہا ہے۔؟''

''عبداللہ۔۔ ہمارا بھتیجا ہے۔'' کچھ عرصے قبل امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے۔ اب سیاست میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔

''اگر آپ کا اپنا بھتیجا ہے تو پھر اس کو الیکشن میں کھڑا کریں۔ ضمنی میں کیا رکھا ہے۔؟'' پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے سوال کیا۔

''اس لئے کہ سال ڈیڑھ پڑا ہے۔ ضمنی میں جیت کر تھوڑا مانوس ہو جائے گا اسمبلی کے ماحول سے، کچھ یاریاں دوستیاں بن جائیں گی، پھر تو بطخ کے بچے خود ہی تیرنا سیکھ لیتے ہیں اپنی جبلت کے سہارے۔!'' شاہ ہارون گیلانی ہنسے۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس جگہ سے ملک ریاض اپنے آدمی کو کامیاب کروانا چاہتے ہیں۔!''

پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ بات طے ہو جائے تاکہ پھر کوئی مشکل نہ ہو۔ بلاوجہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا اچھا نہیں۔!''

''کیا۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا منہ بے ساختہ حیرت سے کھل گیا۔ ''ملک ریاض کی یہ جرأت کہ وہ ہمارے مقابلے میں آدمی کھڑا کرے۔؟''

''بات جرأت کی نہیں حقائق کی ہو رہی ہے۔'' شاہ ہمدانی نے اطمینان سے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ تم اس کے ساتھ الیکشن میں ایڈجسٹ کر لینا۔ معاملہ ملے ہو جائے گا۔!''

''آپ کیوں اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''کیا ہمارے خاندان میں کوئی نہیں رہا جو ہم اس سیٹ کو چھوڑ دیں۔''

''خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے سمجھایا۔ ''اس کو الیکشن میں آنے دو، وہ نئی پارٹی بنانا چاہ رہا ہے، بہت پیسہ ہے اس کے پاس، مگر تجربہ نہیں، گراس روٹ لیول بھی صفر ہے۔ بہت بھرے کو راستہ نہ دو تو پھر چھلک پڑتا ہے۔ ڈیڑھ سال میں خاصی اہمیت بنا لے گا، لوگوں کو ایک نئی پارٹی مل جائے گی اور پھر اس پارٹی کو ہم سب مل کر ختم کریں گے۔!''

''مگر اس کا فائدہ لیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے الجھن ظاہر کی۔

''ہارون گیلانی اپنے محل سے باہر نکلو۔ لوگ بدل رہے ہیں۔ تنگ آ رہے ہیں۔ باسٹھ برس سے ایک ہی کھیل دیکھ رہے ہیں۔ میوزیکل چیئر، باری باری حکومت چل رہی ہے۔ مگر مسائل حل نہیں ہو رہے۔ اس سے پہلے کہ عوام کی قوت کا سیلاب ہمیں بہا کر لے جائے۔ ہمیں اس پہ بند باندھنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔!''

''تو پھر مقابلہ ہونے دیں تاکہ لوگ نورا کشتی نہ سمجھیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''اگر اپنی مرضی سے ووٹ دیکر منتخب کریں گے تو انہیں اقتدار میں شراکت کا احساس ہوگا۔''

''بھولے بادشاہ۔'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ ''اگر لوگوں نے آزادی کے ساتھ، شعور کے ساتھ، سچائی کا ادراک کر کے ووٹ دیا تو پھر وہ نہ تمہیں ووٹ دیں گے اور نہ ہی ملک ریاض کو وہ کسی تیسرے کو منتخب کر لیں گے۔ لوگوں کو محدود آزادی سے زیادہ اجازت نہیں دی جا سکتی، ورنہ سارا سسٹم ڈی ریل ہو جائے گا۔ اور ہمارا سارا جاہ و جلال، شاہانہ کروفر عوام کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔''

''لیکن۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہنا چاہا۔

''سنو۔۔۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے لہجہ بدلا۔ ''ہم نے تمہیں بتا دیا اب تم جانو اور تمہارا کام۔ فیصلہ تمہارا، علاقہ تمہارا''۔

شاہ ہارون گیلانی خاموش ہو گئے، چند لمحے خاموشی رہی، پھر شاہ ہارون گیلانی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔''

''ضرور پوچھو!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے ملائمت سے کہا اور انگور کا ایک بڑا سا دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''آپ کس کے ساتھ ہیں۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے اپنی سوالیہ نگاہیں پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''ہم۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اطمینان سے پہلو بدلا، ایرانی قہوے کا ایک گھونٹ لیا اور صاف اور ہموار لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم وقت کے ساتھ ہیں!''۔

شاہ ہارون گیلانی نے انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اجازت ہے؟'' انہوں نے کہا اور بغیر جواب سنے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی اطمینان سے انہیں دیکھتے رہے۔ جب وہ باہر نکل گئے تو انہوں نے اپنے موبائل فون کے بٹن پش کرنا شروع کر دیئے۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ قائم ہو گیا۔

دوسری طرف شاید کوئی منتظر ہی بیٹھا تھا، سی ایل آئی پر نمبر دیکھتے ہوئے بیتاب ہو گیا۔ ''پیر جی کام ہو گیا۔۔؟''

''نہیں۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے جواب دیا۔ ''ہارون گیلانی نہیں مانا۔ اب تم جو چاہو کر سکتے ہو، کر لو۔''

''پیر جی ہمارا تو نذرانہ ہی ضائع گیا۔''

''اپنے کروڑ کو رو رہے ہو تم تو کہہ رہے تھے ملک ریاض کہ یہ درگاہ شریف کی مرمت کے لئے ہماری طرف سے رکھ لیجئے۔ نذر کرنے کے بعد بھی دل میں میل بھرا ہے۔؟''۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے دُرشت لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا ہم سے تعلق توڑ رہے ہو۔؟''

''ارے۔۔۔ ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' ملک ریاض کی گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''میری توبہ، خدا مجھے مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہ کرے، ایسے تو کئی کروڑ آپ پر نثار۔!''

''پیروں سے جڑے رہو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے چمکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سیاست میں آئے ہو تو دل بڑا رکھو، لوگ تو پچاس پچاس کروڑ لے کر نکلتے ہیں، تمہاری تو اتنی شوگر ملیں ہیں۔ کاروبار ہیں۔ کچھ سرِ عام۔ کچھ خفیہ۔۔ خفیہ سا۔۔!'' وہ ہنسے!

''آپ بھی بس۔!'' ملک ریاض کا لہجہ ایک دم بامروت ہو گیا۔ ''جیسے مناسب سمجھیں لیکن ایک بات ہے۔!''

''وہ کیا۔''

''پھر میں الیکشن میں ہارون گیلانی کا لحاظ نہیں کروں گا۔!''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''ہم نہ تمہیں روک سکتے ہیں، نہ اُسے۔ ہم تو افہام و تفہیم چاہتے ہیں، باقی معاملات تم اہل سیاست جانو۔ ہم تو دعائیں کرتے ہیں۔!'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا اور جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

میں اس آدمی کی ہمراہی میں اندر داخل ہوا۔ یہ ایک روشن اور ہوادار کمرہ تھا۔ جس میں بید کا سادہ سا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ درمیان

میں دیوار کے ساتھ بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس پر سلیقے سے بستر بچھا ہوا تھا۔ اور سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے عین درمیان میں ایک خوبصورت قالین پڑا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں ایک شیشے کی میز رکھی تھی اور اس کے اردگرد دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک خوبصورت دل آویز سادگی آمیز تقدس تھا۔ مجھے اندر لانے والے نے دھیمے سے کہا۔ ''تنزیل میاں آپ یہاں تشریف رکھئے۔ قادری سرکار ابھی تشریف لاتے ہیں۔'' وہ کہہ کر اندر کھلنے والے دروازے کے عقب میں غائب ہو گیا۔

میں تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے انہوں نے بلایا تھا۔ جبکہ میں ان سے پہلے کبھی مخاطب نہیں ہوا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ مجھے مجسم سے جانتے ہیں۔

اچانک کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا یہ خوشبو بہت منفرد، بہت دلآویز تھی۔ اس خوشبو کا تعلق صرف قادری سرکار اور اس خانقاہ سے ہی تھا۔ یہ خوشبو سب میں نمایاں اور منفرد مہک لئے ہوئے تھی۔

''السلام علیکم!'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

وہ حسب معمول سفید شلوار کرتے میں تھے سر پر خوبصورت سا سادہ عمامہ اور مسحور کن دلفریب مسکراہٹ لئے قادری سرکار میرے سامنے تھے

وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ میری نگاہیں ان کے پیروں پر جمی تھیں۔ میرے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ کتنا عجیب معاملہ تھا کہ میں ان سے بھاگتا تھا، دور جانا چاہتا تھا۔ اس خانقاہ اور خود ان کے حوالے سے، میرے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں تھا۔ مگر آج ان کے بلاوے پر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈر، خوف، آس امید، الجھن، بے چینی، عقیدت اور بے بسی کے متضاد جذبوں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس سمے ان کے حوالے سے مجھ پر گزری تمام قلبی وارداتیں، معاملات، جن کی میرے پاس کوئی تفہیم نہیں تھی۔ سب محض کچھ دیر میں میرے سامنے روشن ہو گئیں۔

''وعلیکم اسلام ورحمتہ وبرکاتہٗ۔'' ان کی نرم میٹھی آواز نے میری بے خودی کی کیفیت کو، شعور کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پتا نہیں کیا ہوا، میں نے جھک کر بڑی عقیدت سے ان کے ہاتھ کو تھام لیا، اور ہونٹوں سے چوم کر بوسہ دیا ان کے ہاتھوں سے بڑی نرمی، مگر گرمجوش سی حرارت کا احساس ہوتا تھا۔

''بیٹھو۔!'' انہوں نے اشارہ کیا۔

میں نے آہستگی سے سر ہلایا۔ اور کرسی کی جانب رخ کیا مگر ان کے بیٹھنے کا منتظر رہا۔ جب وہ بیٹھ گئے تو میں بھی کرسی پر ٹک گیا۔

چند ہی لمحوں میں ایک خادم نے چائے لا کر رکھ دی۔ میں مودب بیٹھا رہا۔ انہوں نے چائے کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے کپ اٹھا لیا۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا۔ ''تنزیل میاں آپ حیران ہو رہے ہونگے کہ ہم نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔؟''

اُن کا پہلا ہی جملہ ان گنت سوالوں کے جواب کا دیباچہ بن رہا تھا۔ جن پر میرے تجسس کی کتاب لکھی تھی۔ لیکن ان کے احترام

نے مجھے سوالات سے باز رکھا۔ میں صرف ان کی طرف دیکھتا ہی رہا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''بعض حادثے زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ صبح وشام، دن ورات کا، سُود وزیاں کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔ اندھیروں کو اُجال دیتے ہیں اور خوف کو مار دیتے ہیں۔ جب انسان اپنے اندر کے خوف کو مار دیتا ہے تو پھر ترک کی منزل بہت آسان ہو جاتی ہے۔'' ان کی گہری، مدھر آواز میں ایک عجیب سا سحر تھا۔

''بہت سے لوگ پوچھتے ہیں، جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ صبر کیا ہے۔؟ ان کے نزدیک مصیبت پیش آنے پر خاموش رہنا، واویلا نہ کرنا صبر ہے۔ جبکہ صبر اس سے بلند ہے۔ صبر ترک خواہش کا نام ہے۔ تمام جاہ وجلال، مال ومنال، حیثیت کے چھین جانے کے باوجود اس کے دوبارہ حصول کی خواہش پیدا نہ ہونا، ضائع ہونے پر ملال کے احساس سے پاک رہنا ترک ہے۔ اور اسی ترک کا نام صبر ہے۔ اور یہ بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔!''

''جی۔۔!'' مجھے پسینے آ رہے تھے۔ ان کے ہر لفظ میں میرا جلتا ہوا، زہر گزیدہ، دم گھوٹنے والا ماضی تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھے پیاز کی طرح پرت در پرت کھولتے جا رہے ہیں۔

''کبھی کبھی ہم اس پر حیران ہوتے ہیں کہ دوسرا ہمارے متعلق کیسے جان لیتا ہے۔!'' وہ مسکرائے اور مجھے غور سے دیکھا۔

مجھے عریانیت کا احساس ہونے لگا۔

''جذبے شرمندہ ہونے کے لئے نہیں ہوتے۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب لوگ دین سے ناآشنا ہوتے ہیں تو انہیں پیر مافوق الفطرت شخصیت نظر آنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ رسول متین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور ایک جگہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مقدس ہے کہ مومن مومن کے لئے آئینہ ہے۔ تو پھر جب ایک مسلمان منفی جذبوں کو ترک کر کے ایمان اور سنت کے اوپر اپنی زندگی استوار کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کا قلب مصفا ہو جاتا ہے اور روح قدسی صفات سے ہم آہنگ ہونے لگتی ہے۔ پھر دل اور جذبے ایک دوسرے پر روشن ہو جاتے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ کتنی سادگی سے انہوں نے میرے تمام سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

انہوں نے چائے کا کپ اٹھا لیا اور ہونٹوں سے لگایا۔ ایک ننھا سا گھونٹ بھرا۔ میں نے بھی ان کی اتباع کی۔

الائچی دار چائے کے خوشگوار ذائقے نے میری طبیعت میں ایک عجیب سی بشاشت بھر دی۔ ان چند منٹوں میں مجھے یوں لگا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔ یہ اللہ والے اتنے مثبت ہوتے ہیں کہ طویل مسافرت۔ اجنبی فاصلوں کو لمحے بھر میں منفی کر دیں۔

''ہم اپنی ایک امانت آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''جی۔۔ای۔۔ای۔۔ی!'' میرے اوپر حیرتوں نے گھیرا کر لیا۔ ''کیا میں اس قابل ہوں۔۔!'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''بار امانت اہل کو ہی منتقل کیا جاتا ہے۔ تنزیل میاں۔۔!'' انہوں نے کہا۔

میں چپ ہی رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، کیا کہوں۔ سوائے اس کے کہ میں ان کے ہر فیصلے پر سرِ تسلیم خم کئے جا رہا تھا۔

''کانچ ٹوٹ جائے تو اس کو سنبھالنا بہت کاریگری کا کام ہے۔ انگلیاں فگار ہو جاتی ہیں۔ کرچی کرچی کانچ چنتے ہوئے پلکیں خون آلود ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں کسی کی بخیہ گری ہوتی ہے۔ بہت دھیمے دھیمے۔۔!'' وہ خاموش ہو گئے!

فضا میں جیسے سکوت چھا گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ پیروں میں عجیب سے سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے ذمے کونسی ایسی امانت کرنے والے ہیں کہ جس کے لئے اتنی لمبی تمہید باندھی گئی۔ اور پھر ایسے کیا معاملات ہوئے ہیں کہ وہ امانت میرے پاس زیادہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہاں نہیں۔؟

''تو پھر آپ تیار ہیں۔۔!'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بالکل۔۔!'' مجھے اپنی آواز کی مستعدی اور مضبوطی پر خاصا تعجب ہوا۔

کیا میرے اندر کوئی اور بولتا تھا؟ کیا میں اندر سے تقسیم ہو چکا ہوں۔ کیا میرے لئے کوئی نیا طلسم تیار ہو رہا ہے۔ زندگی ہر پل نئے معنی، نیا جہاں کھوجتی ہے۔ سرسری تم جہاں سے گزرے۔ وگرنہ ہر جاء جہان دیگر تھا۔ کیا ہم اپنے اپنے جہان پہچانتے بھی ہیں یا یونہی بنا ادراک کئے اپنے جہان سے بے خبر ہی گزر جاتے ہیں۔

انہوں نے ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ ان کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے سارے سوال، سارے خیال، ان کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔

''آپ نہ پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر فرمائیں گے۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ پھر اپنے خادم کو آواز دی۔ اور لمحہ بھر میں ہی وہ خادم اندر آ موجود ہوا۔ اور مودب کھڑا ہو گیا۔

''جائیں لے کر آئیں انہیں۔۔!'' قادری سرکار نے خادم کو حکم دیا۔ اس نے سر جھکایا۔ اور اندر دروازے کی طرف غائب ہو گیا۔

میں خاموش ہی کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد خادم خاص ایک برقعہ پوش خاتون کے ہمراہ اندرونی دروازے سے نمودار ہوا۔

''نرگس بیٹا۔! آپ تنزیل میاں کے ساتھ جائیں۔۔!'' قادری سرکار نے کہا۔ اور میری طرف مخاطب ہوئے ''یہ ہماری بیٹی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آپ وعدے کے پاس دار ہیں!''

''جی۔!'' میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ میں کیا کہوں؟ کیا بولوں؟ گھر جا کر اماں سے کیا کہونگا؟ ان کی کو کیا بتاؤں گا؟''

''پریشان نہیں ہوتے۔۔!'' وہ خیالات کو پڑھنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ ''نیکی اور اچھائی آپ اپنا جواز ہوتی ہیں۔ ان کو منوانے کے لئے بلاوجہ تاویل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔!''

''جی۔۔!'' اس بار بھی میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

''جایئے۔۔!اللہ بیلی۔۔!'' انہوں نے کہا۔

ہم تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ خادم ہمیں خانقاہ کے بیرونی دروازے پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میں چند لمحے خانقاہ کے دروازے پر کھڑا سوچتا رہا۔ کیا سوچتا رہا۔ میں بھی نہیں جانتا۔ کبھی کبھی ہمارا اپنا کاسۂ سر بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک بوجھ کی مانند جس کے خالی گنبد میں بے معنی، بے خیال سوچیں، آوارہ روح کی مانند چکراتی رہتی ہیں۔

اچانک نزدیک ہی کوئی کھانسا۔ میں چونکا، وہ برقعہ پوش میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ سیاہ باریک نقاب کے پیچھے سے اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ شائد وہ میری کیفیت سے باخبر تھی کہ میں بے بس، بے خبر ہو رہا ہوں۔ میں نے زور سے سر جھٹکا۔ اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا، وہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے کک لگا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس کو اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا تامل میرے پیچھے میری پشت تھام کر بیٹھ گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہزاروں اندیشوں، اور ہزاروں خوف کے ساتھ، جب راستہ طے نہ کرنا چاہیں تو پھر راستہ کتنی جلدی سمٹ جاتا ہے۔ آج مجھے پہلی بار ادراک ہوا۔ جب جیسے لمحوں میں گھر آ گیا۔ میں نے سائڈ پر بائیک کھڑی کی اور نرگس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا۔

اماں نماز عشاء کے بعد برآمدے میں بیٹھی حسب معمول اپنا وظیفہ کر رہی تھیں۔ وہیں مومی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کتاب رکھ کر تیزی سے اٹھی۔ ''بھائی آپ آ گئے ہیں۔'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ میرے عقب میں برقعہ پوش نرگس پر نظر جمائے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اماں نے اس کی آواز پر سر گھما کر مجھے دیکھا، اور وظیفہ ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ تھوڑی دیر دعا مانگتی رہیں۔ ہم تینوں ایک ساکت منظر کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ دعا مانگ کر انہوں نے حسب معمول ہماری طرف دم کیا اور مومی سے بولیں۔ ''جاؤ کھانا لگاؤ۔!''

''آؤ تم لوگ ادھر آؤ!'' انہوں نے جاء نماز سے اٹھتے ہوئے کہا اور تخت پر جا بیٹھیں۔

ہم دونوں تخت کی طرف بڑھ گئے۔

''اماں۔۔!'' میں نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ ''انہیں قادری سرکار نے بھیجا ہے۔!'' میں نے نرگس کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا۔۔۔!'' اماں نے گہری سانس لی۔ اور نرگس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ''بیٹا اطمینان سے برقعہ اُتارو یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

اماں کے نرم و ملائم الفاظ میری سماعت میں دھماکہ بن کر گونجے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔۔؟'' قادری سرکار کیسا اسم ہیں۔ کیسا طلسم ہیں، کہ ہر کوئی ان کا اسیر ہو جاتا ہے۔؟ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا وجود بگولوں کی زد میں ہے۔ اور میں اس میں تنکے کی طرح اڑا جا رہا ہوں۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔!''مومی نے آگے بڑھ کر نرگس کا ہاتھ تھام لیا اور اندر لے گئی۔

برآمدے میں صرف میں اور اماں رہ گئے۔

''اماں۔۔!''میں نے کہنے کی کوشش کی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس ساری صورت حال کی وضاحت کس طرح کروں۔

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔!''انہوں نے جیسے میری تمام مشکلیں آسان کر دیں۔''جو کچھ زندگی میں پیش آنا ہوتا ہے اس کو ظہور پذیر ہونا ہوتا ہے!''ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''میں سمجھا نہیں اماں!''میں نے حیرانگی سے پوچھا۔''کیا ظہور پذیر ہونے والا ہے۔؟''

''کچھ نہیں۔!''انہوں نے جیسے ٹالتے ہوئے کہا۔''تم تھک گئے ہو گے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔!''اور پھر سے تسبیح میں مصروف ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اماں اب مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ میں چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر اندر چلا گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں نے کپڑے نکالے اور نہانے گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب میں فریش ہو کر باہر آیا تو مومی میرے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی میری منتظر تھی۔ اس کے ایک ایک روئیں سے تجسس چھلکا پڑ رہا تھا۔

''یہ نرگس کون ہیں۔ سچ کتنی سادہ، کتنی خوبصورت ہیں۔ کتنا کم بولتی ہیں۔ گاؤں کی ہیں۔ انہوں نے بی اے کیا ہے۔ یہاں کیسے آئی ہیں۔ آپ ان کو کیسے جانتے ہیں۔ اماں کو کیا پہلے سے ہی سب پتا تھا۔؟''مومی کے ایک ہی سانس میں سوالات کا اژدھام تھا۔

''صبر۔۔۔صبر۔۔۔!''مجھے اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔''اتنے سارے سوالات تو مجھ سے اماں نے بھی نہیں کیے۔!''

''خیر اماں کے تو آپ لاڈلے ہیں۔!''وہ منہ بنا کر بولی۔''مگر مجھے یہ ساری رپورٹ چاہیے ابھی اور اسی وقت۔!''اس کے انداز میں بے حد لاڈ تھا۔ وہ ناز، وہ نخرہ جہاں، اپنائیت کی حدیں دل کے تعلق سے جڑ جاتی ہیں۔

''کیا ہم صبح باتیں نہ کریں۔''میں نے صلاح دی، مجھے سوچنے کا موقع چاہیے تھا۔ مجھے نرگس کے حدود اربعے کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ بلکہ شائد گھنٹہ پھر پہلے وہ کسی بھی حوالے سے میرے لئے نامعلوم تھی۔ بالکل الجبرے کے ایکس کی طرح جسے معلوم کرنا لازمی ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

نادیدہ مہرے جو نظر نہیں آتے

''ٹھیک ہے پھر جلدی سے آجایئے کھانا لگا دیا ہے۔بس آپ ہی کا انتظار ہے!''اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں کھانے کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گیا۔جہاں ہم سب کھانا کھاتے تھے۔اماں بھی آچکی تھیں مومی اور نرگس آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔اور اماں خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

''چلیں سبھی کھانا شروع کریں بھائی بھی آگئے۔!''مومی مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی اور سالن کے لئے پلیٹ نرگس کے آگے رکھی۔

میں خاموشی سے اماں کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔اماں نے سب سے پہلے کھانا نکالا اور پلیٹ میری طرف سرکائی۔ہمیشہ سے ہی اماں کا دستور تھا کہ وہ پہلے کھانا ہمارے لئے نکالتی تھیں۔پھر سب سے آخر میں اپنی پلیٹ میں، سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ بہت اچھا لگتا تھا۔یوں جیسے ہم چھوٹے چھوٹے بچے ماں کے اردگرد گھیرا لگائے بیٹھے ہوں۔

کھانے کے دوران صرف مومی باتیں کرتی رہی۔نرگس ہوں ہاں کرتی رہی،اس نے بہت تھوڑا کھایا۔شائد یہ اجنبی ماحول کا اثر تھا۔اجنبیت آہستہ آہستہ ہی ختم ہوتی ہے۔

کھانا ختم ہوگیا،مومی برتن اٹھانے لگی۔نرگس بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی اور اس کی مدد کرنے لگی۔حالانکہ مومی اسے منع کرتی رہی مگر وہ نہ مانی اماں اور میں اس دوران خاموش ہی رہے۔

اماں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے گھر میں کوئی تبدیلی آئی ہی نہ ہو۔اماں نے صرف یہ سن کر کہ نرگس کو قادری سرکار نے بھیجا ہے ایک لفظ نہ کہا،نہ سنا۔یوں جیسے سب کچھ پہلے سے ہی ان کے علم میں ہو۔مجھے ایک گھبراہٹ آمیز تجسس ہونے لگا۔کیا معاملہ ہے؟ کیا اسرار ہے؟۔اماں کے معاملات میں ہم کبھی کچھ پوچھنے یا بولنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔انہوں نے ہمیں باپ بن کر پالا تھا۔انتہائی سخت گیر۔مگر بے حد محبت سے بھرپور۔ہمیں اپنے معاملات میں ہمیشہ ان سے راہ نمائی ملتی رہی اور وہ بڑے سہج سے ہمیں معاملاتِ زندگی کا شعور دیتی رہیں۔

میں اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔رات کے کھانے کے بعد ہم اماں کے کمرے میں اکھٹا ہو جاتے تھے۔اور اکھٹے چائے پیتے تھے۔دن بھر کی سرگرمیاں،خاندانی معاملات۔سوال جواب سب اسی وقت ہوتے تھے۔مگر آج پہلی بار مجھے اماں کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔میں اماں کے کمرے میں پہنچا تو وہاں چائے کے صرف دو کپ ہی موجود تھے۔اس کا مطلب تھا کہ مومی آج وہاں نہیں آئے گی۔اماں اپنے بیڈ پر نیم دراز تھیں میں اماں کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔

اماں نے مجھے دیکھا اور مسکرائیں۔ ''کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو۔؟''

''اماں۔۔!'' میں نے انہیں چائے کا کپ اٹھا کر تھماتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ساری صورت حال میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ آپ نے نرگس کے متعلق ایک لفظ نہیں پوچھا۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟۔ بس میں نے بتایا کہ انہیں قادری سرکار نے بھیجا ہے اور آپ نے بس!۔'' میں چپ ہو گیا۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ مجھے آگے کیا کہنا چاہیے۔

''اچھا۔۔!'' اماں نے چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور مجھے دیکھ کر بولیں۔ ''تو پھر بتاؤ نرگس کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔؟''

''مجھے۔۔۔ مجھے کیا پتا؟'' میں سچ مچ گڑبڑا گیا۔

''جب تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں تو پھر میں تم سے کیا پوچھوں۔؟'' اماں نے سوال کیا۔

''لیکن۔۔۔!''

''لیکن کیا۔۔؟'' انہوں نے نہایت سکون سے سوال کیا۔ ''یہ سارے سوال جواب تو تمہیں وہاں کرنے چاہیے تھے کہ جہاں سے تم اسے لائے ہو۔!''

''وہ تو بس پتا ہی نہیں کیا ہوا۔ قادری سرکار نے مجھے بلایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں تو کچھ بھی بول نہ پایا۔''

''بیٹا جی پہلی بات تو یہ ہے کہ جو سوال بروقت نہ کئے جائیں وہ اپنی افادیت تو چاہے نہ کھوئیں مگر فرد کی اہلیت پر ضرور سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص ہم سے کہہ رہا ہے اس کی ہمارے نزدیک اہمیت کیا ہے۔ ماننے کا معاملہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ واقعی ہر بات تو سچ تھی۔

''نرگس قادری سرکار کے مرید کی بیٹی ہے۔ گریجویشن کیا ہے۔ گاؤں میں اس کے لئے کچھ مسائل کھڑے ہو گئے تھے۔ اس لئے قادری سرکار اسے چند دن قبل اپنے پاس لے آئے۔ بن ماں کی بچی ہے اب ہمارے پاس رہے گی۔!''

''جی ای۔۔ای۔۔۔!'' میری حیرت کو انہوں نے بھانپ لیا۔

''قادری سرکار نے مجھے فون کیا تھا اور بچی کو رکھنے کے متعلق کہا تھا۔ میں نے حامی بھر لی!'' ماں نے بتایا۔

''قادری سرکار نے آپ کو فون کیا تھا۔؟'' میری حیرت دیدنی تھی۔

''ہاں برسوں پہلے تمہارے والد کے انتقال پر وہ آئے تھے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا وہ ابا کے دوست تھے۔!'' میں نے پوچھا۔ آج پہلی بار قادری سرکار کے متعلق مجھے کچھ معلوم ہو رہا تھا۔

اماں نے ایک گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا کہ اچانک موم کی چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی لائٹ چلی گئی۔

میں بجلی کی سی تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔مگر باہر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔شاید پورے علاقے کی لائٹ جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

شاہ ہارون گیلانی سخت غصے میں تھے۔صورت حال جس تیزی سے تبدیل ہوئی تھی۔اس کا انہیں قطعاً اندازہ نہیں تھا۔حویلی پہنچ کر انہوں نے ریاضے کمدار کو طلب کیا اور اس کے ذریعے اپنے تمام لوگوں کو بلوایا۔

ریاضے کمدار نے انہیں آج بہت عرصے کے بعد اس جاہ وجلال کے عالم میں دیکھا تھا۔اور جب یہ عالم آتا تھا۔تو سارے ہی یہ بات جانتے تھے کہ اب ضرور کوئی ایسی آندھی چلنے والی ہے جس کے بعد کئی رونے والے اپنے پیاروں کی یاد میں ہمیشہ کے لئے روتے رہیں گے۔

وہ سب بہت مودب، بہت محتاط، بہت سہمے ہوئے تھے۔شاہ ہارون گیلانی صوفے پر کبھی بیٹھتے تھے، کبھی اٹھتے تھے، اتنے میں ان کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔انہوں نے موبائل آن کیا۔اور دوسری طرف کی بات سننے لگے۔پھر انہوں نے سوئچ آف کر دیا۔

''یہ ملک ریاض ہمارے علاقے میں کیا کر رہا ہے۔؟'' انہوں نے درشت انداز میں اُن سے سوال کیا۔

''ملک ریاض۔؟'' ریاضے کمدار نے حیرت سے کہا۔''شاہ جی وہ تو شہری بندہ ہے۔دو تین بار ادھر ایک جلسے میں آیا تھا۔اس نے ادھر کوئی زمین، کوئی رقبہ وغیرہ تو نہیں لیا''

''کس کے جلسے میں آیا تھا وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''علی مراد کے جلسے میں۔!علی مراد جی پہلے بھی دو بار الیکشن میں کھڑا ہوا تھا۔مگر ایک بار اس کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔اور دوسری بار اس کو صرف اٹھارہ سو ووٹ ملے تھے۔بڑی دیگاں شیگاں کھلا کے۔روپیا بانٹ کے منت ترلا کر کے۔'' ریاضے کمدار نے رپورٹ دی۔

''ہونہہ۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کو اندرونی طور پر اچھا لگا تھا کہ ان کے بندے علاقے کی تمام سرگرمیوں کی باخبری رکھتے ہیں۔

''تم جانتے ہو کہ ملک ریاض ضمنی ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہے۔؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ جی۔؟'' اقبال عرف بالا نے کہا۔''الیکشن تو ہمارے عبداللہ شاہ جی نے جیتنا ہے۔آپ کے ہوتے ہوئے بھلا الیکشن کوئی اور لے جائے، شیروں سے گوشت کون چھڑائے۔؟'' بالا کے لہجے میں بلا کی لاپرواہی تھی۔یوں جیسے اس نے عبداللہ کے لئے الیکشن کے نتیجے کا اعلان سن لیا ہو۔وہ الیکشن جنہوں نے ابھی ہونا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی کو تسلی تو ہوئی۔،لیکن انہیں پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا لہجہ یاد آ گیا''ذرا اپنی حویلی سے باہر نکل کر دیکھو لوگ بدل رہے ہیں!''

''عبداللہ کے لئے کیا صورت حال ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔''کتنے ووٹ ہونگے۔؟''

''چونتیس ہزار تو پکے ہیں۔!'' ریاضے کمدار نے کہا''آگے دو چار سو کا فرق پڑے تو پڑے۔''

''شاہ جی سرکار۔!'' طارق منیجر نے شاہ ہارون گیلانی کے پاؤں چھوئے۔ ''اگر کوئی بات ہے تو سرکار صرف حکم کریں۔'' وہ بلا کا مزاج شناس تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور ان سب کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ سب انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں ان کے لئے مر مٹنے کا، قربان ہو جانے کا عزم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کو ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان کی سلطنت کے رعب و دبدبے کو قائم رکھتے، طاقت، خوف، لالچ کے نادیدہ آسیبوں سے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑتے تھے۔ وہ نادیدہ مہرے جو نظر نہیں آتے، مگر اپنے پورے وجود کی طاقت سے محسوس ہوتے ہیں۔

''عبداللہ کا جلسہ کب ہے۔؟'' انہوں نے جیسے بات بدل دی۔

''کل شام کو۔''

''حالات تو ٹھیک ہیں نا۔؟'' انہوں نے بڑے سرسری لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک ہیں سرکار جی۔!'' نیاز نے مستعدی سے جواب دیا ''سیکورٹی بڑی سخت ہے۔ پھر آپ بھی وہاں جا رہے ہیں۔ اس لئے سرکاری اور ہماری دونوں ہی مل کر ہر طرح سے معاملات دیکھ لیں گے!''

''وزارت داخلہ کی طرف سے بھی احتیاط کی ایڈوائس آئی ہوئی ہے!'' شاہ ہارونی گیلانی نے کہا۔ ''سیکورٹی کی صورت حال پورے ملک میں مخدوش ہے۔ جگہ جگہ دھماکے ہو رہے ہیں۔ پھر سب سے مشکل اور پیچیدہ صورت حال تو خودکش حملہ آوروں نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان کو روکنا بے حد مشکل ہوتا ہے اس لئے احتیاط بہت ضروری ہے۔!''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل برخاست ہوئی۔ سب دبے پاؤں نکلتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

شاہ ہارون گیلانی حویلی کے اندر آئے، تو شاہ عبداللہ گیلانی اندر ہی موجود تھا۔ اونچا، لمبا، بے حد خوبصورت، امریکا سے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کر کے آیا تھا۔ عبداللہ ان کی نازوں پلی بیٹی نازاں کا منگیتر بھی تھا۔ اس وقت وہ سارے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔

''آئیں چاچو۔!'' عبداللہ گیلانی ان پر نظر پڑتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ نزدیک آئے تو اس نے بڑے ادب سے سر جھکا دیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا، پھر پیار سے بولے۔ ''کھانا کھا لیا۔؟''

''نہیں۔۔۔!'' ان کی بیگم نے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہوا کہ آپ باہر آ گئے ہیں، اور کوئی لوگ بھی نہیں ہیں تو سوچا کہ آج سب آپ کے ساتھ اکٹھا کھانا کھا لیں۔!''

''یہ تو بہت اچھا ہے!'' شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ''آج تو ہمیں اپنے گھر والوں کے ساتھ کھانے کا موقع مل رہا ہے۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ عبداللہ بھی موجود ہے۔!'' وہ خوش دلی سے بولے اور کپڑے تبدیل کرنے اندر بڑھ گئے۔

انہیں عبداللہ سے پیار بھی بہت تھا۔صرف ایک ہی بھتیجا تھا ان کا،ان کے بڑے بھائی اب سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ دو بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے۔دونوں داماد میں سے ایک کی شوگر مل تھی اور دوسرے داماد کی ایک بہت بڑی ہوم اپلائنسز بنانے والی کمپنی میں ساجھے داری تھی۔اور ان دونوں کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔مگر شاہ ہارون گیلانی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ عبداللہ کو سیاست میں لائیں گے۔کیونکہ صنعت کاری،زمینداری،حکمرانی کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

رات کا پچھلا پہر رخصت ہو رہا تھا۔شاہ ہارون گیلانی اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔کیوبا کا موٹا سا گار ان کی انگلیوں کے درمیان سلگ رہا تھا۔پورے اسٹڈی روم میں تمباکو کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ان کی چوڑی پیشانی قدرے شکن آلود تھی۔چہرے پر تفکرات کے سائے صاف محسوس ہو رہے تھے۔انہوں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔رات کے تین بج رہے تھے۔

اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر دو آدمی اندر آ گئے۔دونوں نے چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ان دونوں نے جھک کر شاہ ہارون گیلانی کے پاؤں چھوئے اور احترام سے کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھ جاؤ۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری آواز گونجی۔انہوں نے اپنی چادریں اتاریں اور نیچے بیٹھ گئے۔ان میں سے ایک اقبال عرف بالا تھا،اور دوسرا اجنبی۔

''حکم شاہ جی۔!'' اجنبی شخص نے ان کے پیروں کو پھر سے ہاتھ لگایا۔اور بہت نرم،احسان سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔''ہماری جان تو سرکار کا قرض ہے۔آپ کی امانت ہے۔''

پہلی بار شاہ ہارون گیلانی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔بھینچے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی باریک سی لکیر نمودار ہوئی۔

''کل عبداللہ گیلانی کا جلسہ ہے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہنا شروع کیا۔''اس مرتبہ ملک کی سیکیورٹی کی صورت حال کافی مخدوش ہے۔آئے دن دھماکے اور خودکش حملے معمول بنتے جا رہے ہیں۔اس سے کبھی کبھی بہت نقصان بھی ہو جاتا ہے۔!''

''سمجھ گیا سرکار۔۔!'' بالے نے شاہ ہارون گیلانی کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔''علی مراد کے جلسے میں کیا کرنا ہے؟ دھماکہ۔۔یا خودکش دھماکا؟''

''ہونہہ۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بالے کی بات پر یوں ہنکاری بھری،جیسے اس نے انتہائی بچکانہ تجویز پیش کی ہو۔''بے وقوف۔دھماکا علی مراد کے جلسے میں نہیں،عبداللہ گیلانی کے جلسے میں کرنا ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے قدرے خفگی سے کہا۔

''جی۔۔!'' مارے حیرت کے بالے کا منہ کھل گیا۔''سرکار اپنے جلسے میں،اِدھر تو اپنے عبداللہ شاہ جی ہونگے۔!''

''شاہ جی دھماکے کا کہہ رہے ہیں پاگلے،خودکش دھماکے کا نہیں۔!''

''رحیم شاہ ٹھیک سمجھا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے توصیفی نگاہوں سے تیسرے اجنبی جس کا نام رحیم شاہ تھا،کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مخالف کے جلسے میں دھماکے کا الزام تخریب کاروں اور ملک دشمن عناصر سے پہلے ہمارے اوپر آجائے گا۔!''

''ٹھیک سات بجے دھماکا ہونا چاہیے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''ٹھیک پونے سات بجے عبداللہ ڈائس چھوڑ دے گا۔ اس کے ڈائس سے ہٹنے اور کرسیوں پر بیٹھنے کے دوران۔ چار پانچ بندوں سے زیادہ کام نہ آئیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے چار پانچ پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا شاہ جی سرکار۔!'' رحیم شاہ نے اطمینان دلایا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اس سے پہلے کبھی آپ کو شکایت کا موقع ملا ہے؟ جواب ملے گا؟''

''ہاں یہ تو ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے سر ہلایا۔ ''اس کے بعد تم گھومنے پھرنے کے لئے دوبئ چلے جانا۔ سارا انتظام بالے کے ذمے ہے''۔ انہوں نے کہا اور بالے کی طرف دیکھا۔ یہ گویا بات چیت ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

وہ دونوں اٹھے اور شاہ ہارون گیلانی کے پیروں کو چھو کر، سلام کر کے اسٹڈی روم سے باہر نکل گئے۔

شاہ ہارون گیلانی نے کرسی کی پشت سے خود کو ٹکا کر پشت سیدھی کر کے گردن پیچھے ٹکا دی۔ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ مفاد کے سامنے کوئی دیوار نہیں کھڑی ہو سکتی۔ سیاست کی دنیا میں کامیابی کا صرف ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ اس سے قبل کہ اگلا تمہیں کچل کر تم پر پاؤں رکھ کر کامیابی کی سیڑھی پھلانگ جائے، اسے ہر قیمت پر شکست دیدو، ملیا میٹ کر دو۔ ان کا ہر فیصلہ بڑا نپا تلا، ہر قدم سود و زیاں کے حساب کے بعد اٹھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے تھے، مگر آج پہلی بار انہیں قدرے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اس مرتبہ ان کا بھتیجا ان کے سامنے تھا۔ بے حد عزیز اور پیارا بھتیجا۔ جو ان کی بیٹی نازاں کا مستقبل بھی تھا۔ انہوں نے اس کے متعلق بہت سارے خواب بنے تھے۔ اس لئے ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز ان کا بھتیجا عبداللہ شاہ گیلانی ہی تھا۔ انکا بیٹا ابھی نوعمر تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کے دس بج رہے تھے۔ عبداللہ شاہ گیلانی حویلی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد تقریباً چالیس پچاس افراد کا مجمع تھا۔ عبداللہ گیلانی کہہ رہا تھا۔ ''جب تک ہم لوگوں کی رائے کا احترام کرنا نہیں سیکھیں گے۔ ان کے احساسات اور جذبات میں شامل نہیں ہونگے۔ ہم اپنے لوگوں اور اپنے عوام کے درمیان کے فاصلے نہیں مٹا سکتے۔!''

''لو جی شاہ جی۔!'' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''بھلا آپ جیسے اُجلے اُجلے آدمی کا میلی، کچیلی، بدبودار عوام سے کیا تعلق۔؟ ایک ہی کمرے میں بیوی، بکری تندور، لڑکے بالے، لکڑ بالن، ساز و سامان اور کہاں آپ خوشبودار، لش پش۔۔۔''

''سوچ کو بدلنا پڑے گا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''جب تک ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کو برابر نہیں سمجھیں گے خوشبو اور بدبو کے احساسات ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھیں گے۔!''

''لیکن شاہ جی۔!'' فیقے نے سر کھجاتے ہوئے سوال کیا۔''جب ہم نزدیک جائیں گے۔تو پھر دوری مٹ جائے گی۔اور جب دوری مٹ جائے گی تو خوف ختم ہو جائے گا۔پھر ضروری تو نہیں کہ ہر آدمی ہمارے کہے کو حکم سمجھے۔اور صرف ہم ہی کو ووٹ دے۔پھر ہماری سرداری کہاں جائے گی۔؟''

''جی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے چھوٹے شاہ جی۔!'' دوسری آوازیں اس کی تائید میں بلند ہوئیں۔''لوگ آنکھ کا اشارہ تربیت کے بعد ہی سمجھتے ہیں۔عوام جانور کی طرح ہوتے ہیں۔اور جانوروں کو مار، مار کر سدھایا جاتا ہے۔خوف، لالچ، اور انعام۔جی ان سے جانور بھی سیکھتے ہیں اور بندے بھی۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی نے انہیں بے بسی سے دیکھا۔یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے وہ خواب بنتا تھا۔امریکا چھوڑ کر آیا تھا۔چاچا جی تو کس قدر انسانیت اور محبت سے بھرپور تھے۔مگر یہ لوگ شائد اس کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ان کے لئے آج بھی کامیابی کے اصول لگے، بندھے اور صدیوں آزمودہ والے ہی صحیح تھے۔

عبداللہ شاہ گیلانی اپنے چچا شاہ ہارون گیلانی سے بہت پیار کرتا تھا۔اس کے لئے چچا ایک آدرش، ایک معیار، ایک علامت تھے۔جن سے اس نے زندگی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے نرم و سجل چچا کے سیاسی معاملات کو نہیں جانتا تھا۔اور سیاست کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بے نیاز ہوتی ہے۔

اسی وقت دروازے پر ہلچل سی ہوئی۔تین چار لوگ اندر آئے۔ان کے درمیان میں چھوٹے شاہ جی نعمان شاہ گیلانی تھا۔شاہ ہارون گیلانی کا اکلوتا لاڈلا بیٹا۔شکل وصورت میں، قدبت میں اپنے باپ کی مکمل تصویر۔

''بھائی جان۔!'' وہ عبداللہ شاہ گیلانی سے لپٹ گیا۔وہ بہت پیار کرتا تھا اپنے چچازاد سے۔بچپن میں ہر وقت عبداللہ شاہ گیلانی کا ناک میں دم کئے رکھتا تھا۔ایک دوسرے کے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔دس برس چھوٹا تھا وہ عبداللہ شاہ گیلانی سے۔

''کب آئے۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''مجھے امی نے فون پر بتایا کہ آپ کو آئے ہوئے تین چار دن ہو گئے ہیں۔میرے سمیسٹر کے آخری دو پیپرز تھے وہ دیتے ہی سیدھا آ گیا۔آپ کیسے ہیں آتے ہی سیاست میں لگ گئے۔!''

''چچا جان کا حکم جو ہے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ہنس کر کہا۔''ویسے بھی بطخ کا بچہ پانی کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔؟ سیاست کے بغیر ہم، اور ہمارے بغیر سیات ادھوری ہے۔''

''مگر مجھے تو آپ سیاست دان سے زیادہ ہالی وڈ کے ہیرو لگتے ہیں۔'' نعمان شاہ نے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''اُدھر کسی جگہ ٹرائی ماری تھی۔؟''

''تم بالکل بھی نہیں بدلے۔!'' عبداللہ شاہ نے پیار سے چپت لگائی، اس کے گالوں پر۔اسی وقت اندر سے ایک ملازم نے آ کر

کہا کہ ان دونوں کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ یہ سن کر نعمان شاہ گیلانی اٹھ کھڑا ہوا اور اندر چلا گیا۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے دوبارہ ان لوگوں سے پوچھا۔ ''جلسے کے لئے سارے انتظامات مکمل ہیں؟''

''جی شاہ جی۔!'' فیقے نے ادب سے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں بس آپ نے جلسہ لوٹ لینا ہے!''

''کیا مطلب۔؟'' عبداللہ شاہ نے حیرت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے جی ایسی تقریر کرنی ہے کہ بس جی لوگ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ بس جی ذرا جذباتی شذباتی، آستین چڑھا کر، مخالفوں کے لتے لینے ہیں۔''

''یہ سلطان راہی کی کوئی فلم نہیں۔!'' عبداللہ شاہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''لوگوں کو جب حقائق بتائے جائیں، ان کی ضروریات کو اُجاگر کیا جائے۔ صحیح راہ دکھائی جائے تو پھر لوگ خود بخود ساتھ ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا جی۔!'' فیقے نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔!'' اور کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ عبداللہ شاہ گیلانی اندورنی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی چوڑی پشت پر نظر جمائے پہلی بار فیقے کو احساس ہوا کہ عبداللہ شاہ گیلانی کے اندر کچھ بہت مختلف ہے۔ لیکن کیا؟ اسکا اس کو ادراک نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

''کیا ہوا۔!'' میں نے تیزی سے پوچھا۔ اور تیزی سے گرتے ہوئے سراپے کو اندھیرے میں ہی تھام لیا۔

''وہ میں۔'' اس کے منہ سے بے معنی سی آواز نکلی۔ یہ مومی نہیں کوئی اور تھا۔ ''وہ میں۔'' اس نے کسماتے ہوئے کہا اور دھیمے سے مجھ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

میں نے آواز دی۔ ''مومی کیا ہوا؟''

''پتا نہیں۔ یو پی ایس کا بٹن آن کر دیں''۔ مومی کی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ''جہاں ہو وہیں رہو۔ میں بٹن آن کرتا ہوں۔'' میں اندازے سے یو پی ایس کی جانب گیا۔ اس کی سرخ بتی اندھیرے میں روشن تھی میں نے بٹن آن کیا۔ اس کے ساتھ ہی روشنی ہو گئی۔

''اب بتاؤ کیا ہوا۔؟'' میں نے کچن کے دروازے پر کھڑی مومی سے پوچھا۔

''وہ چھپکلی میرے ہاتھ پر گری تھی۔!'' مومی نے بتایا۔ ''میں ڈر گئی اسی وقت لائٹ چلی گئی۔!''

''چھپکلی۔!'' نرگس نے کہا۔ ''اس سے ڈرنے کی کیا بات ہے کدھر ہے۔؟'' اس نے وائپر اٹھایا۔

''آپ کو ڈر نہیں لگتا۔؟'' مومی نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈر کیسا۔؟'' نرگس نے اطمینان سے کہا۔ ''گاؤں میں سانپ، بچھو، کھن کھجورے، چھپکلیاں، لال بیگ، نیولے، چوہے، روز

مرہ کا معمول ہیں۔ بالن کے ساتھ چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ان سے ڈر گئے تو پھر زندگی کیسے گزاریں گے۔؟'' وہ مسکرائی۔

''پھر آپ کو ڈر کس سے لگتا ہے۔؟'' مومی نے سخت متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''انسانوں سے۔!'' اس نے ایک گہری سانس بھر کے کہا اور ساتھ ہی وائپر بھاگتی ہوئی چھپکلی پر مارا۔ چھپکلی کی دم کٹ گئی اور پیٹ پھٹ گیا۔ اس نے وائپر سے چھپکلی کو اٹھایا اور کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ مومی اسے دیکھتی رہ گئی اور وہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں چلی گئی۔

''بھائی یہ کتنی عجیب سی ہیں۔!'' مومی نے میرے نزدیک ہو کر کہا۔ ''مجھے تو اچھی لگنے لگی ہیں۔!''

''تمہیں تو ہر کوئی اچھا لگنے لگتا ہے۔!'' میں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت امی نے آواز دی اور میں اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ کہہ رہے تھے اور لوگ سر جھکائے سن رہے تھے ''ہمارے پاس انبیاء علیہ السلام آئے، کتابیں، صحیفے آئے۔ پھر شعور اس بلندی پر پہنچا کہ جب انسانیت کی معراج کی تکمیل کو سمجھ سکے، تو رسول مکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، توحید کا پیغام لیکر، خالص، سچا اور معتبر پیغام جس میں ہر مشکل کا حل، ہر سوال کا جواب موجود ہے۔!''

''سرکار!'' ایک طرف سے ایک ہاتھ بلند ہوا اور وہ ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ ''میں ایم ایس سی میتھ کا طالب علم ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو تخلیقی فارمولے ہیں ان کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ایسے فلسفی، ایسے پیر، ایسے عالم دین مل جائیں تو پھر دنیا بہت جلد اسلام سے مطمئن ہو جائے گی''۔

''اچھی بات ہے۔!'' قادری سرکار مسکرائے۔ ''میں اس پر چند باتیں آپ لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ دین کے ایک ایسے رُخ کو دیکھ سکیں جو آپ کے لئے بے حد ضروری ہے۔!'' وہ نوجوان بیٹھ گیا اور نہایت توجہ سے سننے لگا۔

قادری سرکار نے بات کا آغاز کیا۔ ''آج کل ایک وبا چلی ہے کہ نماز کے یہ فائدے ہیں۔ سجدہ کرنے سے دوران خون تیز ہو کر سر کی جانب جاتا ہے۔ دماغ کو آکسیجن زیادہ ملتی ہے۔ بندہ زیادہ ذہین ہوتا ہے۔ رکوع سے کمر کی ہڈی پر بہتر اثر پڑتا ہے۔ روزے سے امراض کو کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جگر، گردے، شوگر کے مریضوں کے لئے روزہ بہت مفید ہے۔ مسواک کے یہ طبی فائدے ہیں۔ کھانے میں اکڑوں بیٹھنے سے معدے پر بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معدہ کم پھیلتا ہے۔ لیکن۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور حاضرین کی طرف دیکھا۔

''لیکن عزیزان گرامی! ہم فرائض دین کی توجیہات میں الجھ گئے۔ اور دین کا اصل مفہوم بھول گئے کہ ہمارے رُکوع اور سُجود، ہمارے روزے اور عبادت، فقط حصولِ رضائے الٰہی کے لئے ہے۔ اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی عمارت قائم ہے۔ جب محبت اور اطاعت میں تاویلات شامل ہو جائیں گے تو پھر سودے بازی، سود و زیاں کے معاملات سر اٹھائیں گے۔ پھر نماز، عبادت اور حضوری کے بجائے۔ یوگا کی ایکسرسائز بن جائے گی۔ کیونکہ نماز مومن کی معراج کے بجائے، بدن کی اصلاح کے حوالے سے قائم ہو گی۔ تو پھر میرے دوستوں۔! عبادت تو غیر مشروط ہوتی ہے۔ حساب کتاب سے بے نیاز، محبت میں سودا نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو مکمل خود سپردگی اور حوالے کرنے کا نام ہے۔!''

''سبحان اللہ! اللہ اکبر۔۔۔ ماشاءاللہ!'' بے ساختہ آوازیں بلند ہوئیں۔ کئی لوگ بے تابانہ کھڑے ہو گئے اور بے ساختہ ان کے ہاتھ چومنے لگے۔

''حضور سرکار آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔!'' اسی نوجوان نے کہا۔

''بیٹے آپ لوگ ہماری آنکھیں ہو۔ ہمارا کل ہو۔ ہمارے وطن کا سرمایہ ہو۔ تم لوگوں کی فکری تربیت، دین کی اصل کا علم ہمارے مستقبل کو نہیں ہوگا۔ تو پھر ہم کھوکھلے ہو جائیں گے۔!'' انہوں نے بڑی محبت سے نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیا اجازت ہے کہ ہم لوگ آئندہ بھی حاضر ہوتے رہیں۔؟''

''کیوں نہیں عرفان میاں۔'' قادری سرکار نے محبت سے کہا۔ ''آپ لوگوں سے مل کر طمانیت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان علم اور عمل دونوں کی جانب توجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس ملک کے نوجوان علم اور عمل دونوں پر آمادہ ہو جائیں اس ملک کو ترقی پانے اور اٹھ کھڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔!''

''کاش علماء اور مرشد آپ جیسے ہو جائیں۔!'' عرفان کے ساتھ آئے ہوئے لڑکے نے عقیدت سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''سب اچھے ہیں۔ بس ہر شخص گفتگو اپنے فہم کے مطابق کرتا ہے۔ ہمیں کسی سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔!'' قادری سرکار نے ملائمت سے کہا۔

''جی صحیح فرماتے ہیں آپ۔!'' اس نے کہا اور قادری سرکار کے ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دیکر ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب ایک ایک کر کے خانقاہ سے نکل گئے۔

''یہ کون تھے۔؟'' میں نے ایک خادم سے سوال کیا۔

''یہ سب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس تھے۔ سرکار سے گفتگو کے لئے آئے تھے۔!'' خادم نے بتایا۔

''اچھا۔!'' میں نے قادری سرکار کی طرف دیکھا وہ اپنے تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ ایک خادم ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے سر جھکائے خادم سے کوئی بات کی، خادم نے ادب سے سر ہلایا۔ اور پھر اٹھ کر میری طرف آنے لگا۔

خادم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ نجانے کیا بات تھی جب بھی قادری سرکار سے میرا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ ایک انجانا سا خوف میرے رگ وپے میں سمانے لگتا تھا۔ مجھے ان کے دیکھنے کے انداز میں، توجہ سے یوں لگتا تھا کہ جیسے اندر تک اترے جا رہے ہوں۔ جیسے ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ میں نہ ان کا مرید تھا نہ عقیدت مند، لیکن میں کیوں یہاں آتا تھا؟۔ کیوں ان کے سامنے سرنڈر ہو جاتا تھا؟۔ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تفہیم آسان نہیں ہوتی۔ یہ رشتہ بھی ان ہی رشتوں میں سے ایک تھا۔ خادم نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کشاں کشاں اس کے پیچھے چل دیا۔ یہ وہی خادم تھا جو مجھے کل بلانے آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بھائی کو کتے کھا گئے

میں کمرے میں داخل ہوا تو قادری سرکار سامنے ہی بیٹھے تھے۔ان پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ میں نے انہیں سلام کیا۔انہوں نے خوش دلی سے میرے سلام کا جواب دیا اور بولے۔''تنزیل میاں آپ سے ہمیں ایک بہت ضروری کام ہے۔!''

''جی مجھ سے۔؟''میں نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔''میں بھلا آپ کے کیا کام آسکتا ہوں۔؟''

''ہر آدمی اس کائنات میں اپنی اپنی جگہ اہم کام سرانجام دے رہا ہے۔مسئلہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہم اس کے اور اپنے کام کے درمیان کی نسبت اور معنویت تلاش کرلیں۔!''انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔

''جی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔!''میں نے کہا۔حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

قادری سرکار میری بات پر مسکرائے۔مجھے لگا کہ جیسے ان کی مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ ہم جانتے ہیں کہ تم کچھ نہیں سمجھے۔!انہوں نے خادم کی طرف دیکھا وہ جلدی سے ایک قلم اور لیٹر پیڈ اٹھالایا۔اور بڑے ادب سے میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد پھرتی سے وہاں سے غائب ہوگیا۔

قادری سرکار نے مجھے لیٹر پیڈ اور قلم اٹھانے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔''تنزیل میاں جو لکھوانے جارہے ہیں اس کو احتیاط سے قلم بند کیجئے۔!''

''جی۔۔۔!''میں نے سعادت مندی سے کہا۔میرے اندر کسی سوال جواب کا یارا نہیں تھا۔ان کے سامنے تو میں جیسے سحر زدہ ہوجاتا تھا۔''جی لکھوایئے۔!''

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

انہوں نے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔!عزیزان گرامی۔!سب سے پہلے تو میں آپ تمام بہن بھائیوں،عزیزوں اور بزرگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے مسائل کی نشاندہی کے لئے ایک ایسے فرد کو منتخب کیا۔جس کا ماضی،کردار،معاملات آپ کے سامنے ہیں۔جو اپنے مالی وسائل،ذہنی قابلیت،جسمانی مشقت آپ کے بہتر مستقبل کے لئے کررہا ہے۔یاد رکھئے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ ہے کہ ایسے بے داغ کردار کے نوجوانوں کو اپنے معاملات کی باگ ڈور سونپنی چاہیے،جو کہ کسی طور بھی اپنے اصولوں سے انحراف نہ کرتے ہوں۔کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوت دین دی۔تو سب سے پہلے اپنے بے داغ،اجلے،روشن،چالیس سالہ

ماضی کو پیش کیا۔ایک اعلیٰ خاندان ہونے کے باوجود دین کی دعوت دینے کے لئے خاندان کی نسبت کو ساتھ میں نہیں جوڑا۔اپنے مال کا لالچ نہیں دیا۔صرف اپنے بااثر، خوشحال دوستوں کو اپنا ساتھی نہیں بنایا۔ بلکہ تمام عزیز واقربا، دوست احباب، آزاد، غلام، پست و بلند ہر مرتبے کے شخص کو دعوت دین دی۔ایک ایسے دین کو اپنانے کی دعوت، جس میں سطوت، عظمت، قربانی، جنت اور دنیا شانہ بشانہ چلتے تھے۔اور چلتے ہیں۔آج کے اس پر آشوب دور میں، جب کہ ہر طرف ظلم، بددیانتی، اقربا پروری، جھوٹ، منافقت، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، کا بازار گرم ہے۔تو کیا آپ کردار کو، علم کو، ذہانت کو، سچائی کو، عزم کو، ہمت اور خدمت کو اپنائیں گے۔یا ایک بار پھر ظلم، زیادتی، خوف، خاندان، لالچ کو ووٹ دے کر منتخب کریں گے؟۔اور پھر ان کے ہر ظلم میں بھاگی دار بن کر برابر کا عذاب چکھنے کو ترجیح دیں گے۔فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ وطن عزیز میں زلزلے، سیلاب، امراض وباؤں کی صورت میں کیوں پھوٹتے ہیں؟۔ہم تو حکمران بھی نہیں پھر ہمیں عذاب کیوں مل رہا ہے؟۔عام لوگ کیوں عذاب جھیل رہے ہیں؟۔تو دوستوں۔!تو پھر دوستوں۔!اس کا جواب یہ ہے کہ غربا، مساکین اور عام افراد پر عذاب اس لئے آتا ہے کہ یہ ظلم وزیادتی کو برداشت کر کے سنت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔اپنے خوف، مصلحت پسندی بزدلی، بے ہمتی کو آزمائش قرار دیکر اس خدائی فرمان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ جس میں کہا گیا ہے۔کہ ''خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو قوم خود اپنے حالات کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔''اگر آپ آج نہیں بدلیں گے تو پھر کل آپ نہیں ہونگے۔!عزیزی خادم حسین کے پاس دولت نہیں کہ جس سے وہ ووٹ خرید سکے۔اتنی افرادی قوت نہیں کہ جس سے وہ گھر، گھر جا کر ووٹ کی پرچیاں بانٹ سکے۔حق اور سچائی کی راہ میں آپ ہی اس کے نمائندے، آپ ہی اس کے سپورٹر، آپ ہی اس کے پولنگ ایجنٹ ہیں۔کیا آپ دین کے راستے پر چلتے ہوئے خادم حسین کا ساتھ دیں گے؟ میرے امیدوار، میرے بچے کا ساتھ دیں گے۔وہ سچائی اور ایمانداری جس کی سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری حیاتی تبلیغ کی۔جس کے لئے ہر مشکلات جھیلیں اور ہم تک دین پہنچایا۔سچائی اور اصول دیئے۔!اب اس اصول کی پاسداری اور اس تعلیم کا امتحان ہے۔جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی۔آپ فیصلہ کر لیجئے کہ آپ سچے شاگرد اور امتی ہیں یا نہیں؟۔!''

والسلام دعا گو!

''تنزیل میاں۔!''قادری سرکار ایک طویل سانس لے کر ذرا ٹھہر کے کہا۔''ذرا آپ اس خط کو دیکھ لیجئے۔اگر اس میں کوئی کمی بیشی کرنا ہو تو ضرور کر لیجئے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔!''میں بری طرح سٹپٹا گیا۔میں تو خط کے آسان اور سادہ لفظوں کے سحر میں گم تھا۔کتنی سادگی اور پُر کاری سے انہوں نے خادم حسین کے لئے انتہائی دلکش لب ولہجے کا انتخاب کیا تھا۔

''آپ کے اس خط میں کوئی کمی نہیں ہے۔!''میں نے حقیقتاً بے حد خلوص سے کہا۔''اگر اس خط کو موثر طریقے سے پھیلایا جائے تو پھر اس کے ذریعے بھرپور نتیجہ لینا چنداں مشکل نہیں۔!''

''آپ اس سے متفق ہیں؟۔''انہوں نے میری دلچسپی کو بھانپ کر کہا اور اس چائے کی طرف اشارہ کیا جو اس دوران خادم رکھ گیا تھا۔مگر خط کے انہماک کو توڑ کر چائے پینے کا کسی کا بھی دل نہیں چاہا تھا۔

''جی ہاں۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ندیم۔!''انہوں نے اپنے خادم خاص کو بلایا۔وہ لمحوں میں حاضر ہو گیا۔''ذرا طاہر حسین کو بلائیے۔!''

''جی اچھا۔!''ندیم نے کہا اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔چند منٹوں کے بعد ایک چالیس پچتالیس سال کے پیٹے کے درمیان کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔اس نے سب سے پہلے لپک کر قادری سرکار کے ہاتھوں کو تھاما، بوسہ دیا، جھک کر گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور مودب کھڑے ہو کر بولا۔''سرکار حکم دیجئے۔!''

''طاہر میاں اس خط کو دس ہزار چھاپ دیجئے۔سائز اے فور کا ہی رکھئے گا۔''انہوں نے میرے ہاتھ میں تحریر شدہ خط کی جانب اشارہ کیا۔میں نے وہ خط اس کے سپرد کر دیا۔

''سرکار کب حاضر کروں۔!''اس نے نہایت احترام سے دریافت کیا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو سکے''قادری سرکار نے فرمایا۔

''صبح 9 بجے یہاں پہنچ جائے گا۔''اس نے بلا تامل حامی بھر کے وقت کا تعین بھی کر دیا۔''کیا فائنل پروف کے لئے میں خود حاضر ہو جاؤں۔!''

''نہیں تنزیل میاں آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔''انہوں نے بتایا۔''یہ فائنل کر لیں گے۔کیوں تنزیل میاں؟''

''جی۔۔۔جی ہاں۔۔''میں نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر چلئے۔''پریس والے طاہر حسین نے کہا۔''وقت کم ہے''۔قادری سرکار نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔طاہر حسین مجھے لیکر باہر نکل آیا۔باہر نکل کے وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے بولا۔''تنزیل میرے پیچھے چلے آیئے۔!''

میں نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔آدھے گھنٹے کے بعد ہم پریس پہنچ گئے۔طاہر حسین نے مجھے اپنے دفتر میں بٹھایا اور کمپوزنگ والے لڑکے کو بلا کر ہدایت دینے لگا۔آدھے گھنٹے میں کمپیوٹر آپریٹر نے خط کمپوز کر کے دیدیا۔میں نے غلطیاں درست کروائیں۔وہ فائنل پروف لے آیا۔میں نے پڑھ کر اسے دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد پلیٹ بن کر پرنٹنگ پریس میں چلی گئی۔تقریباً ساڑھے بارہ بجے دس ہزار لیٹر تیار ہو چکے تھے۔پیکنگ مکمل ہوتے ہی طاہر حسین نے گاڑی منگوائی اور مجھ سے بولا۔''لیجئے جناب تنزیل صاحب دس ہزار لیٹر تیار ہیں۔آپ چاہیں تو یہ لیٹر خانقاہ پہنچ جائیں گے۔یا پھر آپ کے سپرد۔!''

''خانقاہ ہی بھیج دیں۔!''میں نے کہا۔''خدا کا شکر ہے کہ لائٹ نہیں گئی۔ورنہ نا جانے کتنا ٹائم لگ جاتا۔!

''لائٹ نہیں جاتی۔!'' طاہر نے مسکرا کے کہا۔''جب بھی سرکار کا کوئی کام ہو رہا ہو لائٹ نہیں جاتی۔ یہ بات برسوں کی آزمائی ہوئی ہے۔آپ دیکھئے گا۔'' طاہر حسین کے ان جملوں کے درمیان ہی لائٹ چلی گئی۔

''کیا ہوا مال رکھ دیا۔!'' طاہر حسین نے پکار کر پوچھا۔

''جی ہاں جی۔!'' قریب ہی سے ایک لڑکے نے کہا۔''آخری پیکٹ گاڑی پر رکھا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔!''

''دیکھا آپ نے۔'' طاہر حسین نے ایمرجنسی لائٹ میں مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔''سرکار کے کام سے پہلے کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔''

میں بے حد حیران تھا۔ یہ کیا ہے۔کرامت یا حسن اتفاق۔میرا ذہن تشکیک کے دائروں میں الجھنے لگا۔

''آیئے جی۔!'' گاڑی والے نے کہا۔''ہمیں سیدھا خانقاہ کا راستہ لینا ہے۔!''

سب ہی سیدھے راستے پر تھے۔شائد میرے سوا۔! میرے دل میں ایک کسک سی اٹھی۔میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی اور آگے بڑھ گیا۔گاڑی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔خانقاہ پہنچے تو رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔سب سو رہے تھے سوائے خادم ندیم کے۔ اسی نے دروازہ کھولا اور پیکٹ اندر رکھوائے اور مجھ سے بولا۔''قادری سرکار نے فرمایا ہے کہ آپ صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔حضور کو خاص کام ہے۔!''

''اچھا۔۔!'' میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

''کھانا کھا لیجئے۔!'' ندیم نے کہا''تیار ہے۔!''

''بھوک نہیں ہے۔!'' میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔مجھے سچ مچ بھوک نہیں تھی۔اور ویسے بھی زیادہ رات تک گھر سے باہر رہنے کا عادی نہیں تھا۔طبیعت میں ایک عجیب سی اداسی، کسلمندی، بے چینی تھی۔ہر چیز سے، اپنے اندر باہر سے خالی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔اپنا وجود ایک ایسی خالی بوتل کی طرح لگ رہا تھا جو اپنا آپ خالی کر کے بے مصرف ہو گئی ہو۔

میں گھر پہنچا تو مومی جاگ رہی تھی۔''تم سوئی نہیں۔؟''

''بس نیند نہیں آ رہی تھی۔!'' وہ بولی۔''پھر آپ بھی تو نہیں آئے تھے۔کم از کم اپنا موبائل ہی پاس رکھا کریں۔'' اس کے انداز میں خفگی تھی۔

''اچھا بابا معاف کر دو۔!'' میں نے اس کے گالوں پر چپت لگائی۔میری اکثر عادت تھی کہ موبائل گھر ہی بھول جاتا تھا۔جدید زمانے کا یہ گشتی ہاتف آدمی کی تنہائی کا دشمن تھا۔کہیں بھی، کسی بھی جگہ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔

''چلیں کھانا کھا لیں۔ہم نے آپ کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔!''

''اور اماں نے؟۔!'' مجھے سب سے زیادہ اماں کی فکر رہتی تھی۔

''اماں کا آج تھوڑا سا بلڈ پریشر زیادہ تھا۔میں نے انہیں زبردستی کھانا کھلا کر دوا دی تھی۔ابھی وہ سو رہی ہیں۔!'' مومی نے بتایا۔

ہم دونوں چلتے ہوئے کچن میں آ گئے تھے۔ مومی کھڑ پٹر کرتے ہوئے بتا رہی تھی۔

ہماری آواز سن کر اندر والے کمرے سے نرگس بھی باہر نکل آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رک گئی، شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اندر آئے یا لوٹ جائے۔ اسی وقت سالن گرم کرتے ہوئے مومی کی نظر اس پر پڑی۔ ''ارے نرگس آپ آ جائیں باہر کیوں کھڑی ہیں۔!''

نرگس کچن میں چلی آئی۔ ہمارا کچن خاصا بڑا تھا۔ بعض اوقات ہم کچن میں ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ مومی نے فرج میں سے آٹا نکالا اور توے کو چولہے پر رکھا۔

''میں روٹی بنا لیتی ہوں۔!'' نرگس نے کہا۔ پھر اس نے بیسن پر ہاتھ دھوئے اور آٹے کا باؤل تھام لیا۔

''ارے نہیں۔!'' مومی نے کہا۔ ''آپ بیٹھیں، باتیں کریں، پانچ منٹ میں گرم گرم روٹیاں تیار ہو جائیں گی۔!''

''تو پھر مجھے بنانے دیں۔'' نرگس نے کہا۔ ''آپ سالن نکالیں۔''

میں کچن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرگس روٹی بنانے لگی۔ روٹیاں بیلتی ہوئی، ہاتھوں سے شیپ دیتی ہوئی، تھپتھپاتے ہوئے اس کی چوڑیاں بج رہی تھیں۔ ایک کھنکتی موسیقی فضا میں گونجنے لگی۔

''آپ لوگ گاؤں میں روٹی کیسے پکاتے ہیں۔!'' مومی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''تھوڑے لوگ ہوں تو چولہے پر بنا لیتے ہیں۔ زیادہ ہو جائیں تو پھر تنور گرم کر لیتے ہیں۔ شہر میں تو بس بٹن گھماؤ ماچس لگاؤ بھک بھک آگ جلنے لگتی ہے۔!''

آپ کتنے بہن بھائی ہیں۔؟!'' مومی نے پوچھا۔

''دو بھائی تھے اور میں ایک بہن۔ ماں کو ہیضہ ہو گیا تھا۔ پانچ سال پہلے۔ گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری بند تھی اس میں ڈاکٹر کے بجائے نمبردار کی بھینسیں بندھتی تھیں۔ شہر جاتے جاتے ماں کی جان نکل گئی۔ ایک بھائی کو کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے سانپ نے ڈس لیا اور دوسرے بھائی کو کتے کھا گئے۔!''

''کیا۔!'' سالن کا چمچ مومی کے ہاتھوں سے گر گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟!''

''آپ نہیں جانتیں۔!'' نرگس ہنسی۔ ''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بیتے ہوئے پر، آپ اپنی بیتی پر یقین نہیں آتا۔ یہ مٹی کے پتلے جی بڑی لچک والے ہوتے ہیں۔ آنسوؤں سے گیلی مٹی جھڑتی نہیں۔ آٹے کی طرح چپکی رہتی ہے۔ جی سوہنے رب نے بڑا کرم کیا جی۔ ہمیں مٹی سے بنایا، ایسی مٹی جو اگر کھر بھی جائے تو پانی میں مل کر اپنا آپ دوسروں کے سپرد کر دیتی ہے۔!'' اس کے انداز میں شکوہ، شکایت، گلہ کچھ نہیں تھا اور سب کچھ تھا۔

''آپ بھائی کے متعلق بتا رہی تھیں۔!'' مومی کو اس کے بھائی کے متعلق فکر ہو رہی تھی۔

''جی وہ چھوٹے شاہ جی کو کتوں کے ذریعے شکار کا بہت شوق ہے۔ان کے پاس درجنوں بڑے بڑے شکاری کتے ہیں۔جو شکار کی بو پاتے ہی میلوں دوڑ کر بھی شکار کو پکڑ لیتے ہیں۔چھوٹے شاہ جی نے دو تین بکریاں بھائی کو دیں کہ انہیں دوڑائے، پھر اس کے پیچھے کتے چھوڑ دیئے، کتوں نے جی بکریوں کو پکڑا ایک کتے نے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کی ٹانگوں کو بھنبھوڑ ڈالا۔انسان اگر گر جائے تو بہت آسان شکار ہوتا ہے۔خون کی بو پر دوسرے کتے بھی آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے درجن بھر کتوں نے میرا بارہ برس کا بھائی تکا بوٹی کر ڈالا۔صرف سر اور کچھ ہڈیاں ہی بچی تھیں۔۔۔!''

مومی رونے لگی۔میرا حلق عجیب طرح سے نمکین سا، کڑوا سا ہو گیا۔

''پولیس نے کوئی کاروائی کی۔؟''

''پولیس والوں نے رپورٹ دی کہ یہ ایک حادثہ تھا۔شکار والی جگہ تو سب کو پتا ہے وہاں پر بکریاں لیکر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔اس لئے غلطی سلطانے کی تھی۔'' وہ چپ ہو گئی۔

''نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا۔یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا۔کیا انسان اتنا ہی بے وقعت، اتنا فالتو، اتنا نامعتبر ہے کہ کوئی پرسان حال نہیں۔کوئی ضابطہ، کوئی سماجی دباؤ، کوئی ریاست کی ذمہ داری نہیں۔؟ بے شمار سوالوں نے بگولوں کا رخ اختیار کر لیا۔

''چھوڑیں جی۔!'' نرگس نے کہا۔'' بے وجہ ہی میں نے اپنی کہانی سنا کر آپ لوگوں کو اداس کر دیا۔کھانا کھائیں۔!''

اس ساری گفتگو کے بعد کس کم بخت کا دل کھانے کو چاہ رہا تھا۔تھوڑی دیر قبل گندم کی اٹھتی ہوئی مہک سے جو بھوک پیدا ہوئی تھی۔اب جیسے وہ ہُوک میں بدل گئی تھی۔

''دکھ ہوں یا غم، بیماری ہو یا صحت، بھوک سے تو بھاگ نہیں سکتے نا۔!'' نرگس نے کہا۔

کس قدر سادہ فلسفہ ہے۔ان لوگوں کا۔میں نے سوچا، اور پھر سر ہلایا۔دونوں نے چند ہی منٹوں میں کھانا لگا دیا۔ہم تینوں چھوٹی میز کے گرد بیٹھ گئے اور لقمے زہر مار کرنے لگے۔کھانے کے دوران ہی مومی نے اٹھ کر چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔کھانا ختم ہونے تک چائے تیار ہو گئی۔ہم لوگ چائے پینے لگے۔

میں نے پہلی بار نرگس کو غور سے دیکھا۔دبلی پتلی نازک سی یہ لڑکی اپنے اندر کتنے دکھ چھپائے ہوئی تھی۔اس کا گلابی چہرہ، ناک میں پڑی چاندی کی لونگ، سرخ موتی کے ساتھ سر کے ہلنے کے مختلف زاویوں کے ساتھ بعض اوقات عجیب سی جھلملاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

نرگس کے انداز میں عجیب سی سادگی تھی۔جس سے ہم شہر والے نابلد تھے۔ہمیں تو اپنے دکھوں کے اظہار کے لئے بھی بڑے پیرایئے چاہئے ہوتے ہیں۔لفظوں کی ترتیب و بُنت میں، مخاطب کے رویئے کی جانچ پڑتال میں، سچ و جھوٹ بے اعتباری اور اعتبار کے درمیان لٹکتے ہوئے سچائی گم ہو جاتی ہے۔احساسات جذبات کے نازک تاروں کے بیچ ہی رہ جاتے ہیں اور ہم بظاہر ضبط کی تصویر بنے

ہوئے ہوتے ہیں اور پھر یہی کمال ضبط ہمیں اکیلا کر جاتا ہے۔

''آپ بہت دکھ اٹھائے ہوئے ہیں۔!'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''پتا نہیں جی۔! اپنے آپ پر بیتا ہوا دکھ ہوتا ہے یا پھر تقدیر۔ ہم تو ہر دکھ کو تقدیر کا حصہ سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں کہ مالک کا شکر ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوا۔ ورنہ بہت کچھ اس سے زیادہ برا بھی ہو سکتا تھا۔!''

میں حیرت سے اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ کیا عجیب شے ہے یہ۔ میں تو اپنے دکھ کو بڑا سمجھتا تھا۔ مگر اس کا دکھ تو مجھ سے بھی سوا ہے۔ بقول میر سرسری تم جہاں سے گزرے۔۔۔ وگرنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا۔ واقعی ہر جگہ اپنی ہی نئی دنیا ہوتی ہے۔ اچانک مجھے قادری سرکار کا ایک قول یاد آیا۔ ''عالم روحانیت کی طرف دیکھئے تو اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ اور ہر عالم کی وسعت عقل وفہم سے ماوراء ہے۔ ہر انسان خود اپنی جگہ ایک عالم ہے۔ دو ٹانگوں، دو ہاتھوں سمیت چند اعضاء کا مجموعہ۔ لیکن اس کے ذہن کی دنیا جب وسعت اختیار کرے تو پھر قدوسی و جبروت کے معاملات اس کے لئے مشل سبق از بر ہو جاتے ہیں۔''

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے بدل کر لیٹا تو چند ہی منٹوں میں بے خبر ہو گیا۔

صبح میری آنکھ فون کی بیل سے کھلی۔ میں نے ٹٹول کر فون اٹھایا تو اسکرین پر ایک اجنبی نمبر تھا۔ ''ہیلو۔۔ کون'' میں نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

''السلام وعلیکم جی۔ تنزیل میاں بات کر رہے ہیں۔؟'' دوسری طرف بہت مودب آواز آئی۔

''جی وعلیکم اسلام۔!'' مجھے سلام میں پہل نہ کرنے پر خجالت محسوس ہوئی۔

''جی میں ندیم عرض کر رہا ہوں۔ قبلہ قادری سرکار کا خادم خاص۔!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی فرمایئے۔!'' میں قادری سرکار کا نام سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نیند ہوا ہو گئی۔

''سرکار نے فرمایا ہے کہ آپ نو بجے تک خانقاہ پہنچ جائیں۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ آپ ذرا تیار ہو کر آیئے گا۔ ہو سکے تو کپڑوں کے چند جوڑے وغیرہ بھی۔'' ندیم نے کہا اور سلام کہہ کر فون بند کر دیا۔۔

میں حیران ہو گیا۔ قادری سرکار مجھے کہاں جانے کا حکم دینے والے ہیں۔؟ اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں قیام کرنا پڑ جائے۔ میں نے ذہن کو جھٹک دیا۔ اور غسل کرنے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو سات بج رہے تھے۔ باہر آیا تو دھوپ صحن میں اتر آئی تھی۔ اماں حسب معمول برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ اماں کو دیکھ کر میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ میں ان کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت مومی اپنے کمرے سے باہر نکلی۔

''اسلام علیکم بھائی۔!'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''چائے لے آؤں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چند ہی لمحوں میں چائے، پاپے اور ابلے ہوئے انڈے لے آئی۔ ہم تینوں چائے پینے لگے۔

''نرگس کیسی ہے۔؟'' اماں نے پوچھا۔

''اب بخار اترا ہے تو سو رہی ہیں۔؟'' مومی نے کہا۔ ''بہت تیز بخار تھا۔!''

''رات تو اچھی بھلی تھی۔'' میں نے چائے کا کپ رکھ دیا۔ ''اگر ہاسپٹل لے جانا تھا تو مجھے کیوں نہیں اٹھا دیا۔!''

''میں نے کہا تھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ بخار ہی تو ہے اتر جائے گا۔ وقفے وقفے سے پینا ڈول دی تھی۔!'' مومی نے بتایا۔

''بہت صابر بچی ہے۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔ ''بعض اوقات جب ٹھہراؤ ملتا ہے تو پھر سارے زخم، ساری الجھنیں عود کر آتی ہیں۔!''

اماں کی بات سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں مجرم ہوں۔ نا میں اس سے ذاتی سوالات کرتا۔ نہ زخم ہرے ہوتے۔ لیکن بعض زخم تو رہتے ہی کچے ہیں۔ ہرے ہرے تازہ بہ تازہ، برسوں کے باوجود یوں لگتا ہے کہ ظلم و جبر زیادتی کا ظالم پنجہ ابھی ابھی زندہ گوشت نوچ کر لے گیا ہے۔ خون ٹپکتا، سوجن سے بھرا پنڈا، اور پیپ کا بھاری پن لٹکا رہتا ہے۔ تپش، جلن، ٹیس، درد کا سونامی سارے بدن کو لرزا تا رہتا ہے۔

''اگر دکھوں کو جھنجھوڑا جائے، بار بار ذکر نہ کیا جائے تو پھر گھٹن کی صورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ پانی کو نکاس نہ ملے تو وہ کناروں سے اچھل کر اپنے ہی آبادکاروں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ دکھوں کو زبان نہ ملے تو ہستی کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔!'' اماں نے دھیرج کہا۔

اماں کی گفتگو سن کر ہمیشہ ہی مجھے ایسا لگتا تھا کہ اماں کے اندر کوئی بہت بڑا ادیب، بہت بڑا تخلیق کار چھپا بیٹھا ہے۔ بعض اوقات تو ہم اماں سے کہتے تھے کہ اماں آپ کیوں نہیں لکھتی ہیں۔ تب وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتیں کہ لکھنا بھی تخلیق ہے اور اولاد پیدا کرنا ان کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت، پرورش یہ سب بھی تخلیقی عمل ہیں۔ اگر ان سے تخلیق کی طرح پیار نہ کیا جائے تو پھر نسل بگڑ جاتی ہے۔ اماں بہت پڑھنے لکھنے والی خاتون تھیں۔

''کیا تمہیں کہیں جانا ہے۔؟''۔ اماں نے پوچھا۔ ''بہت جلد اٹھ گئے ہو۔''

''اماں۔ وہ قادری سرکار کی طرف سے فون آیا تھا کہ وہ مجھے کہیں بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ غالباً کچھ دنوں کے لئے۔!''

''اچھا۔!'' اماں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ ''چلے جاؤ۔ کچھ دنیا دیکھو، سیکھو، سمجھو۔!'' انہوں نے ہولے سے میرے گالوں کو تھپکی دی اور مومی سے بولیں۔ ''جاؤ دیکھو بھائی کے کون سے کپڑے رکھنے ہیں۔!''

''جی اماں۔!'' مومی نے اپنی چائے ختم کی۔ برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور مجھ سے بولی۔ ''بھائی میں ٹرے کچن میں رکھ کر آرہی ہوں۔ آپ بتائیے کہ کون کون سے کپڑے رکھنے ہیں۔!''

وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں آکر الماری میں سے کپڑے نکالنے لگا۔ میرے پیچھے پیچھے ہی مومی آ گئی۔ اس نے ایک سفری بیگ میں کپڑے ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ اور دو چار استعمال کی اشیاء رکھیں اور بیگ تیار کر دیا۔ ابھی میں بیگ لے کر کمرے سے نکلا ہی تھا کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔ میں نے بیگ اماں کے تخت پر رکھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ندیم کھڑا تھا۔ قادری سرکار کا

خادم خاص۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ''تنزیل جی آپ کے لئے سرکار نے گاڑی بھیجی ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو اس میں تشریف لے چلیں۔!''

میں نے گردن ہلائی اور اماں سے اجازت لیکر مومی کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس آنے جانے کے چکر میں مجھے خیال ہی نہ رہا کہ ندیم کو میرے گھر کا پتا کیسے چلا۔؟

جب ہم خانقاہ قادری سرکار کے پاس پہنچے تو پو نے نو بج رہے تھے۔ رسمی سلام و دعا کے بعد انہوں نے بلا تمہید کہنا شروع کیا۔ ''تنزیل میاں۔ جہاں ہم آپ کو بھیج رہے ہیں۔ وہاں ہمارے ایک مرید کا بیٹا خادم حسین آپ کا منتظر ہے۔ وہاں ضمنی الیکشن ہو رہے ہیں۔ گاؤں اور آس پاس کے لوگوں نے خادم حسین کو اس کی شرافت اور دیانت داری کے باعث منتخب کیا ہے۔ آپ کو جا کر اس کی انتخابی مہم کی نگرانی کرنا ہوگی اور اس کے معاملات کو بھی دیکھنا ہوگا۔''

انہوں نے مجھے سفر کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔

میں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں تمام معاملات حلقے والے ہی دیکھیں گے۔ آپ صرف انتظامی امور دیکھیں گے، اور پھر جب تک عملی زندگی میں قدم نہیں رکھیں گے۔ دنیا کے اسرار و رموز کس طرح جان پائیں گے۔؟ اللہ کا نام لیکر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نیک معاملات میں فرد کی نیت پر اسباب مہیا فرمانے پر قادر ہے۔!'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ان کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ اعتماد جو اپنا سب کچھ ذات باری کو سونپنے، اس کی رضا میں ڈھل جانے پر عطا ہوتا ہے۔

''جی بہتر ہے۔!'' میں نے کہا۔

''اس علاقے میں دس بڑی مساجد ہیں۔ جن میں کافی لوگ نماز کے لئے پانچوں وقت حاضر ہوتے ہیں۔ خادم حسین کے والد غلام حسین سے کہیے گا کہ ان کے امام صاحبان سے آپ کو ملا دے۔!'' قادری سرکار مسکرائے۔ اور مجھے غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دانائی کا نور تھا۔

تب اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اور جیسے الہام کی طرح قادری سرکار کا سادہ سا، مگر ذہانت سے بھرپور منصوبہ میرے قرطاس ذہن پر روشن ہو گیا۔ مجھے رشک آ گیا ان پر۔ کتنی سادگی و پُرکاری سے انہوں نے ان لوگوں کو شکست سے دوچار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جو بلاشبہ بے حد طاقت ور، وسیلہ مند صاحب اقبال ہوں گے۔ مگر انہیں جس زاویئے سے شکست ہوگی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔

''تم اپنی چالیں چلتے ہو اللہ اپنی تدبیر فرماتا ہے۔!'' قادری سرکار نے قرآن مجید کی ایک آیت مبارکہ کو پڑھا۔ واقعتاً اللہ غالب، حکمت والا کارساز ہے۔

''جایئے میاں اللہ بیلی۔!'' انہوں نے کہا۔ ''وہاں آپ تنہا نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور حفاظت آپ کے اوپر سایہ فگن

رہے گی۔انشاءاللہ۔"

میں نے نہایت ادب سے انہیں رخصتی کا سلام کیا۔ہاتھ کو بوسہ دیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔اسی اثنا میں ایک مرید میرا بیگ تھامے اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔اس کا نام عبدالشکور تھا۔ڈرائیور نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور رش والے علاقے سے نکل کر اس کا رخ بیرون شہر جانے والی شاہراہ پر ہو گیا۔ایک نئی دنیا کی طرف جو میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔

☆.....☆.....☆

عبداللہ شاہ گیلانی کے پہلے عوامی جلسے کے لئے بھرپور تیاریاں تھیں۔پورے علاقے میں قد آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔جس میں عبداللہ شاہ گیلانی،شاہ ہارون گیلانی کے ہمراہ نظر آ رہا تھا۔شاہ ہارون گیلانی کی پس منظر کی تصویر لوگوں کو یاد دلا رہی تھی کہ عبداللہ شاہ گیلانی کس خاندان کا فرزند ہے اور اس کی سرپرستی کون کر رہا ہے۔سیاست میں بیک گراؤنڈ اور گاڈ فادر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا امیدوار کتنا طاقت ور،مخالف کو کس طرح زچ کرنے والا،اور پھر مدِ مقابل کو کیسے نکیل ڈالے گا۔اس سارے عمل کا سب سے دلچسپ،عبرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ان خصوصیات کے حامل امیدوار کو جب ووٹ کی طاقت میسر آ جاتی ہے۔تو وہ پھر ساری صلاحیتیں اپنے ہی ووٹر کو دبانے،ستانے،نچوڑنے اور تھپکیاں دینے میں صرف کر دیتا ہے۔یہ اس خطے کی سیاست کا وہ پہلو تھا۔جس کو سب جانتے ہوئے بھی نظر انداز کرتے تھے۔اس تکلیف دہ تصور کے ساتھ۔کیا کریں ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔تن آسانی،مصلحت پسندی،بزدلی اور ذات برادری کے طلسم کے اسیر،مجبوری اور بے کسی کے نام پر بڑی خوشی سے اپنا استحصال کرواتے تھے۔اور گڑھے میں پڑے لال بیگوں کی طرح اپنے سے اوپر نکلنے والوں کی ٹانگیں کھینچ کھینچ کر گڑھے کی محدود،پُرتعفن فضا میں خوشی خوشی سانس لے رہے تھے،اور نسل بڑھا رہے تھے۔

ہر جگہ بینرز اور فلیکس کی بہار آئی ہوئی تھی۔عبداللہ شاہ گیلانی نجات دھندہ بن کر سامنے آ رہا تھا۔نئی قیادت نیا جذبہ،نیا ولولہ۔نئی بوتل میں پرانی شراب پبلسٹی کے اوپر بیچی جا رہی تھی۔مگر لوگ یہ بھول رہے تھے کہ شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے۔اسی قدر نشہ آور،اور بے سود کرنے والی بھی ہوتی ہے۔

اصل پنڈال اتنا بڑا تھا کہ جس میں تقریباً پانچ ہزار آدمی سما سکیں۔اسٹیج بہت لمبا چوڑا تھا۔اسٹیج پر تقریباً پندرہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔جن کے آگے میزیں لگی تھیں۔جن پر پھولوں کے گلدستے رکھے ہوئے تھے۔معروف کمپنی کی منرل واٹر کی بوتلیں رکھی تھیں۔ٹشو پیپرز کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔کرسیوں سے آٹھ فٹ دور انتہائی خوبصورت ڈائس رکھا ہوا تھا۔جس پر مائیک لگا ہوا تھا۔یہ سارا سسٹم،جلسے کا،کھانے کا انتظام شہر کی ایک معروف فرم نے کیا تھا۔اسٹیج کے عقب میں کھانے کا انتظام تھا۔جہاں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔جلسہ گاہ تقریباً بھر گئی تھی۔مگر اسٹیج خالی تھا۔جلسہ گاہ میں اسٹیج اور لوگوں کے درمیان تقریباً 15 فٹ کی جگہ خالی تھی۔جہاں صرف سرخ رنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے۔اس کے بعد لوگ قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے۔تھوڑی ہی دیر میں ایک شخص نے آ کر مائیک سنبھال کر روایتی انداز میں گفتگو کا آغاز کر دیا۔لوگ بڑے اشتیاق سے مقررین خصوصاً عبداللہ شاہ گیلانی کا انتظار کر رہے تھے۔اچانک

گاڑیوں کا شور اٹھا اور سیاہ سرف گاڑیوں کے قافلے میں نمودار ہوئی۔ اس کی کھلی چھت میں عبداللہ شاہ گیلانی ہاتھ ہلاتے ہوئے لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ کئی لوگ گاڑیوں کے اس قافلے کے ساتھ ساتھ پیدل بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ آوے گا بھئی آوے گا۔ سوتی قوم جگاوے گا۔ عبداللہ شاہ آوے گا۔ مخالفوں کو ٹھاہ۔۔۔ عبداللہ شاہ۔ عبداللہ شاہ۔۔ دکھی دلوں کا سہارا۔ عبداللہ شاہ ہمارا۔

عبداللہ شاہ کے چہرے پر بے حد روشنی تھی۔ اس کے اردگرد سینکڑوں، ہزاروں لوگ تھے۔ نعروں، محبتوں، والہانہ جذبات کے یہ منظر اس کو بے حد متاثر کر رہے تھے۔ وہ بہت بچپن میں امریکہ چلا گیا تھا۔ اس دوران اگر آیا بھی تو الیکشن کے حالات نہیں تھے۔ اور اب جب آیا تو بحیثیت امیدوار الیکشن میں حصہ لے رہا تھا۔

اس کو نہیں معلوم تھا کہ اس ساری محبت، والہانہ انداز، لوگوں کے جوش و ولولے کے پیچھے عبداللہ شاہ کی محبت نہیں، شاہ ہارون گیلانی کی دولت، اثر و رسوخ اور حکمت عملی کام کر رہی ہے۔

پنڈال کے مرکزی دروازے پر جا کر گاڑیاں رک گئیں۔ پنڈال کے مرکزی دروازے سے اسٹیج تک سرخ قالین سے راستہ بنایا گیا تھا۔ جس کے دونوں اطراف لوگ کھڑے تھے۔ جونہی عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنی سیاہ سرف سے قدم نیچے رکھے۔ خیر مقدمی نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ سینکڑوں لوگوں کے جلو میں عبداللہ شاہ نے اسٹیج کا رخ کیا۔ لوگ نعرے لگاتے۔ پھول لٹاتے رہے۔ اسٹیج کے قریب جیسے ہی عبداللہ شاہ پہنچا۔ اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ اسٹیج کے عین سامنے وہیل چیئر پر بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر بڑی سعادت مندی سے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''پاپا آپ یہاں۔؟ مجھے بتانا تھا۔ ہم ساتھ آجاتے۔''

شاہ سکندر گیلانی نے بڑی محبت اور فخر سے بیٹے کو دیکھا اور بولے۔ ''ہمیں تو آپ کو یہاں سے دیکھنا تھا اور یہاں سے آپ کو وہاں تک۔۔۔ عروج پاتا ہوا دیکھنا ہے۔''

''پاپا آپ میرے ساتھ اوپر چلیں۔!'' اس نے بڑے ناز سے باپ سے اصرار کیا۔

''اقتدار کی ابتداء کیجئے عبداللہ شاہ۔!'' شاہ سکندر گیلانی نے مسکراتے ہوئے اسٹیج کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ عبداللہ شاہ نے باپ کے ہاتھوں کو تھام کر بوسہ دیا۔ پیروں کو ہاتھ لگایا اور آگے بڑھا۔ سینکڑوں افراد نے باپ بیٹے کی محبت اور احترام کا یہ نظارہ دیکھا اور تسلیم کیا کہ شاہ سکندر گیلانی کے خاندان میں اخلاقی روایات، بزرگوں کا احترام اور نوجوانوں کی سعادت مندی آج بھی باقی ہے۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے اسٹیج کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ بہت سارے لوگ بھی اسٹیج پر چڑھ گئے۔ درمیان کی سب سے اونچی کرسی پر عبداللہ شاہ بیٹھا۔ اس کے بعد اردگرد کے لوگ ان کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ شام پڑنے لگی تھی۔ ٹھیک 6 بجے عبداللہ شاہ نے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ نرم و دھیما سا عبداللہ شاہ گیلانی۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تو بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی اور پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو حیرت آمیز جھٹکا لگا۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے جو بولنا شروع کیا تو سماں باندھ دیا۔ وہ امریکا کا تعلیم یافتہ، ڈیبیٹ سوسائٹی کا

صدر اپنے خطاب کے جوہر دکھا رہا تھا۔ مجمع خوشی اور مسرت سے تالیاں بجاتے ہوئے قدرے آگے کھسک آیا تھا۔ بڑے شاہ جی شاہ سکندر گیلانی کی وہیل چیئر رش کے وجہ سے آگے آ گئی تھی۔ انہیں احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کتنے آگے بڑھ آئے ہیں۔ پنڈال کے باہر کھڑی ہوئی بس کی چھت پہ کھڑے رحیم شاہ نے اپنی گھڑی کی جانب نگاہ کی۔ منٹ کی سوئی ساڑھے 6 کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔

تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنا خطاب ختم کیا۔ لوگوں نے بے قابو ہو کر نعرے بازی شروع کر دی۔ عبداللہ شاہ گیلانی مسکراتے ہوئے، تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر مجمعے کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے باپ شاہ سکندر گیلانی کو متلاشی نگاہوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ ہجوم میں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے پلٹا اور اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ کرسی پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک فلک شگاف دھماکا ہوا۔ عبداللہ شاہ کو یوں لگا کہ جیسے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ اس نے سامنے دیکھا ہجوم میں دھوئیں اور گرد کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس نے اوپر دیکھا۔ ہوا میں ایک وہیل چیئر قلابازی کھاتی ہوئی نیچے کی طرف گر رہی تھی۔ اور اس پر بیٹھے شاہ سکندر گیلانی غائب تھے۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

لفظ تاثر کو منتقل کرنے میں بے بس ہو جاتے ہیں

گرد، غبار۔ چیخ و پکار، ملگجا اندھیر، گوشت جلنے کی بدبو، آہیں، سسکیاں، کراہیں، خون، دہشت، مایوسی، نامرادی، حادثہ کتنی چیزوں سے عبارت ہے۔ عبداللہ شاہ گیلانی جس وجود سے جسما تھا۔ اسی وجود کا ایک ہاتھ فضا میں اڑتا ہوا اس کے سامنے آن گرا تھا۔ سفید خوبصورت ہاتھ، نرم و ملائم سفیدی مائل سیاہ بال جو سرمئی ہو رہے تھے۔ اس کی انگلیوں سے جڑے گلابی مائل سرخ ناخنوں والا یہ ہاتھ۔ وہ ہزاروں میں پہچان سکتا ہے۔ پھر اس ہاتھ کی انگلی میں پلاٹینم کی سفید انگوٹھی میں جڑا سرخ جگمگاتا یاقوت جو خون کی طرح سُرخ چمک دار تھا۔ کلائی میں تین باریک موتیوں والا سیاہ دھاگا۔ جو نجف اشرف سے بڑے شوق سے لائے تھے۔ ابھی تک کلائی میں پڑا ہوا تھا۔ کہنی سے جدا ہاتھ۔ عبداللہ شاہ گیلانی کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یوں جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اب تم مجھے تھام لو۔۔ بچپن میں تم ان ہی انگلیوں کو پکڑ کے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتے تھے۔ اب تم آؤ، اِس بڑھاپے کو تھام لو۔ اس کو اپنے جوان ہاتھوں سے، مضبوط بدن کی قوت سے سہارا دو۔''

عبداللہ شاہ گیلانی نے جیسے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

اچانک جیسے کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے دیکھا، فیقا اسے کھینچ رہا تھا۔ فیقے کے انداز میں عجیب سی وحشت تھی ''چلیں شاہ جی جلدی چلیں۔۔''

وہ ایک ٹرانس کے عالم میں اس کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ فیقا اسے ڈائس کے عقبی حصے کی طرف کھینچ لایا۔ جہاں کھانے کی میزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔ کئی دیگیں الٹ گئی تھیں۔ سالن، چاول، فیرنی سب اس میں ملے جلے ملغوبے کی صورت پڑے تھے۔

لوگ یوں بھاگ رہے تھے کہ جس کا جس طرف منہ اٹھا نکل بھاگا۔ افراتفری میں تمام انتظامات تباہ ہو گئے تھے۔ گوشت، چاول،، فیرنی کی خوشبو، خون، مٹی، گرد و غبار، بارود کے ساتھ مل کر عجیب وحشت انگیز بو پیدا کر رہی تھی۔

اچانک چاروں طرف سے سائرن بجنے لگے۔ پولیس کی گاڑیاں، ایمبولینس، مختلف چینلز کی گاڑیاں کوریج ٹیم کے ساتھ پہنچنے لگیں۔ فیقے نے عبداللہ شاہ گیلانی کو ایک کالی ٹیوٹا میں بٹھا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک زناٹے کی آواز کے ساتھ نکلتا چلا گیا۔ کئی لوگ بے ساختہ انہیں اس تیزی سے بھاگتا دیکھ کر۔ زخمیوں کو چھوڑ کر جاتے ہوئے، محسوس کر کے بے تحاشا چیخے اور گالیاں دینے لگے۔ ان میں سے کئی نے فیقے اور عبداللہ شاہ کو پہچان لیا تھا۔ خوف اور جان بچانے کا طاقت ور جذبہ، حفظ مراتب کو بری طرح کچل دیتا ہے۔

پتا نہیں کیسے خود کو عبداللہ شاہ گیلانی نے گھر میں پایا۔ نازاں اس کو دیکھتے ہی چیخی۔ ''عبداللہ۔۔۔!''

''کیا ہوا۔؟'' اس کی ماں اس تیزی سے اٹھی کہ اس کا دوپٹا سر سے پھسل گیا۔ سیدانی کو اپنے دوپٹے کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے

سامنے تو گرد و غبار میں اٹا ہوا بے رنگ، داغ دار کپڑوں کے ساتھ عبداللہ شاہ کوئی چیز اپنے سینے سے چمٹائے کھڑا ہوا تھا۔

''میرے بچے۔!'' اچانک کسی نے اس کو تھام لیا اور اس کو صوفے پر بٹھایا۔ وہ اس طرح سیدھا بیٹھا جیسے کوئی عمارت اپنی ہی بنیادوں پر زمیں بوس ہوتی ہے۔ بیٹھنے کے جھٹکے سے عبداللہ شاہ گیلانی کے سینے سے کوئی چیز چمٹائے ہاتھ کھل گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی سکندر گیلانی کا ہاتھ نیچے گرا، اور بل کھا کر شاہ ہارون گیلانی کے دونوں قدموں کے درمیان جا رکا۔

''ہائے میں مر گئی۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بیگم نے تڑپ کر کہا، اور سینے پر دوہتڑ مار کر غش کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ حادثہ کتنا ذی الحس ہوتا ہے۔ لمحے بھر میں خوف کی لہر بن کر دلوں میں سرایت کر جاتا ہے۔

''عبداللہ۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے عبداللہ شاہ کے گالوں کو تھپتھپایا۔ ''کچھ تو بولو۔۔!''

''پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔۔!'' نعمان شاہ چیختا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''بھائی کے جلسے میں دھماکا ہو گیا ہے۔ تایا جان بھی شہید ہو گئے۔!''

''کیا۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلی۔ انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اندر آتے ہی انہوں نے نہایت تیزی سے اپنے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیئے۔ ''تم کہاں ہو۔۔!'' اُنہوں نے سلسلہ ملتے ہی سوال کیا۔

''میں جی ائیر پورٹ جا رہا ہوں۔۔۔'' دوسری طرف سے رحیم شاہ کی پُرسکون اور مودب آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہے۔!'' انہوں نے مطمئن ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرے نمبر پش کیئے۔ دوسری طرف سے چند لمحے میں سلسلہ بحال ہو گیا۔ ''تمہیں! اچھی طرح معلوم ہے نا تمہیں کیا کرنا ہے۔؟'' انہوں نے خشک لہجے میں سوال کیا۔ وہی لہجہ، وہی طنطنہ جس سے روح کانپ جاتی تھی۔

''جی سرکار جی۔!'' دوسری طرف سے اعتماد سے بھرپور آواز آئی۔ ''آپ بالکل بے فکر رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہی آپ کو اطلاع مل جائے گی۔''

''شاباش۔!'' انہوں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔!'' انہوں نے کہا۔

دروازہ کھلا۔ ان کی بیگم اندر داخل ہوئیں۔ ''آپ یہاں ہیں باہر قیامت مچی ہے۔'' وہ بولیں۔ ''پریس والوں سے پورا ڈرائنگ روم بھرا ہوا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ عبداللہ شاہ کو میں نے بیڈ روم میں بھیج دیا ہے۔ اس کے حواس درست نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق اسے دیکھ رہے ہیں۔!''

''ہاں۔۔!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''میرا بھائی شہید ہو گیا۔ ان تخریب کاروں نے اس کی جان لے لی۔''

ان کی آواز بھاری اور لہجہ گلوگیر تھا۔

''پتا نہیں آپ اور آپ کی حکومت کیا کر رہی ہے۔؟'' ان کی بیگم نے ناگواری سے کہا۔ ''پہلے جو آگ دوسروں کے آنگن کو جلاتی تھی۔ اب وہ ہمارے گھروں کی دیواروں کو چاٹ رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود کو بچاتے بچاتے ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے اور کف افسوس ملنے کے لئے بھی کچھ نہ بچے۔!''

''جتنی ممکن ہو اتنی سیکیورٹی، احتیاط سب کو ہی مہیا کی جاتی ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اٹھارہ کروڑ کی حفاظت کے لئے، اٹھارہ کروڑ پولیس والے تعینات کر دیئے جائیں۔۔۔'' انہوں نے اکتاہٹ سے کہا۔

''رہنے دیجئے۔ اپنی تسلی، دلاسے۔'' وہ چیخ کر بولیں۔ ''اگر اٹھارہ کروڑ پولیس والے بھی ہوتے نا تو وہ بھی وی آئی پیز کی ڈیوٹیاں کر رہے ہوتے۔ ان کے بچوں کو اسکول، کالج سے لانے پر مامور ہوتے اور بے چارے عوام صرف ان کی تنخواہوں کے لئے ٹیکس دے رہے ہوتے۔ بے یار و مددگار، غیر محفوظ۔''

''پتا نہیں کس احمق نے تمہارے باپ کو تمہیں اتنا پڑھانے کا مشورہ دیا تھا۔ بی بی یہ لندن نہیں ہے۔'' دفعتاً ان کا لہجہ تبدیل ہونے لگا۔ ''یہاں وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔ یہ عوام کی محبت کا جو درد تمہیں اٹھتا ہے نا اس کو کنٹرول کرو۔ یہ آکسفورڈ کا ڈیبیٹ ہال نہیں۔ ہارون گیلانی کا گھر ہے اور تم اسکی بیوی۔۔!''

''شاہ جی خدا کے غضب سے ڈریں۔!''

''بس۔۔۔ بہت ہو گئی۔!'' انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کر کے بحث بند کر دی۔ ''آپ وہی کیجئے جو اس موقع کا تقاضا ہے۔ ان معاملات کو چھوڑ دیئے، بڑا وقت پڑا ہے۔!'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کی بیگم انہیں دیکھتی رہیں۔ وہ کیا کر سکتی تھیں۔ انہیں اس شعلہ و شبنم، بدلحاظ اور بامروت، دلکش اور ظالم شخص سے پیار بہت تھا۔ وہ پیار جو عشق کی سرحدوں کو چھوتا ہو۔ اُس میں ہر حال میں جھکنا ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ اسی وقت نازاں اندر داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ وہ ذرا بھی روتی تھی تو اس کی آنکھیں سوج جاتی تھیں اور آج تو اس کا غم بہت بڑا تھا۔ اس کا منگیتر ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا۔ اس کا تایا شہید ہو گیا تھا۔ وہ تایا جو روز اس کا منہ دیکھ کر صبح کرتا تھا۔

''امی یہ سب کیا ہو گیا ہے۔؟'' نازاں ماں سے لپٹ کر سسک پڑی۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولیں۔ بس اس کو خود سے لپٹائے ہوئے اس کی پشت کو تھپتھپاتی رہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنے تاثر کو منتقل کرنے میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس سمے صرف وجود کی حرارت اور لمس کا احساس ہی تسلی، سہارا، اپنائیت، دکھ میں راحت دیتا ہے۔ تنہائی میں دوئی پیدا کرتا ہے۔ اور یہی لمحہ ان پر وارد ہو رہا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی جب میڈیا والوں کے سامنے آئے، تو ان کے چہرے کے تاثرات اور بدن بولی میں ایک خاص قسم کا اعتماد تھا۔ انہیں دیکھتے ہی کیمروں کے شٹر آن ہو گئے۔ فلیش لائٹس کے جھماکے ہونے لگے۔ اچھا خاصا شور ہونے لگا۔ سب بیک وقت بولنے لگے۔

انہوں نے ہاتھ بلند کیا۔ فضا میں جیسے اچانک خاموشی چھا گئی۔

''میں زیادہ گفتگو نہیں کرونگا۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری اور پر اعتماد آواز گونجی۔ ''میں آج اور اس لمحے اپنے لوگوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنی قوم کو صرف ایک مختصر سا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ یہ بم دھماکے، خودکش حملے ان میں صرف آپ کی ہی نہیں، آپ کے پیاروں ہی کی نہیں، ہمارے بھی رشتوں کی جانیں جاتی ہیں۔ جس طرح ہمارے عوام دشمنوں کے نشانے پر ہیں۔ اسی طرح ہمارے لیڈر، رہنما، حکومتی ارکان بھی نشانے پر ہیں۔ تخریب کار، دہشت گرد سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ وہ ہمارا جمہوری عمل، ہمارے انتخابی معاملات کسی صورت سبوتاژ نہیں ہونگے۔ ہم جمہوریت کے لئے قربانیاں دے سکتے ہیں۔ سُو دے رہے ہیں، اور دیتے رہیں گے۔ یہ وقت متحد رہنے کا۔ باہمی اختلافات دور کرنے ایک ہونے کا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ بھائی جان سکندر شاہ گیلانی کی قربانی، ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔'' ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

اس وقت وہ ایک ایسے قومی رہنما معلوم ہو رہے تھے جو اپنی قوم کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے آمادہ ہو۔ سلسلہء جاں فروشی کے ہم ہیں نقیب۔ قافلۂ حسینؓ کبھی رُکا ہی نہیں۔ پورا ملک انہیں براہ راست دیکھ رہا تھا۔

انکے خیالات، ان کے تاثرات میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچ رہے تھے۔ اور عوام ان کے عزم اور حوصلے پر والہ وشیدا ہو رہے تھے۔

ہر چینل کے لئے تخریب کاری کا یہ واقعہ جس میں ایک اہم وفاقی وزیر کے سگے بھائی کی جان چلی گئی ہو۔ بے شمار زخمی اور کئی شہید ہوئے ہوں، اور تعلق ضمنی الیکشن سے جڑا ہو، بہترین بریکنگ نیوز، ہاٹ کیک تھا۔ جس کو عوام تک پہنچانا بے حد ضروری تھا۔ اور ابھی تو دیگر معاملات نے سامنے آنا تھا۔ سب سے طاقتور حریف کے انٹرویو، شہیدوں کے وارثین، زخمیوں کے لواحقین کام کرنے والے ایک ایک پہلو سامنے لانا تھا۔

اچانک اسی دوران اسکرین کے نچلے حصے پر بریکنگ نیوز کا فلیش ہوا۔ اور بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ ائیر پورٹ جانے والی ایک کار بریک فیل ہو جانے کی وجہ سے بے قابو ہو کر پل کے نیچے گر گئی اور اس میں موجود ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ہلاک ہونے والے کا نام رحیم شاہ بتایا جاتا ہے۔

شاہ ہارون گیلانی نے خبر پڑھی اور خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کے گوشوں پر نمودار ہوئی۔ یہ اپنا بالا بڑے کام کا آدمی ہے۔ انہوں نے سوچا اور فون کی جانب متوجہ ہو گئے۔ جو بہت سریلی سی دھن بجا رہا تھا۔

''ہیلو۔۔۔!'' انہوں نے کہا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

''شاہ جی۔!'' دوسری طرف سے احمد اورنگ زیب کی آواز آئی۔ جو ان کا میڈیا ایڈوائزر تھا۔ ''اظہر صدیقی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔!''

''میں فی الحال بات نہیں کرنا چاہتا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بیزاری کا اظہار کیا۔

''شاہ جی چند لمحوں کے لئے بات کر لیجئے۔ اظہر صدیقی کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کتنے بڑے کالم نگار ہیں اس اخبار کے۔!'' احمد اورنگ زیب نے انہیں آمادہ کرنا چاہا۔

''تمہاری رائے میں ملنا ضروری ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے سوال کیا۔

''شاہ جی۔!'' احمد اورنگ زیب نے کہا۔ ''حادثے رک تو نہیں سکتے۔ سب نے ہی چلے جانا ہے۔ مگر حادثے بعض اوقات رخ بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔!''

''تم بھی آ جاؤ۔!'' شاہ ہارون گیلانی کے ذہن رسا نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد احمد اورنگ زیب، اظہر صدیقی کے ساتھ شاہ ہارون گیلانی کے پاس پہنچ گیا۔ وسیع و عریض حویلی میں ان کے ملنے جلنے والے، تعزیت کو آنے والے، پُرسا دینے والے، کسان، ہاری سب جمع تھے۔ شاہ سکندر گیلانی کی باقیات آ چکی تھیں۔ انہیں ایک کمرے میں مرتب کیا جا رہا تھا۔ کئی ڈاکٹرز اور پیرا میڈیکل اسٹاف تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کے ایک اشارے پر پورا ہاسپٹل حویلی میں سمٹ آیا تھا۔

موت بھی ہنگامہ اور زندگی ہنگامہ در ہنگامہ۔ بعض چیزیں، جس قدر اپنی حقیقتوں میں سفاک ہوتی ہیں۔ مگر اُسی قدر ضروری بھی۔ دکھ، غم سہنے کی کیفیت ہر سطح، ہر طبقے میں اپنا علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ کہیں موت، ہنگامہ، کارزار حیاتی کو منجمد کر دیتی ہے، اور کہیں موت ہلچل، منصوبہ بندی، نئے معاملات کی نقیب ثابت ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا۔ جب لاد چلے گا بنجارہ۔۔ مگر یہ نہیں کہا بعد میں ٹھاٹھ کو سنبھالنے والے کیسی کیسی چالیں چلتے ہیں۔ ایسی چالیں جہاں مخالف ایسا چت گرتا ہے کہ نہ حواس سلامت رہتے ہیں اور نہ جان۔

اپنے وسیع و عریض کمرۂ خاص میں انہوں نے بلا تمہید اظہر صدیقی سے پوچھا۔ ''آپ فوراً کیوں ملنا چاہتے تھے۔؟''

''سر۔!'' اظہر صدیقی نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے کہنا شروع کیا۔ ''یہ سارا معاملہ ضمنی الیکشن سے جڑا ہے۔ اس موقع پر آپ کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے۔ اس حادثے کو آئندہ الیکشن کی بنیاد کے لئے بہت اچھی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں نے آپ کی گفتگو دیکھی تھی۔ جو دو گھنٹے قبل آپ نے میڈیا کے نمائندوں سے کی تھی۔ آپ آگے بڑھیں۔!''

''کہاں۔؟''

''وہاں جو ہر سیاستدان کا خواب ہے۔ جس کے لئے سارے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تجربے، دولت اور شخصیت کے اعتبار سے آپ موزوں تر بھی ہیں۔'' اظہر صدیقی نے گفتگو میں ایک وقفہ دیا۔ اور ان کو غور سے دیکھا۔

شاہ ہارون گیلانی کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ گھاگ سیاست دان تھے اور جانتے تھے کہ غیر ضروری اشتیاق ظاہر کرنا قیمت بڑھانے کا جواز بن جائے گا۔ مگر اظہر گیلانی کی تیز نگاہوں سے ان کی آنکھیں پڑھی گئیں۔ چغل خور آنکھیں۔

''وزارت عظمیٰ۔!'' اظہر گیلانی صاف صاف لہجے میں کہا۔

''عوامی ہمدردی کا ایک سیلاب آسکتا ہے۔ پارٹی میں آپ کی پوزیشن کو دیکھا جائے تو آپ ابھی کم از کم دس طاقتور افراد سے نیچے ہیں۔ وہ جو آپس میں رشتے دار ہیں۔ جبکہ تھوڑی سی پلاننگ سے آپ سپر سیڈ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو ہم آپکے ساتھ ہونگے۔۔!''

''کس طرح۔؟'' احمد اورنگ زیب اس لمحے جیسے شاہ ہارون گیلانی کا ترجمان ہو گیا۔ ان کی کیفیات، دلی جذبات اور اندر کے موسموں کا۔

''ہر چیز کی، ہر صلاحیت کی، ایک قیمت ہوتی ہے۔ صحیح افراد کو، صحیح وقت میں، صحیح قیمت ادا کر دی جائے تو پھر کامیابی کا نہ رکنے والا سفر شروع ہو جاتا ہے۔!'' اظہر صدیقی نے جواب دیا اور کہا۔ ''قیمت کے ساتھ ساتھ جب مفادات میں بھی یکسانیت آجائے یا یوں کہہ لیں کہ مشترکہ مفادات ہوں تو پھر ساتھ طوالت اختیار کر سکتا ہے۔ جب آپ وزیر اعظم کا منصب سنبھالیں تو پھر ہمارا خیال رکھئے گا۔ ورنہ ہم رائے عامہ آپ کے حق میں بنا سکتے ہیں۔ تو پھر بگاڑنے کا ہنر تو ہمیں لازماً آتا ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے اتنی دیر میں پہلی بار مداخلت کی۔ ''تم احمد اورنگ زیب سے معاملات طے کرلو۔۔!'' ''شاہ ہارون گیلانی اچانک آپ سے تم پر آگئے۔ جب قیمت دیکر خریدنے کا فیصلہ کر لیں تو پھر تکلفات غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ ''جتنا طے ہوگا اس کا آدھا پہلے اور آدھا حلف اٹھانے کے بعد۔!''

''ٹھیک ہے سر۔!'' اظہر صدیقی نے خوش دلی سے کہا۔ ''مجھے اجازت دیجئے۔ آپ اس موقع پر بے حد مصروف ہونگے۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے سر ہلایا، اور احمد اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ احمد اورنگ زیب فوراً ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اظہر صدیقی کو باہر تک رخصت کر آؤں۔!''

اظہر صدیقی اور احمد اورنگ زیب انہیں سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ باہر آ کے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اظہر صدیقی نے اپنی جیب سے ایک چیک نکالا اور احمد اورنگ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ تمہاری نذر۔۔۔!''

احمد اورنگ زیب نے چیک پر نظر ڈالی۔ ''ایک کے ساتھ سات صفر۔۔۔!''

''لیکن اپنی ڈیمانڈ تو بتاؤ۔!''

''معمولی سی صرف پچاس کروڑ۔۔۔!'' اظہر صدیقی نے کہا اور اس کو دیکھا۔ احمد اورنگ زیب نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔

''شاہ جی سے پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔!'' اظہر صدیقی نے سرسری لہجے میں کہا۔

''شاہ ہارون گیلانی کے لئے پیسہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔۔۔!'' احمد اورنگ نے کہا۔ ''پیسہ ان کے قدموں کی دھول بن کر ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے یہ تو معمولی سی رقم ہے۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔!'' اظہر صدیقی مسکرایا۔ ''سمندر سے چند بالٹیاں نکالنے سے پانی کم نہیں ہوتا ہے۔''

''لیکن۔۔۔!'' احمد اورنگ زیب نے کہا ''مجھے سرف چاہیے۔!''

''ٹھیک ہے مل جائے گی۔!'' اظہر گیلانی نے کہا۔ ''میں کب آؤں''۔

''پرسوں۔۔۔!'' احمد اورنگ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔!'' اظہر صدیقی نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ احمد اورنگ زیب دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

احمد اورنگ زیب حویلی کے اندر چل دیا۔ جب وہ شاہ ہارون گیلانی کے پاس پہنچا تو وہ کئی لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ سب ان کے عزیز و اقارب تھے۔ احمد اورنگ زیب خاموشی سے مودب کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر میں لوگ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ احمد اورنگ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔ ''شاہ جی پچاس کروڑ مانگ رہے ہیں۔ میں نے پرسوں بلایا ہے۔!''

''ٹھیک ہے۔!'' انہوں نے لاپرواہی سے کہا۔ ''دے دو۔۔!''

''اور یہ۔۔۔!'' احمد اورنگ زیب نے جیب سے چیک نکالا۔ اور ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ ''یہ انہوں نے مجھے دیا ہے۔ آپ کا صدقہ''۔

''اچھا۔'' شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ''صرف یہ۔۔!''

''سرف بھی دے گا۔۔۔!'' اس نے بتایا۔

''اچھی بات ہے۔!''

''حضور یہ سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہے۔ آپ سے جڑا ہوں تو لوگ آنکتے ہیں۔ ورنہ میں کیا، میری بساط کیا۔ آپ نے ہی انگلی تھام کے چلنا سکھایا۔ پڑھنا لکھنا۔ بات چیت کا سلیقہ۔ شاہ جی ہم تو آپ ہی سے بنے ہیں۔ پھر مالک سے کچھ چھپانا تو نمک کی توہین ہے۔'' احمد اورنگ زیب کی آواز بھرا گئی۔

شاہ ہارون گیلانی نے احمد اورنگ زیب کے جھکے ہوئے سر کو تھپتھپایا۔ ''تم ہمارے بچے ہو۔۔!''

''بس یہیں مروں۔!'' احمد اورنگ زیب نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے بہت عمدہ جدید سہولیات سے آراستہ ایک بورڈنگ اسکول کھول رکھا تھا۔ جس میں تقریباً دو ہزار بچے پڑھتے تھے۔ پانچویں سے انٹر تک کے اس اسکول میں غریب اور نادار بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ رہائش، خوراک، کتابیں ہر چیز شاہ ہارون گیلانی کا ٹرسٹ فراہم کرتا تھا۔ ان بچوں کی بچپن سے ہی برین واشنگ کر کے انہیں صرف اور صرف شاہ ہارون گیلانی لکھایا، پڑھایا، سکھایا جاتا تھا۔ سینکڑوں بچے اس اسکول سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور زندگی کے مختلف معاملات میں مصروف تھے۔ لیکن وہ جہاں بھی تھے۔ جیسے بھی تھے۔ شاہ ہارون گیلانی ان کے گاڈ فادر تھے۔ ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے، رواں، رواں قرض دار۔ اس

اسکول کے ہی ذہین ترین بچے ان کے ذاتی معاملات میں آہستہ آہستہ شامل کئے جاتے۔احمد اورنگ زیب، منیجر طارق۔بالا وغیرہ جیسے بے شمار لیکن بظاہر چند، ان کی طاقت تھے۔خاموش، پوشیدہ، طاقت ور، سریع الااثر۔

☆.....☆.....☆

''یہ کیا کیا تم نے۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ملک ریاض کو گھورا۔''اب وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔!''

''قسم لے لیں، حلف اٹھوالیں جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ دھماکا میں نے نہیں کروایا۔'' ملک ریاض بہت بری طرح پریشان تھا۔علی مراد اس کی جان کو آیا ہوا تھا۔شاہ ہارون گیلانی کی دشمنی آسان نہیں تھی۔وہ اونٹ تھے برسوں اپنا کینہ چھپانے کے ماہر۔

''لیکن کون مانے گا۔اس کا بھتیجا نہیں تو اس کا بھائی مارا گیا۔جو اس کا سمدھی بھی تھا۔دوہرا رشتہ۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

''کچھ تو کیجئے۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''میں اس طرح بڑے نقصان میں ہوں۔پارٹی پر پہلے ہی مرحلے پر اتنی بڑی افتاد آ پڑے تو پھر کس طرح آگے بڑھ سکیں گے۔''

''کیوں بندے پکے نہیں ہیں تمہارے۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے پوچھا۔

''پیر جی ہنڈیا میں کٹا ہوا گوشت بھی گلنے سے پہلے اینٹھتا ہے۔پھر کہیں جا کر گلتا ہے اور کھانے کے قابل ہوتا ہے۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''پیسے سے نیتیں خریدی جاتی ہیں۔وفاداریاں نہیں۔یہ تو برسوں میں جا کر کہیں بدلتی ہیں۔جبلت کی طرح۔بندے بھی آہستہ آہستہ ہی پختہ ہوتے ہیں۔خیر۔۔۔!'' وہ گہری سانس بھر کے بولا۔''آپ کچھ تو کیجئے۔!''

''اچھا۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ایک گہری سانس لی۔''تم کہتے ہو تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔مگر کچھ کرنے کے لئے، ہلچل کے لئے، اخراجات ہوتے ہیں اور تم تو بڑے بے مروت ہو۔فوراً ہی نفع نقصان کا حساب کرنے بیٹھ جاتے ہو۔حالانکہ دیکھ لو، ہماری ضرورت پڑ ہی گئی نا۔۔۔!''

''چھوڑیں بھی پیر جی۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل سے نہیں لگاتے۔۔!''

''تو پھر دل لگانے والی بات کرو۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''یہ دو کروڑ ہیں۔!'' ملک ریاض نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ ان کے آگے سرکایا۔

''اچھا۔!'' انہوں نے بے نیازی سے لفافہ پیروں سے ایک طرف کھسکا دیا۔اور فون کے بٹن پش کرنے لگے۔

''ہیلو۔۔۔!'' انہوں نے سلسلہ ملتے ہی کہا۔''ہم بول رہے ہیں۔بہت افسوس ہوا شاہ سکندر گیلانی کی شہادت کا۔لوگ اس موقع پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں مگر میں حوصلہ اور امید دیتا ہوں۔کیونکہ شہادت نعمت بھی ہے۔روایات میں آتا ہے کہ ایک شہید اپنے ستر عزیز و اقربا کی شفاعت کروائے گا۔اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔۔!'' پھر وہ رک کر دوسری طرف کا ردعمل جاننے لگے۔

''ٹھیک ہے۔۔ملک ریاض بھی آپ کی حویلی تعزیت کے لئے حاضر ہونا چاہتے ہیں۔انہوں نے حلفاً کہا ہے کہ ان کا اس

حادثے میں کوئی ہاتھ نہیں۔اختلافات تو الیکشن کے ہوتے ہیں۔کوئی دشمنی ذاتی تو نہیں ہے۔!''

''بالکل۔۔بالکل!''اچھا اللہ حافظ۔۔۔!''

''لو جی ملک ریاض۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔''تعزیت کے لئے آنے سے ہارون گیلانی نے منع نہیں کیا ہے۔''

''چلو جی اچھا ہے۔دل صاف ہو گیا۔!'' ملک ریاض ہنسا۔

''دل صاف ہو گیا یہ کس نے کہا۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اچنبے کا اظہار کیا۔

''آپ ہی تو کہہ رہے ہیں۔'' ملک ریاض نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔''انہوں نے تعزیت کے لئے آنے سے منع نہیں کیا۔''

''تم سیاست کی دنیا میں داخل ہو رہے ہو۔یہاں رویوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔یہ بزنس ڈیل نہیں ہے۔جہاں ایک ہاں، ایک بیعانے، ایک ایم اوز کے ذریعے کمٹ منٹ فائنل ہو۔یہاں ہر لمحہ، ہر انداز سمجھنا پڑتا ہے اور پھر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر سیاست میں مقام بنتا ہے!''۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔!'' ملک ریاض نے شرمندگی سے کہا۔''مجھے اتنی جلدی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔''

''کوئی بات نہیں۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے مربیانہ لہجے میں کہا۔''پیروں سے جڑے رہو گے تو فیض پاتے رہو گے۔سیکھتے رہو گے۔نکھرتے رہو گے۔!''

''کل دس بجے نماز جنازہ ہے ہم ایک بجے چلیں گے۔!''

''کیا نماز جنازہ میں شرکت نہیں کرینگے۔؟''

''ہمارا یہ مقام نہیں کہ ہم کسی کے پیچھے کھڑے ہوں۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔''بہت زیادہ بھیڑ اور ڈسٹ سے بھی کھانسی آنے لگتی ہے، استھما شدید ہو جاتا ہے۔یہ مجبوری ہے، فاتحہ خوانی کریں گے۔!''

''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔!'' ملک ریاض اٹھا اور انہیں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے خادم کو دوبارہ قہوہ لانے کا حکم دیا جو دوران گفتگو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

''شاہ جی۔!'' سہیل نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔''اگر اجازت ہو تو پیر ستارہ شناس کو حاضر کروں۔!''

''کب آیا تھا۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

''تین چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔'' سہیل نے بتایا۔

''خالی ہاتھ آیا ہے یا پھر کچھ نذر نیاز لایا ہے۔؟'' انہوں نے بے دلی سے پوچھا۔

''ہے تو بہت پر جوش۔!'' سہیل نے بتایا۔''لگتا ہے کہ سچ مچ کام کروانا چاہتا ہے۔!''

''چلو پھر لے آؤ۔!'' انہوں نے کہا اور اپنے شہ نشین پر دراز ہو گئے۔

دو چار منٹ کے بعد ہی پیر ستارہ شناس اندر داخل ہوا۔ اس نے بادامی رنگ کا جبہ پہنا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر رُوپہلی گوٹا لگا ہوا تھا۔ سر پر اسی سے ہم رنگ دستار تھی۔ جس پر ایک بڑا سا سپید موتی لگا ہوا تھا جو کہ مصنوعی تھا۔ تمام انگلیوں میں یاقوت، مرجان، عقیق کی انگوٹھیاں تھیں۔ پیروں میں منقش کھسے تھے۔ جو اس نے پاس ادب سے کافی دور اتار دیئے تھے۔

''سرکار۔۔۔ سرکار۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ اور ان کے پاؤں چھوئے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔

''یہ کیا کرتے ہیں آپ، ہم گناہگاروں کو جنت سے دور کرتے ہیں۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے ان کے پاؤں تھام لئے۔

''رہنے دو ستارہ یہ منہ دیکھے کی محبت۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ ''جب ہم بلاتے ہیں تو تم مصروف ہوتے ہو۔''

''معاف کیجئے گا سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے اپنے کلے پیٹے۔ ''روپوں، روپوں کو ترستا ہوں۔ لوگ آتے ہیں بس جی اپنا کام کروا کے مٹھائی کا ڈبہ دیکر چلے جاتے ہیں۔ بس ان ہی جنجالوں میں پھنسا رہتا ہوں۔ انتظار کراؤں تو بھاگ جاتے ہیں۔'' اس لئے کبھی کبھی بلاوے سے غیر حاضری ہو جاتی ہے۔!''

''ہاں۔۔'' پیر جہانگیر ہمدانی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہارے معاملے میں غور کرنا ہی پڑے گا۔ ڈھیری کے بغیر بندہ بے نام و نشان رہ جاتا ہے۔۔۔!''

''حضور سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے لپک کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ''کب سے التجائیں کر رہا ہوں کہ محکمہ اوقاف والوں سے کوئی دربار الاٹ کروا دیں۔۔۔ عزت بن جائے گی۔۔۔!''

''خرچ وغیرہ بھی کر سکتے ہو، یا ہمیں بھی کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا دو گے۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی مسکرائے۔

''یہ لیجئے سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے ایک تھیلا ان کے سامنے الٹ دیا۔ اس میں سے سو، سو روپوں کی نئی نئی گڈیاں نکل کر ان کے سامنے ڈھیر ہو گئیں۔ ''پورے پانچ لاکھ کی نذر گزار رہا ہوں سرکار کو۔ قسم خدا کی، ساری عمر غلام بن کر ہی رہونگا۔ آپ ہی کا دیا کھا رہا ہوں۔ آئندہ بھی نمک حرامی نہیں کرونگا۔''

''اچھا۔۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کتنے مرید ہو گئے ہیں تمہارے۔۔۔؟''

''حضور دنیا کو ہزاروں ہی کہتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ چودہ، پندرہ سو سے زیادہ نہیں ہونگے، اور وہ بھی بہت کھینچ تان کر۔''

''یہ سب ہی مرید ہیں یا سائل بھی لپیٹ لئے ہیں۔!''

''پتا نہیں۔!'' پیر ستارہ شناس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''کہتے تو خود کو ہمارا مرید اور جانثار ہی۔ لیکن کل کلاں کوئی وقت پڑا تو پلٹ کے دیکھیں گے بھی یا نہیں۔؟ یہ تو نہیں جانتے۔۔۔!''

''پھر تو سائل ہی ہوئے۔'' وہ ہنسے۔ ایک معنی خیز ہنسی۔ ''قیادت، سیادت، ولایت، ہم پر ہی سجتی ہے۔ سیدوں پہ ہی۔''

http://kitaabghar.com

''حضور ہی سب کچھ ہیں۔!'' پیر ستارہ شناس نے ناز سے کہا۔ ''ہمیں تو بس اپنا لیجئے۔۔!''

''تم اپنا شجرہ ہمیں دینا۔! ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ دو چار دن بعد آؤ تو محکمے سے کسی کو بلوائیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ کہاں کی گدی تمہارے لئے مناسب رہے گی۔۔!''

''بس جی جہاں بھی رہونگا۔ سرکار کے ہی گن گاؤں گا۔'' پیر ستارہ شناس نے والہ وشیدا ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں خادم چائے وغیرہ کے لوازمات لے آئے۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے انہیں چائے پینے کا اشارہ کیا۔

اچانک سہیل اندر داخل ہوا، اور پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ چند لمحے سنتے رہے۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ سہیل تیزی سے رخصت ہو گیا۔

''لو جی پیر ستارہ شناس۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''تمہاری قسمت اچھی ہے کہ محکمہ اوقاف کا ایک اہم افسر آ رہا ہے۔ تمہیں اس سے ملواتے ہیں مگر ذرا لئے دیئے رکھنا۔ تاکہ تمہارے متعلق اچھا تاثر بنے۔۔۔!''

''فکر نہ کریں سرکار۔ ہم آپ کے خادم ہیں۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں شلوار قمیض اور سیاہ واسکٹ میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھی گرم جوشی سے ملا۔

''آج اتنے دنوں کے بعد کیسے یاد کیا۔ آپ نے حمیدی صاحب۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا نیاز حاصل کرتا چلوں، پچھلے دنوں سنا تھا۔ آپ ملک سے باہر تھے۔'' مقصود حمیدی نے بتایا اور پوچھا ''درگاہ شریف کا سنائیں۔ سنا ہے کہ اس کو یونیسف والے ٹیک اوور کر رہے ہیں۔''

''کہہ تو رہے ہیں۔ لیکن ہم تو صرف یہی چاہتے ہیں کہ وہ اس کی مرمت اور دیکھ بھال کا خرچ اٹھا لیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ یہ گورے بڑے خسیس بنیئے ہوتے ہیں۔ پائی پائی کا حساب مانگتے رہتے ہیں۔ ان کے سوال و جواب سے خدا ہی بچائے۔۔۔!''

''بات تو ٹھیک ہے آپ کی۔ ہماری تو عادت ہی نہیں حساب کی۔ حساب دوستاں در دل کے مصداق۔ جو تیرا ہے وہ میرا ہے۔'' مقصود حمیدی ہنسا اور قہوے کا ایک گھونٹ لیا۔ جو ابھی خادم لا کر رکھ گئے تھے۔

''پھر آپ نے درگاہ حضرت میاں کا کیا کیا۔؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ابھی خالی رکھئے گا۔۔'' پیر جہانگیر ہمدانی نے کہا۔ ''ہم اس کے لئے موزوں متولی کی تقرری کے لئے صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔!''

''جلدی کر لیں۔۔'' مقصود حمیدی نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میرے لئے اس کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ درگاہوں کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ ورنہ پھر نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''فکر نہ کریں ہم اس کے لئے بہت اچھا بندوبست کر رہے ہیں۔ چند ہی دنوں میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''جی بہتر ہے۔'' مقصود حمیدی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اجازت دیجئے۔''

''کھانا کھا کر جایئے گا۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

''مجھے جلدی ہے ایک اور کام بھی ہے۔ سوچتا ہوں اس کو دیکھتا جاؤں۔'' مقصود حمیدی نے اپنی عجلت کا جواز پیش کیا۔

''اچھا تو پھر ایک تحفہ لیتے جایئے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے سہیل کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ سہیل نے جلدی سے سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ مقصود حمیدی کو پیش کیا۔ جس کو اس نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس تمام کاروائی کے دوران پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ایک لحظے کے لئے بھی پیر ستارہ شناس کو توجہ دی اور نہ ہی اس کا تعارف کروانے کی زحمت کی۔

پیر ستارہ شناس نے مقصود حمیدی کے جاتے ہی پیر تھام لئے۔ ''سرکار اب تو کچھ کر دیں۔''

''اچھا بھئی وعدہ تو کر لیا نا تم سے، پھر کاہے کو مرے جا رہے ہو۔؟''

''بس مجھے درگاہ حضرت میاں دلوا دیں۔۔'' اس نے کہا۔

''کیا۔۔۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔ اتنی بڑی درگاہ سنبھال لو گے۔؟ پھر اس کے اخراجات اور لوازمات۔۔۔!''

''بس آپ ایک بار ہاں تو کہہ دیں میں اپنی زمیں بیچ کر لے لونگا۔''

''چالیس پچاس لاکھ کا خرچا ہے۔ تم کر لو گے اتنا دو چار دنوں میں۔؟''

''آپ حکم تو کریں۔ میں اپنی جان پر کھیل کر یہ کر لوں گا بس آپ کی ہاں چاہیے۔''

''مجھے کیا فائدہ ہوگا۔؟'' پیر جہانگیر ہمدانی نے خالص کاروباری لہجے میں پوچھا۔

''جیسا آپ حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''میں آج بھی اور کل بھی آپ کے حکم سے کب باہر ہوں۔ آپ سمجھ لیں کہ آپ ہی وہاں کے مالک و مختار ہیں۔''

''دیکھو بھائی۔۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''شرع میں شرم کیسی۔؟ اس درگاہ کی سالانہ آمدنی دو ڈھائی کروڑ روپے ہے۔ یہ سب تم کو مبارک رہے۔ ہمیں تو بس ہمارا حصہ پانچ لاکھ روپے ماہانہ پہنچا دیا کرنا۔ پہلے تین مہینے کے ایڈوانس پھر ہر مہینے یکم تاریخ کو، تم ساٹھ لاکھ کا بندوبست کر لو۔ ایک ہفتے میں درگاہ تمہارے سپرد۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

پیر ستارہ شناس نے خوشی میں گردن ہلائی۔ لپک کر پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی بلائیں لیں اور بولا۔ ''مجھے اجازت ہے۔ میں بندوبست کر لوں۔!''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے جواب دیا۔ ''بڑے شوق سے۔''

پیر ستارہ شناش بے حد خوش خوش وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

شرط مٹی کا ڈھلنے پر راضی ہونا ہوتا ہے

دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم خادم حسین کے گاؤں پہنچے۔ وہ گاؤں کی بیرونی حد پر ہی ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ ہم میں سے وہ صرف ڈرائیور کو ہی پہچانتا تھا۔ باقی لوگوں کے نام اس کو معلوم تھے۔ مگر ناموں کے ساتھ چہرہ شناسی اب ہو رہی تھی۔

''بہت جلدی پہنچ گئے۔ آپ لوگ۔!'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ایک سو چالیس سے کم کہیں بھی نہیں رہا۔۔۔!'' ڈرائیور نے فخریہ انداز میں کہا۔

''حالانکہ سرکار ہمیشہ کہتے ہیں کہ رفتار اتنی رکھو جتنی قابو میں رکھ سکو۔۔۔!'' دوسرے خادم عبدالشکور نے کہا۔ جو ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ ''اتنی رفتار پر قابو قادری سرکار کی دعا سے ہی تو ہے۔!'' ڈرائیور نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''اب یہاں باتیں ہی بناتے رہو گے یا چلو گے بھی؟''۔ خادم حسین نے کہا۔

''چلو۔۔!'' ہم نے اس کو بھی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ذیلی سڑک سے گزر کر گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں کیا تھا۔ اچھا خاصا قصبہ تھا۔ جب گاڑی خادم حسین کے گھر پر رکی تو کئی بچے جمع ہو گئے۔ ''ماسٹر جی کے مہمان آ گئے۔۔۔ مہمان آ گئے۔۔!'' جیسے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''کیوں شور کر رہے ہو، بچو۔!'' اچانک ایک آواز بچوں کے شور پر حاوی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑی عمر کا آدمی تہبند باندھے، قمیض پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے چلا آ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی بچوں میں خاموشی چھا گئی۔

''یہ میرے ابا جی ہیں۔۔۔!'' خادم حسین نے مجھے بتایا۔ ''غلام حسین۔۔!''

''آؤ جی بسم اللہ۔۔۔!'' غلام حسین نے قریب آ کر ہم سے گرم جوشی سے کہا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ ہم لوگ بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ''چلو جی کھانا تیار ہے۔ پہلے کھانا کھا لیں پھر باتیں کریں گے۔!''

ان دونوں باپ بیٹوں کے رویئے سے قطعاً ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ ہم، کم از کم میں ان سے پہلی بار مل رہا ہوں۔ یوں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

ہم لوگ گھر میں داخل ہو گئے، سادہ سا گھر تھا۔ بڑا سا وسیع صحن، ایک جانب طویل دالان تھا۔ جس پر سرکنڈوں کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اس طویل دالان کو چار، پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر حصے میں دس، بارہ بنچیں، ایک میز، کرسی، تختہ سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔ انداز بتا رہا تھا کہ یہ خادم حسین کی اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ درس گاہ ہے۔ یہاں وہ بچوں کو زیورِ تعلیم سے آشنا کر رہا تھا۔ دالان کے

سامنے وسیع صحن کے ایک حصے میں دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ایک طرف باورچی خانہ تھا۔ جہاں چولہا بنا ہوا تھا اور اس میں سے بل کھاتا ہوا دھواں اٹھ رہا تھا۔ایک چودہ، پندرہ سال کی لڑکی ہنڈیا میں چمچ ہلا رہی تھی۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پاتے ہی اس نے تیزی سے اپنے سر پر دوپٹہ درست کیا اور کنکھیوں سے ہماری جانب دیکھا۔اس کی گندمی رنگت آگ کی تپش سے سرخ ہو رہی تھی۔اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں سلام کیا تو اس کے ہاتھوں کی حرکت سے فضا میں چوڑیوں کی کھنک گونجی۔ وہ مسکرائی، ایک سادہ دل آویز خیر مقدمی مسکراہٹ، جس میں محبت اور گرم جوشی تھی۔

مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔نجانے کیوں۔؟ بعض اوقات سادگی ہمیں اپنی طرف بلاتی ہے۔مگر ہم فطرت سے دور، مصنوعی حوالوں سے زندگی پرکھتے رہتے ہیں۔مصنوعی رویے، مصنوعی باتیں، مصنوعی خاطر داریاں، مصنوعی ذائقے۔ کچھ بھی تو اصل نہیں ہوتا۔ہم بے اصل رہ جاتے ہیں۔

''چلو بیٹا آپ لوگ ہاتھ، منہ دھولو۔۔۔!'' اس نے ایک جانب لگے ہینڈ پمپ کی جانب اشارہ کیا۔ہم نے اسی جانب رخ کیا۔ میں جیسے ہی ہینڈ پمپ کے پاس پہنچا، خادم حسین نے اس کے ہینڈل کو دھیرے دھیرے چلانا شروع کیا۔

''رہنے دو میں منہ دھولوں گا۔!'' میں نے کہا۔

''آپ کو عادت نہیں ہے۔سارے کپڑوں پر چھینٹیں پڑیں گی۔'' وہ مسکرایا۔''ہم لوگ تو اس کے عادی ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔پانی نہایت ٹھنڈا، میٹھا تھا۔چند ہی منٹوں میں ہاتھ، منہ دھو کر فارغ ہو گیا۔

''آجاؤ جی دسترخوان تیار ہے۔۔!'' غلام حسین کی آواز سنائی دی۔ جو اندرونی کمرے سے آرہی تھی۔ہم اندر چلے گئے۔ زمین پہ دری پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا چُنا ہوا تھا۔دال، مرغی کا سالن، ہری مرچ کی چٹنی، روٹی، زیرے سے بگھارے چاول، روٹیاں اور ان کی سوندھی مہک، بھوک پہلے تو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔لیکن تازہ روٹی کی مہک نے جیسے اچانک اشتہا بیدار کر دی۔ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانا شروع کر دیا۔کھانے کے دوران خادم حسین اور غلام حسین دونوں خانقاہ کے متعلق سوال جواب کرتے رہے۔

کھانا کھانے کے بعد اصلی دودھ پتی کی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خادم حسین نے بتایا۔''ادھر تو جی بڑا غضب ہو گیا۔عبداللہ سکندر شاہ گیلانی کے جلسے میں دھماکا ہو گیا۔جس میں سکندر شاہ گیلانی بڑے شاہ جی شہید ہو گئے۔ کئی دوسرے لوگ بھی شہید ہوئے ہیں۔زخمی تو بے شمار ہیں۔''

''اچھا۔۔!'' مجھے حیرت ہوئی۔''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''کل کا جی۔'' خادم حسین نے جواب دیا۔''کافی چینلز پر نیوز چل رہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے دو بندے بھی شہید ہوئے ہیں۔ تین چار زخمی بھی، مگر معمولی زخمی ہیں۔''آج بڑے شاہ جی کا جنازہ تھا۔ بڑی دنیا آئی ہوئی تھی۔ وزیر اعظم نے بھی آنا تھا۔مگر پھر سکیورٹی کی وجہ سے منع کر دیا گیا۔''

[redacted]

ساتھ رکھی گئی۔ جو واردات کے بعد اس پاس گھوم پھر کر اٹھائی گئی پیروں کے نشانات کے ذریعے جرم کا کھوج لگاتا تھا۔ اس دوران بڑے دلچسپ واقعات بھی سامنے آتے تھے۔ بعض اوقات وارداتیے اپنے پیروں کے نشانات چھپانے کے لئے اُلٹے جوتے پہنتے، ایک چورنے تو اپنے سر کے اوپر بوری رکھ کر واردات کی۔ تاکہ واردات کسی حاملہ خاتون کی چوری لگے۔ مگر پھر بھی پکڑے جاتے تھے۔ بعض زمین دار اپنے دشمنوں کو پھنسانے کے لئے خود ہی چوری یا ڈکیتی کی کاروائی ڈال دیتے تھے۔ کچھ سمجھے؟'' غلام حسین نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

اس کی جہاندیدہ آنکھوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ برسوں کا مشاہدہ جھلک رہا تھا۔ آدمی پڑھا لکھا یا جاہل جاننے کے فرق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے سانس لیتے واقعات سے بے بہرہ ہو جائے تو جاہل۔ اگر سمجھے تو پڑھا لکھا۔

''تنزیل جی! یہ ڈگریاں تو کپیاں ہیں، بھلا کپیوں سے سمندر کھنگالا جاتا ہے یا علم پرکھا جاتا ہے؟۔ بس ایک اعتراف ہے۔ کہ جی یہ کاغذ کا ٹکڑا تمہارے اتنے برسوں کی عبادت کا ثمر ہے۔ ہیں جی؟ علم حاصل کرنا بھی تو عبادت ہی ہے''۔

میں اس کو دیکھتا رہا۔ یا اللہ۔! آدمی کیا ہے؟۔ اک معمہ ہے سمجھنے کا یا سمجھانے کا؟۔ کیا کیا بھر دیا ہے تو نے اس چند بالشت کی مخلوق میں۔ کیسے کیسے سوالات، بجھارتیں، اونچے نیچے راستوں کو اندر ہی اندر کھوجتے رہنے والا یہ بے بس، جب اپنے ارادوں کو پورا کرنے پر آئے تو ایورسٹ کو بغیر آکسیجن فتح کر کے دکھا دے۔ یارِبا۔ تیرے بھید تو جانے۔

''آپ کو اس معاملے پر شک ہے۔؟'' میں نے غلام حسین کی طرف دیکھا۔

''ہم شک کیسے کر سکتے ہیں۔؟'' غلام حسین نے بڑے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''صدیوں سے ہم بڑوں کو سلام کرتے، جھکتے ان کے حکم کو مانتے اور ان سے پیار کرتے چلے آئے ہیں۔ پھر ہم کیوں شک کریں؟۔ ہمیں ان کے ہر لفظ اور ہر فعل پر یقین ہوتا ہے۔ ان پر شک کرنا تو گناہ ہے۔''

''اور حقیقت ابا۔۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔''شک کرنا تو مفروضے پر مبنی ہوسکتا ہے۔لیکن حقیقت تو اپنا آپ۔آپ ہی بیان کردیتی ہے۔''

''سچ ہے پتر۔۔!'' غلام حسین نے ایک گہری سانس لی۔''اس سے بڑھ کر سچ کیا ہوگا کہ تو الیکشن کے لئے کھڑا ہے۔ان کے مقابلے پر، جو اتنے بڑے، اتنی اونچائی پر کھڑے ہیں کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوپی نیچے گر جائے۔ٹوپی نیچے گر جائے''۔وہ ہنسا۔''ٹوپی نیچے گر جائے یعنی دوسرے کی عزت اچھالتے ہوئے، اس کی عیب جوئی کرتے ہوئے، اپنی عزت، اپنا آپ ہی داؤ پر لگ جائے۔''

غلام حسین نے ایک ایسی سامنے کی حقیقت کی نشان دہی کی کہ میں حیران رہ گیا۔

''پتر۔! کچھ حقیقتوں سے پردہ آپ ہی سرک جاتا ہے اس کو سیانے مکافات عمل کہتے ہیں۔ایک تو وہ ہے نا کہ، پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی اونچائی کے زُعم میں۔خود ہی سب کچھ ہونے کی فکر میں، ایسے فیصلے کرتا ہے۔کہ وہ فیصلے نہیں بلکہ غلطیاں ہوتی ہیں۔غلطیاں بچے دیتی ہیں۔پھر ان سے غلطیوں در غلطیوں کا سلسلہ پھیل کر سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔''

''ابا کا فلسفہ بڑا عجیب ہے۔!'' خادم حسین مسکرایا اور میری طرف دیکھا۔

مجھے غلام حسین بہت اچھا لگا۔اس کی باتوں میں وہ سب کچھ تھا۔جس کی حقیقت اور سچائی کے لئے ہم مغرب اور وہاں کے عمرانی فلسفے کی جانب جاتے ہیں۔ان کی موٹی موٹی کتابوں اور بڑے بڑے ناموں سے مرعوب ہوتے ہیں۔یہاں ایسی زندہ کتابیں تہبند باندھے، حقہ گڑگڑاتے ہوئے، اُپلوں کی راکھ کریدتے جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔مگر ہم دانش کو، فکر کو، اجتماعی شعور کو باہر سے منگوانے کی کوشش کرتے ہیں۔گویا اُلٹے بانس بریلی کو بھیجنے کی بات۔میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور پوچھا۔''کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ قادری سرکار نے ایک خط بھجوایا ہے، امام صاحبان کے نام۔۔''

''جی معلوم ہے۔!'' غلام حسین نے کہا۔''سرکار کا حکم تھا کہ آپ آئیں تو آپ کو تمام امام صاحبان سے ملوا دیا جائے۔''

''تو پھر اس ملاقات کا بندوبست کس طرح ہوسکتا ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''آج صبح بڑے شاہ جی کی نمازِ جنازہ تھی۔اس میں کئی لوگ آئے تھے۔شام کو مغرب کے بعد سارے اِدھر ہی آئیں گے۔سب ہی سرکار سے پیار کرتے ہیں۔کوئی بھی ایسا نہیں جو کہ سرکار کی بات سے بال برابر بھی انحراف کرے۔''

غلام حسین نے کہا۔اس کے لہجے میں عقیدت، محبت اور یقین کا امتزاج تھا۔

''ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ ان بڑے لوگوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔دوسری طرف آپ قادری سرکار کے متعلق اس قدر پُر یقین ہیں کیا یہ عجیب نہیں۔؟'' میں نے سوال کیا۔

''توبہ جی توبہ۔۔کہاں ہمارے سرکار۔اللہ میاں جی کے گھر عزت والے، پیار والے، ہمارے مرشد پاک اور کہاں دنیا کی دولت والے بڑے بڑے گھر والے، اربوں پتی، پیار سے، دین سے خالی لوگ، کاغذی گڈے۔''اس نے اپنے دونوں گال کو ہاتھ لگایا۔توبہ کے

انداز میں۔ ''جی قادری سرکار کا دنیاداروں سے موازنہ کرنا، مقابلہ کرنا جی گناہ ہے۔ بہت بڑا گناہ۔'' اس کے لہجے میں پانی بھر گیا۔

''یا اللہ!'' میں نے دل میں کہا۔ قادری سرکار کیا ہیں۔؟ سینکڑوں میل دور بھی اتنے اثر دار، اتنے خوش قسمت۔ اتنے معتبر کہ لوگ ان کے پیار کی گواہی میں آنسوؤں کی شہادت ملائیں۔

''چاچا جی۔۔۔!'' میں نے نجانے کیوں انہیں اس لقب سے پکارا۔ پر وہ مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا۔ ''آپ کو کیسے پتا کہ قادری سرکار اتنے بڑے مرتبے پر ہیں۔ اللہ میاں کے پیارے۔؟''

''بیٹا جی۔!'' اچانک جیسے غلام حسین کی آنکھوں میں بجلی پیدا ہو گئی۔ ''کیوں ہمیں پھر ولتے ہو؟۔ آپ تو جی ان کے خلیفہ ہو۔ جب خدا اپنے بندے کو چن لیتا ہے۔ جب بندہ اپنے آپ کو مالک کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی مرضی میں ڈھل جاتا ہے۔ تو پھر خدا کی رضا کا تحفہ ملتا ہے۔ اور خدا کی رضا اس کی محبت ہے۔ جو خدا کی طرف سے نور کی صورت بندوں کے دلوں پر نازل ہوتی ہے۔ اور ہر بندہ اس بندے کو پیار کرنے لگتا ہے۔۔ سمجھے خلیفہ جی۔۔!''

میں بُری طرح سٹپٹا گیا۔ یہ غلام حسین کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اور خلیفہ۔ وہ بھی قادری سرکار کا۔ یہ یقیناً کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

''چاچا جی! میں خلیفہ نہیں میں خادم ہوں ان کا۔۔!'' میں نے کہا۔

''اچھا۔۔!'' وہ مسکرایا۔ بہت پیار بھری۔ بے ریا۔ بے کھوٹ مسکراہٹ۔ مگر جو کہہ رہی تھی، جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔

''جب بندہ خود کو اللہ والے کے سپرد کر دیتا ہے۔ تو وہ کمار کے آوے پر چڑھا مٹی کا تودا ہوتا ہے۔ کمار اپنے پیروں سے آوے کو گھماتا رہتا ہے۔ ہاتھوں کی حرکت سے اس مٹی کو اپنی مرضی سے مٹکا، پیالہ، صراحی کسی بھی برتن میں ڈھال لیتا ہے۔ پر شرط مٹی کا ڈھلنے پر راضی ہونا ہوتا ہے۔!'' غلام حسین کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے دن میں اجالا نہیں اندھیرا ہو۔ ایسا اندھیرا جس میں ڈر، اور خوف نہیں کچھ ہونے کا امکان بھرا ہو۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ وہاں غلام حسین کے بجائے قادری سرکار بیٹھے تھے۔

''آپ یہاں۔۔؟'' میں نے بمشکل کہا۔

''ہم تو آپ کے ساتھ ساتھ ہیں ہر جگہ تنزیل میاں۔ جلوت میں، خلوت میں۔!'' وہ مسکرائے۔

''لیکن۔!'' میں تشکیک کے جال میں الجھ رہا تھا۔

''لیکن کیا۔ تنزیل میاں۔؟''

''یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔؟''

''آدمی کے اندر، اس کے پروگرام کو روزِ ازل سے ہی مرتب کر دیا جاتا ہے۔ مگر دنیا کے جھمیلوں میں وہ پروگرام سامنے نہیں آپاتا۔ تو پھر قدرت اِس کو اُسی دائرے میں واپس لے جاتی ہے۔ جس کے لئے اِس کو تخلیق کیا گیا ہے۔''

''پھر میری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔؟'' میں نے آرزو گی سے پوچھا۔

''تلاش۔۔۔!'' انہوں نے بلا تامل کہا۔

''میری تلاش تو ترک ہوگئی۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ ''کیا ہے میرے پاس۔ نہ آرزو۔ نہ شوق۔ نہ جذبات اور نہ کوئی دامن گیر۔''

''ترک کی منزلوں کے بعد ہی قرب کا اِجراء ہوتا ہے۔ وہ دَروا ہوتے ہیں۔ جہاں لطف اور عنایات، کیفیات کی ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔ جہاں ہر لمحہ نیا، دلچسپ، تحیر آمیز ہوتا ہے۔ ایسا تحیر، ایسا تعلق کہ پھر کسی اور تعلق کی تمنا ہی نہیں ہوتی ہے۔ ہر سوال اپنے جواب آپ دیتا ہے۔ ہر رنگ اپنی تفہیم آپ کرتا ہے۔ ہر مرتبہ اپنے اضافے کا آپ جواز ہوتا ہے۔ ابھی تو شروع ہوا ہے سفر۔۔۔!''

''مگر مجھے مجاہدوں کا یارا نہیں۔!'' میں نے بہانہ تراشا۔

''تمہیں مجاہدوں کی کیا ضرورت۔؟'' انہوں نے کمال شفقت سے اپنا ہاتھ، میرے سر پر پھیرا۔ ''مجاہدے، مراقبے کی منزل تو یکسو ہونے کے لئے کرائی جاتی ہیں۔ تم تو یکسو ہو۔۔۔!''

''مگر کیسے۔؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اپنے آپ سے پوچھو۔'' وہ مسکرائے۔

''کیا پوچھوں۔؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''پوچھیں تنزیل میاں کیا ہوا۔؟'' کسی نے جیسے مجھے زور سے ہلایا۔ میں جیسے ایک جھٹکے سے بیدار ہوگیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ غلام حسین، خادم حسین، ڈرائیور سب وہیں تھے۔ تو پھر میں کہاں تھا؟۔ کہاں سے ہو آیا تھا؟۔ دن روشن اور چمک دار تھا۔ پھر اچانک اندھیرا کیسے چھا گیا؟۔ یہ کیا اسرار ہے؟۔ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔!

''خلیفہ جی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔؟''۔ خادم حسین نے میرا ہاتھ چھوا۔

''ہونہہ۔۔۔!''

''ارے بیٹا تھک گئے ہیں خلیفہ جی۔۔۔ بس ذرا اونگھ آ گئی ہوگی۔''۔ غلام حسین نے تسلی دی۔ ''اندر چارپائی بچھی ہے۔ بستر لگا ہے۔ گھنٹہ، ڈیڑھ آرام کرلیں تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔''

''اچھا تو ہم چلتے ہیں۔'' عبدالشکور نے کہا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔ ''خلیفہ جی! اگر کوئی پیغام سرکار کے لئے دینا ہے تو پھر کہیے۔''

''بس میرا اسلام کہہ دینا۔'' میں نے کہا۔

عبدالشکور ڈرائیور کے ہمراہ رخصت ہوگیا۔ میں اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ موٹی موٹی مٹی کے دیواروں والا کمرہ گرمیوں کے موسم کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ میں لیٹا تو میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ بعض اوقات ذہن کی کیفیت بے خیال ہو جاتی ہے۔ اور یہی لمحہ سب

سے پیارا ہوتا ہے۔کیا خالی پن بھی سکون کا باعث ہوسکتا ہے۔۔؟اس سے پہلے کہ مزید سوال سامنے آتے نیند کی مہربان آغوش نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

☆.....☆.....☆

ٹی وی پر سب سے مقبول نیوز چینل کا پروگرام ''سیاسی باتیں'' چل رہا تھا۔احمد عبدالحئی اس پروگرام کا میزبان تھا۔اس پروگرام کی ریٹنگ سب سے زیادہ تھی۔اس لئے یہ پروگرام سب سے زیادہ اسپانسرز لیتا تھا۔خود احمد عبدالحئی کا معاوضہ ماہانہ نہیں بلکہ فی پروگرام تھا۔ احمد عبدالحئی کا شمار ان اینکر پرسنز میں ہوتا تھا۔جو نا صرف یہ کہ اپنی قیمت کا ادراک رکھتے تھے۔بلکہ اپنی رقم وصولی کا ہنر بھی جانتے تھے۔وہ رقم جو ہر طرف سے اس کی سمت بھاگی چلی آتی تھی۔بے شمار اہم سیاسی لوگ،سماجی شخصیات اس کے پروگرام میں آنے کے لئے ہر وقت نا صرف یہ کہ تیار رہتی تھیں۔بلکہ اس کی تمام فرمائشیں بھی پوری کر دیتی تھیں۔

اس وقت اس کا پروگرام آن ائیر تھا۔اس میں حکمران جماعت کا ایک نہایت اہم شخص سردار حیات اللہ موجود تھا۔اس کے علاوہ دو سیاسی جماعتوں کے دیگر نمائندے بھی تھے۔

احمد عبدالحئی نے سوال کیا۔''بحیثیت رولر پارٹی آپ امن وامان کے قیام میں قطعاً ناکام ہیں۔کیا وجہ ہے۔؟''

''سیدھی سی وجہ ہے۔'' دوسری سیاسی پارٹی کے کرمانی سعید نے مداخلت کی۔''یہ نااہل ہیں۔ان کو معلوم ہی نہیں کہ کیا ہونیوالا ہے''۔

''بالکل ٹھیک۔!'' شاہد مجید نے تائید کی۔''ان کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے دو خودکش حملہ آور چل پڑے ہیں۔فلاں لوگ ان کا ممکنہ نشانہ ہیں۔ان کو چلنے کا،نشانہ بننے والی شخصیات کا علم ہے۔مگر اس کو روکنے کا اختیار ان کے پاس نہیں۔''

''اگر آپ لوگ مجھے بولنے دیں تو میں کچھ عرض کروں۔'' سردار حیات اللہ نے ناگواری سے کہا۔''سوال مجھ سے کیا جارہا ہے۔''

''اب صرف سوال ہی ہونگے۔جواب تو آپ کو آتے نہیں۔'' کرمانی سعید نے پھر سوال کا میزائل فائر کیا۔

''ان سے صرف کمیشن کا،کرپشن کا،اقربا پروری کا،اور ملک کو تباہ کرنے کا سوال پوچھئے۔'' شاہد مجید نے بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''کہا جاتا ہے کہ وقت تیزی سے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔'' احمد عبدالحئی نے دوسرا سوال کیا۔''کیا پارٹی الیکشن کروائے گی۔؟''

''کیوں کروائے گی الیکشن،کیا بچوں والی بات ہے۔؟'' سردار حیات اللہ نے تیزی سے کہا۔''کیا ہماری اقتصادی حالت،ملک بھر میں سیلاب کے متاثرین،نادرا کی طرف سے انتخابی فہرستوں کا معاملہ،امن وامان کا مسئلہ۔یہ اتنی جلدی الیکشن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔اور ویسے بھی جمہوری حکومت کو اپنی مدت پوری کرنا چاہیے۔''

اصل میں ابھی کچھ ادارے ہمارد دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔'' کرمانی سعید ہنسا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں۔'' شاہد مجید نے لقمہ دیا۔

احمد عبدالحئی نے ان کے جملوں کو نظر انداز کیا۔ اور اپنے سوالوں کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ''اگر الیکشن ہونگے تو آپ کی جانب سے وزارت عظمیٰ کا امیدوار کون ہوگا۔؟''

''کیا مطلب۔۔؟! یہ آپ بے وقت کے سوالات کیوں کر رہے ہیں۔؟'' سردار حیات اللہ نے تیزی سے کہا۔ ''یہ تو پارٹی کی ہائی کمان کا فیصلہ ہوگا۔ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔؟''

''لیکن خلق خدا تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔'' احمد عبدالحئی مسکرایا۔

یہ بات ایسی تھی کہ شاہد مجید، کرمانی سعید اور سردار حیات اللہ خاموشی سے، ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اسکرین پر خاموشی چھا گئی۔ چہروں پر حیرت بولتی رہی۔ تقریباً دس سیکنڈ کے وقفے کے بعد، عبدالحئی نے کہا۔ وہ دس سیکنڈ جس میں ہر ناظر کی قوت سماعت اپنی پوری شدتوں سے اس کی جانب مرکوز تھی۔ ''شاہ ہارون گیلانی کو آئندہ وزیر اعظم کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔''

یہ جملہ نہیں دھماکا تھا۔ میڈیا کے تمام لوگوں کو احمد عبدالحئی کی باخبری کا علم تھا۔

''یہ۔۔ یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ۔؟'' سردار حیات اللہ نے بری طرح گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''کس نے اڑائی یہ بے پر کی، کس کی ہے یہ بے وقت کی راگنی۔؟''

''ہمیں کیا پتا۔؟'' احمد عبدالحئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو خلق خدا کی آواز آپ تک پہنچاتے ہیں۔''

''جھوٹ ہے۔ بالکل غلط۔'' سردار حیات اللہ نے کہا۔ مگر احمد عبدالحئی اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے ناظرین سے مخاطب ہو گیا۔ ''ناظرین آج کے پروگرام ''سیاسی باتیں'' آپ نے سنیں۔ کیسا لگا آج کا پروگرام۔؟ ہمیں اپنی رائے، مشورے سے آگاہ کرتے رہیں۔ کل پھر اسی وقت آپ کے روبرو نئی ''سیاسی باتیں'' لیکر حاضر ہونگے۔ میں شکر گزار ہوں اپنے شرکاء کا۔ انہوں نے ہمارے لئے وقت نکالا۔ اللہ حافظ''

پروگرام آف ہو گیا۔

''یہ کیا کہا آپ نے۔؟'' سردار حیات اللہ نے احمد عبدالحئی سے شدید برہمی کے عالم میں سوال کیا۔ اور مائیک اتارنے والے لڑکے کو پیچھے دھکیلا۔ ''مجھے آتا ہے مائیک اتارنا۔ تم اپنے ہاتھ مجھ سے دور رکھو'' اس نے کالر کے نیچے سے وائرلیس مائیک نکال کر لڑکے کے ہاتھ پر پٹخ دیا۔

''میں نے کیا کہا۔؟'' احمد عبدالحئی نے سادگی سے کہا۔

سردار حیات اللہ نے اچانک بے تکلفی کا رنگ اختیار کر لیا۔ ''تمہیں ضرور کچھ نا کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں پارٹی کا کتنا بڑا فنانسر ہوں۔ پھر میری مرضی کے بغیر کچھ کیسے ہو سکتا ہے؟''۔

''جمہوریت۔۔سردار جی جمہوریت۔اب راج کرے گی خلقِ خدا۔''احمد عبدالحئی نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

''جہنم میں گئی جمہوریت۔''سردار حیات اللہ نے غصے سے کہا۔''تم مجھے رات کے کھانے پر ملو۔''اور اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے۔

شاہد مجید، کرمانی سعید یہ سارا ماجرا دیکھتے رہے۔اس کے جانے کے بعد شاہد مجید نے پوچھا۔''کیا تبدیلی آرہی ہے۔؟''

''مجھے کیا پتا۔؟''احمد عبدالحئی نے کہا۔''سیاست میں تم لوگ ہو، رہتے سمندر میں ہو اور تہہ کا حال مجھ سے پوچھتے ہو۔؟''

''ارے بڑا گہرا آدمی ہے۔''کرمانی سعید نے کہا۔''آسانی سے نہیں بتائے گا۔''

احمد عبدالحئی مسکرایا اور گنگنانے لگا۔''وہ بات کیوں پوچھتے ہو جان من۔۔جان من۔۔۔جو بتانے کے قابل نہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔اسی وقت احمد عبدالحئی کا فون مرتعش ہونے لگا۔اس نے بٹن پش کیا۔

''ہاں بھئی کیسے یاد کیا۔؟''احمد عبدالحئی نے خوش دلی سے کہا۔دوسری طرف اظہر صدیقی تھا۔''آج تم نے کمال کر دیا۔ان کی تو چولیں ہل گئی ہوں گی۔''اظہر صدیقی نے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔''احمد عبدالحئی نے جواب دیا۔''سردار حیات اللہ نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔''

''کیا بات ہے۔!''اظہر صدیقی ہنسا۔''سردار حیات اللہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔اگر کوئی آف دی ریکارڈ بات ہو تو مجھے بتانا۔''

احمد عبدالحئی ہنسا۔''یہ آف دی ریکارڈ بات بتانے والا جملہ خوب ہے۔''

اظہر صدیقی ہنسا۔اور فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

میں سو کر اٹھا تو عصر کا وقت نکل رہا تھا۔۔جلدی سے وضو کر کے نماز عصر ادا کی۔اتنی دیر میں خادم حسین چائے لیکر آ گیا۔''خلیفہ جی بڑی گہری نیند سوئے۔''

''پتر۔۔ذمہ داری بڑا وزن ہوتی ہے۔''غلام حسین نے کہا۔''بہت مشکل ہے راہ نمائی کرنا۔دوسروں کا بھار اٹھانا۔جی یہی تو ہیں کہ ہم جن پر ناز کریں گے بڑے دن۔''

''بڑے دن۔؟''خادم حسین نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''خادم حسین بڑا دن پچیس دسمبر نہیں، قیامت کا دن ہے۔جس کی مقدار ہمارے دن کے مطابق پچاس ہزار برس بتائی جاتی ہے۔!''نا معلوم کیسے جملے میری زبان سے ادا ہو گئے۔مجھے خود حیرت ہوئی۔مجھے دین کا بہت زیادہ علم نہیں تھا۔مگر اس تمثیلی بات کا مفہوم جیسے یکلخت میرے قرطاس ذہن پر روشن ہو گیا۔

''تیار ہو جائیں کچھ لوگ آنے والے ہیں۔''خادم حسین نے کہا۔''ٹھیک ہے۔''

''اگر کپڑے وغیرہ استری کرنا ہوں تو مجھے دیدیں لائٹ آ گئی ہے۔'' خادم حسین نے کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور چائے ختم کر کے اپنے بیگ سے کپڑے نکالنے لگا۔

''کشور۔!'' خادم حسین نے آواز دی۔ چند لمحوں میں وہ نوعمر لڑکی جس کو آتے ہوئے چولہے کے پاس دیکھا اندر آ گئی۔ ''جی خلیفہ جی اسلام علیکم۔!'' اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے سلام کیا اور میرا سوٹ خادم حسین سے لیکر چلی گئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دوبارہ اندر آئی اور خادم حسین سے بولی۔ ''باجی کہہ رہی ہیں کہ جتنے سوٹ ہیں دے دیں ابھی لائٹ ہے تو سارے کر کے ہینگر کر دوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' خادم حسین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لائٹ جاتی ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ بعض اوقات تو دس دس گھنٹے لائٹ نہیں آتی۔''

میں نے انہیں اپنے سارے کپڑے دے دیئے۔ تھوڑی دیر میں کشور نے ایک سوٹ لا کر دیدیا۔ اس میں سلیقے سے ازار بند بھی ڈالا ہوا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا سب خیال رکھ رہے تھے۔ خیال کا، دھیان کا، ایک دوسرے کے ہونے کا، احساس کا، کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے چلتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم، غیر محسوس باتیں۔ جن میں نازک حساسات موجود ہوتے ہیں۔ میں نہا کر تیار ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کسی کے باتیں کرنے، گرمجوشی سے استقبالیہ جملوں کی آوازیں گونجیں۔ چند ہی لمحوں میں غلام حسین تین آدمیوں کے ہمراہ اندر آ گئے۔ وہ تینوں سفید شلوار کرتوں میں ملبوس تھے۔ تینوں کے سروں پر سفید ظ عمامے اور ماتھے پر محراب نمایاں تھے۔

''السلام علیکم۔!'' وہ اندر داخل ہوتے ہی بولے۔

''تنزیل میاں شہر سے تشریف لائے ہیں۔''

''ماشاءاللہ۔۔۔ماشاءاللہ۔'' انہوں نے باری باری مصافحہ کیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''تنزیل میاں قادری سرکار کی خانقاہ سے آئے ہیں۔'' غلام حسین نے سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب تو جانتے ہی ہیں کہ قادری سرکار ہم سب کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ کتنا پیار کرتے ہیں۔''

''بے شک۔۔۔بے شک۔!'' انہوں نے تائید کی۔

''خادم حسین کو جی انہوں نے یہی لکھایا۔ پڑھایا۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ گاؤں کا حق زیادہ ہے۔ جاؤ وہاں لوگوں کی خدمت کرو۔ پھر انہوں نے الیکشن میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ آپ سب جانتے ہیں سرکار کا حکم تو حکم ہوتا ہے۔''

''بے شک۔۔۔بے شک۔!'' ان لوگوں نے پھر تائید کی۔

''لیکن خادم حسین کو، یا پھر مجھے ان چیزوں کا اتنا تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے خانقاہ سے اپنے خاص بچے، اپنے خلیفہ! تنزیل میاں کو ان معاملات کی دیکھ بھال کے لئے یہاں بھیجا ہے۔''

''خلیفہ جی۔۔!'' وہ تینوں اچانک یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے بیٹھ کر گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ ''قادری سرکار کے خلیفہ جی۔'' انہوں نے کہا اور میرے ہاتھوں کو تھام کے بوسے دینے لگے۔

''ارے۔۔ارے۔۔یہ کیا کر رہے ہیں۔'' میں سچ مچ بوکھلا گیا۔ مجھے ان سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ لیکن پتا نہیں قادری سرکار کا نام کیسا طلسمی اسم ہے۔ کہ ان سے جڑتے ہی عام سا بندہ خاص ہو جاتا ہے۔

''آپ لوگ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ ایسا مت کیجئے۔ آپ سب بیٹھیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ہمارے مرشد کے خلیفہ ہیں۔ تو ہمارے بھی مرشد ہی ہوئے نا۔ ہم تو جی آپ کی محبت، نظر عنایت کے طلبگار ہیں۔ مرشد کی خوشنودی جی اللہ کی رضا ہے۔ وہی تو ہمیں سوہنے نبی تک لے جائیں گے۔ جہاں اللہ ہے۔ نجات ہے جی۔'' میں ان کو دیکھ کر رہ گیا۔ یہ اعتماد، یہ یقین، یہ بھروسہ، زندگی بدل دیتا ہے۔ آدمی کو کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیتا ہے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں معتبری کی سیڑھیاں چڑھنے لگا ہوں۔

''بس خلیفہ جی آپ تو ہمیں حکم دیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔؟''

''میں سب سے پہلے آپ کو ایک خط سنانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس خط کو سننے کے بعد ہم اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''جی بہتر ہے۔!''

''میں پہلے آپ لوگوں کا تعارف کرا دوں۔'' غلام حسین نے کہا۔ اور بتانے لگا۔ یہ سامنے اپنے ملک معراج دین ہیں۔ حافظ ہیں۔ جامعہ اظہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔ ان کی باتیں سنو تو بس جی بندہ سنتا ہی رہ جاتا ہے۔ دوسرے جو درمیان میں بیٹھے ہیں۔ یہ میاں محمد سلمان ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی دینی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ حدیث وفقہ کے متبحر عالم ہیں۔ اتنی آسان باتیں کرتے ہیں۔ کہ مشکل سے مشکل مسئلہ لمحوں میں سمجھ میں آجاتا ہے۔ فن تقریر گویا ان پر ختم ہے۔ اور آخر میں مسکراتے بھائی! محمد حنیف صحرائی ہیں۔ شاعری کا شوق رکھتے ہیں۔ اردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ ایک ادبی رسالے میں کالم لکھتے ہیں۔ اور اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد، تصوف کی طرف رجحان ہو گیا۔ ایک دینی ادارے میں داخلہ لے لیا۔ بہت جلد دینی تعلیم مکمل کی۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کمال کی کرتے ہیں۔ گویا سماں باندھ دیتے ہیں۔''

میں ان لوگوں کا تعارف جان کر دنگ رہ گیا۔ اتنے عالم، فاضل دینی اسکالر میرے ہاتھ چوم رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ میرا تعلق قادری سرکار سے ہے۔

''جی ہم کیا۔ ہماری گفتگو اور علم کیا۔ ہم نے تو جو کچھ پایا قادری سرکار کی توجہ اور محبت سے پایا۔ علوم تو وہاں ہیں۔'' میاں محمد سلمان نے انتہائی عقیدت سے کہا۔

''چلیں جی اب خط سن لیں سرکار جی کا۔'' غلام حسین نے تعارف کے مرحلے کے بعد کہا۔

میں نے ان کی باتوں سے محسوس کیا۔ کہ ان میں خط کے مندرجات کو جاننے کا خاصا تجسس ہے۔ مگر وہ اپنے شوق کو احترام کے پردے میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ وہ سب نہایت اشتیاق اور تجسس سے خط سننے لگے۔ میں نے تھوڑی دیر میں خط ختم کیا۔ تو وہ گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے نہایت سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے غور سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگ خط کے مندرجات اور قادری سرکار کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔؟''

''بات یہ ہے کہ اپنے خلیفہ جی! کہ ہم سب اس بات کی جرأت ہی نہیں کر سکتے کہ سرکار کی کسی رائے سے اختلاف کریں۔ جو وہ کہتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ ہمیشہ پُر یقین ہوتے ہیں۔'' ملک معراج دین نے کہا۔

''جی اللہ کے بندے ہی تو پُر یقین ہوتے ہیں۔ پور۔۔ پور خدا کی رضا میں ڈوبے ہوئے۔'' غلام حسین نے گہری عقیدت سے کہا۔ ''اور۔۔''

اس سے پہلے کہ غلام حسین اپنا جملہ مکمل کرتا۔ دروازے پر زوردار دستکیں ہونے لگیں۔ ساتھ ہی کسی نے پکارا۔ ''خادم حسین باہر آؤ۔۔''

اسی وقت کشور اندر داخل ہوئی۔ اور بدحواسی سے بولی۔ ''ابا جی! باہر پولیس آئی کھڑی ہے۔ بہت گاڑیاں ہیں۔''

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

بندہ ہم راز ہو جائے تو بوجھ کم ہو جاتا ہے

دروازے پر دستک ہوئی۔ ''مومی دیکھو دروازے پر کون ہے؟'' اماں نے کہا۔ ''لائٹ نہ ہو تو بندہ دروازے ہی پیٹتا رہ جائے۔!''

''جی دیکھتی ہوں۔!'' ''مومی دوپٹہ سر پر درست کرتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ ''کون ہے۔؟'' اس نے دروازے پر جا کے پوچھا اور آئی ساکٹ سے باہر دیکھا۔

''جی میں قدیر۔۔!'' باہر سے آواز آئی۔

مومی نے دروازہ کھول دیا۔ ''آیئے اندر آجایئے۔ اسلام علیکم۔۔!'' مومی نے دروازہ کھولا اور لپک کر ایک طرف ہو گئی۔ قدیر ہاتھوں میں دو تین پیکٹ پکڑے اندر آ گیا۔

''اماں۔۔۔!'' مومی نے بلند آواز سے کہا۔ ''قدیر آئے ہیں۔''

''اچھا۔۔!'' اماں نے جواب دیا۔ اور قدیر پر نظر پڑتے ہی بولیں۔ ''آؤ بیٹا۔ یہاں بیٹھو۔۔!'' انہوں نے تخت کے سامنے پڑی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔

''السلام علیکم!۔''

''جیتے رہو اللہ پاک حفاظت رکھے۔'' انہوں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''تمہاری امی کیسی ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تم کیسے ہو، پریس کیسا چل رہا ہے۔؟''

''امی کو بخار تھا کئی دن سے۔ اس لئے گھر سے باہر نکلنا ہی نہیں ہوا۔ پریس ٹھیک چل رہا ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔'' قدیر نے تمام صورت حال اماں کے گوش گذار کر دی۔

''مومی چائے لیکر آؤ۔۔'' اماں نے بلند آواز سے کہا۔

''جی لا رہی ہوں اماں۔'' مومی چائے لیکر آئی تو اس کے پیچھے نرگس بھی تھی۔ نرگس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ جس میں پکوڑے، پاپڑ اور چٹنی تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور پلٹنے لگی۔

''بیٹھو۔۔!'' اماں نے کہا۔ اور قدیر کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔ ''یہ قدیر ہے۔ تنزیل کے بچپن کا دوست، یہ سب ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے سب ہی میرے بچوں جیسے ہیں۔ اور یہ نرگس ہے گاؤں سے آئی ہے۔ ہوسٹل میں، میں نے رہنے نہیں دیا۔

اب ہمارے پاس ہی رہ کر ماسٹرز کرے گی۔"

قدیر نے سر کے اشارے سے سلام کیا، نرگس نے بھی جواب دیا۔ پھر سب چائے پینے لگے۔

"پکوڑے تو بہت مزے کے بنے ہیں۔!" قدیر نے کہا۔

"نرگس نے بنائے ہیں۔ ماش کی دال کے، بہت مزے دار ہیں۔ کیوں نا اماں؟" مومی نے بتایا۔

"ہاں۔۔!" اماں نے پیار سے نرگس کو دیکھا۔ "لڑکی کا سلیقہ، اس کی نرمی، اس کے ہاتھوں میں تناسب ہی ذائقہ پیدا کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو مشرق میں لڑکی کا تعارف یہی ہے۔!"

نرگس کی شہابی رنگت، اماں کی تعریف پر سرخ ہوگئی۔ "اماں میں تو بس یونہی بے تکا سا بنا لیتی ہوں۔!" اس نے کہا۔

"یہ میں دو کتابیں لایا تھا تنزیل کے لئے، کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی سوچا مل آؤں۔!" قدیر نے پوچھا۔ "کدھر ہے وہ۔؟"

"تنزیل ذرا کسی کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔" اماں نے بتایا۔

"اچھا۔۔!" قدیر نے کہا۔ "مجھے نہ بتایا، نہ ملا۔۔!"

"فون اس کے پاس ہے۔ فون پر خیریت پوچھ لینا۔" اماں نے اسے سمجھایا۔

"جی بہتر ہے۔!" قدیر نے کہا۔ "مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے دوبارہ پریس جانا ہے۔!"

"میں تمہاری امی کو دیکھنے آؤں گی دو ایک دن میں۔" اماں نے کہا۔ "میری طرف سے سلام بھی کہہ دینا اور طبیعت بھی پوچھ لینا!"

"جی بہت اچھا۔!" قدیر نے بڑی سعادت مندی سے حامی بھری اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

"میں برتن سمیٹ لوں۔" مومی نے کہا اور چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھنے لگی۔ نرگس بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں برتن اٹھا کر کچن میں آگئیں۔ مومی برتن دھونے لگی۔ نرگس کچن ٹیبل کے ساتھ پڑی چیئر پر بیٹھ گئی۔ اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔

"خیریت تو ہے۔ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں۔؟"۔ مومی نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"پتا ہے میں کیا سوچ رہی ہوں۔ بس ایک خیال سا آیا ہے۔ کہیں آپ برا نہ مان جائیں۔" نرگس نے بغور مومی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں برا کیوں مانوں گی بھلا آپ کی بات کا؟" مومی مسکرائی۔ "آپ بلا کھٹک کہیے۔!"

"ابھی جو قدیر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے نا تو آپ سے بات کی، اور نہ ہی ایک بار بھی آپ کی طرف دیکھا۔ حالانکہ انہوں نے مجھے سلام بھی کیا۔ پکوڑوں کی تعریف بھی کی، لیکن آپ کی طرف دیکھا بھی نہیں کیوں۔؟" نرگس نے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔

"اب۔۔ اب میں۔۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔؟" مومی اس کے گہرے مشاہدے سے گھبرا گئی۔

"ایسا تو آدمی جب ہی کرتا ہے جب وہ کسی وجہ سے ناراض ہو یا پھر کوئی خوف ہو۔؟" نرگس نے کہا۔

"خوف۔۔ کیسا خوف۔۔۔؟" مومی نے بے اختیار کہا۔

''راز کھل جانے کا۔!'' نرگس نے کہا۔

''کون سا راز۔۔؟'' مومی کا لہجہ سرسرانے لگا۔ وہ یوں اسٹول پر بیٹھ گئی جیسے بے پناہ تھک گئی ہو۔

''پیار کا راز۔۔!'' نرگس نے جیسے اس کی سماعت میں دھماکا کر دیا۔ اور مومی یوں ڈھے گئی جیسے بتاشہ پانی میں بیٹھ جاتا ہے۔

''یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ اُن سے کچھ نہیں کہا۔!'' مومی نے آہستگی سے کہا۔

''وہ تو راز اپنے اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔ جب ہی دُور، دُور ہیں۔ شائد اماں کے رعب نے، آپ کے بھائی کی دوستی کا ناطہ انہیں آگے بڑھنے سے، کہنے سے روکتا ہو۔!''

''معلوم نہیں۔!'' مومی نے انگلیاں چٹخائیں۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتی، کوئی آپ کو اچھا لگے۔ یا آپ کسی کو اچھے لگیں۔ دونوں معاملات میں اپنا بس کہاں چلتا ہے۔ کوئی کوئی بات تو بغیر کہے ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی تعلق بِنا اپنی مرضی کے دُوسرں سے خود بخود جڑ جاتا ہے۔ پھر کیا کریں۔؟'' مومی دھیرے سے بولی۔ ''اس میں میری کیا خطا ہے؟ مگر آپ بہت تیز ہیں۔''

''ہم تو دیہاتی لوگ ہیں۔ بیج ڈال کر چھ، چھ مہینے بڑی خاموشی سے انتظار کرتے ہیں۔ فصل پھوٹنے کا۔ آسمان پر بادل دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ برسنے والے ہیں یا ترسانے والے۔ بس شہر والے ہماری سادگی پر ہمیں پینڈو بھی کہتے ہیں اور جنگلی بھی۔ مگر ہمارے انتظار اور مشاہدے کی برابری نہیں کر سکتے۔'' نرگس نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ مومی کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''کیوں گھبرا رہی ہیں آپ۔۔؟'' نرگس نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پتا نہیں مومی کو کیا ہوا۔ وہ ایک دم اس سے لپٹ کر سسک پڑی۔ نرگس بڑے پیار سے اس کو خود سے چپکائے رہی۔

وہ اکیلی تھی۔ یہ بھی اکیلی تھی۔ جب دو تنہا مل جائیں تو پھر ذات میں میلے آباد ہو جاتے ہیں۔ بندہ ہم راز ہو جائے تو بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ محبت کے راز کے کھل جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ محبت کو سند مل جاتی ہے۔ اپنی ذات کا جواز مل جاتا ہے۔ جذبے تصدیق سے، پذیرائی سے جوان ہوتے ہیں۔ اور بدن کی عمارت پر اپنا پھریرا لہرا دیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

''گریز قُرب کی خواہش کا اظہار ہے۔ تنہائی کو ختم کر کے دوئی کی آرزو ہے۔ جب ہم شعوری کوشش کرتے ہیں کسی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی، کسی جذبے، کسی تعلق کی گہرائی سے خوف کھا کے بھاگتے ہیں۔ تو پھر وہ پوری شدتوں سے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ موجودہ دور ذہنی تناؤ کا ہے۔ ایک اُلجھی ہوئی کیفیت جس کو لوگ ڈپریشن کا نام دیتے ہیں۔ پھر اسی ڈپریشن کے زیر اثر بھوک مر جاتی ہے۔ السر ہو جاتا ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ذہن کی گرفت ٹوٹنے لگتی ہے۔ کوئی خود سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ کوئی کسی فرضی مخلوق کے زیر اثر چلا جاتا ہے۔ فضاؤں میں گھورنے لگتا ہے۔ میرے عزیزو۔۔!'' قادری سرکار گفتگو کرتے ہوئے ذرا رُکے اور لوگوں کی طرف دیکھا۔

لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ان کی گفتگو اتنی سادہ، دل نشین اور فرد کی دنیا سے اتنی جڑی ہوئی ہوتی تھی کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ قادری سرکار صرف اسی کے مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔اسی کو حل بتا رہے ہیں۔سب کی نگاہیں، سب کی سماعتیں، سب کے حواس ان ہی سے منسلک تھے۔

''میرے عزیزو!'' انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔''حالانکہ اس سارے معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل سے، پریشانی سے، ذمہ داری سے، اپنے جذبوں سے فرار حاصل کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔اب آپ کا سوال یہ سامنے آئے گا۔کہ اس کا حل کیا ہے؟۔تو عزیزو! اس کا حل بہت سادہ ہے۔محبت، بھروسہ، تسلیم و رضا۔''

''آپ کی اپنے اہل خانہ، بیوی بچوں سے، والدین سے، بہن بھائیوں سے محبت ایسی مضبوط بنیادوں پر ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنا مخلص۔بے لوث، وفادار سمجھیں، اس سے آپ کو بھروسہ حاصل ہوگا۔طاقتور سچی بے ریا محبت، بھروسے کا اساس ہوتی ہے۔اب آپ کو محبت اور بھروسے کی توانائی حاصل ہوگئی، تو آپ اپنے مسئلے کو پوری شدتوں کے ساتھ اس سے جڑے حقائق کے ساتھ تسلیم کر لیجئے۔قرض ہے، محبت ہے، ادھار ہے، ناراضگی ہے، رشتوں کا مسئلہ ہے۔کاروبار کے خسارے ہیں۔دولت کے نقصانات ہیں، جو بھی ہے اس کو تسلیم کر لیجئے۔اب آپ کو تین چیزیں میسر آ گئیں۔اول محبت کہ آپ سب سے محبت کرتے ہیں۔اور آپ کی محبت اور خلوص کے باعث، وہ سب آپ پر بھروسہ کرتے ہیں۔تو پھر آپ کے ساتھ چلیں گے۔پھر مسئلہ سامنے آ گیا۔اس کو جان لیا، تسلیم کر لیا۔اس کی شدت اور کیفیت کا ادراک کر لیا تو مسئلہ تو رہا۔مگر بوجھ نہ رہا۔اب چوتھا بنیادی مرحلہ۔رضا کا۔یہ مسئلہ ہماری حماقتوں، شرارتوں، ضرورتوں، ناعاقبت اندیشی، لالچ، طمع، خوف جس سے پیدا ہوا ہو۔مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم کو، اب اس صورت حال کو، رب کی رضا جان کر، خود کو امتحان اور آزمائش کے لئے تیار کر لینا چاہیے۔اے میرے رب ہر دکھ، ہر پریشانی، ہماری کوتاہی کے باعث ہمارے لئے آزمائش کا سبب بنتی ہے۔ہر خیر و شر تیرے اختیار میں ہے۔ہم اپنی تمام محنتیں، ہمتیں اس مسئلے سے نکلنے کے لئے صرف کریں گے۔ہم ہر اچھے، برے میں تیرے فیصلے کو، تیرے اختیار کو، تیری مصلحتوں کو تسلیم کریں گے۔اور اس سے نمٹنے کی کوشش کریں گے۔الٰہی! اپنے فضل سے ہمیں کامیابی عطا فرما۔۔!''

''آمین۔۔آمین۔ثم آمین۔۔۔!''۔ان کی گفتگو، آخری لفظ، خطاب نا رہے، تقریر نہ رہے، وعظ نہ رہے دُعا میں ڈھل گئے۔بے ساختہ مریدوں، عقیدت مندوں کے دلوں سے آواز کی صورت، طلب کی صورت آمین نکلی۔اے میرے رب! قبول فرما۔اے میرے رب! قبول فرما۔'' قادری سرکار سر جھکا کے خاموش ہو گئے۔

مگر ہر شخص سوچ رہا تھا کہ اس کو اس کی پریشانی کا حل مل گیا ہے۔واقعتاً ڈپریشن ہوتا ہی ہے مسئلے سے فرار ہونے کے باعث۔خودکشی کرنا، بچوں کو قتل کر دینا، نہر میں چھلانگ لگا دینا۔غیرت کے نام پر قتل و غارت، بزنس کے نقصان پر بھاگ جانا یا منہ چھپا لینا، یہ سب کم ہمتی کے باعث ہے، اور کم ہمتی، اکیلے پن سے، گھبرانے سے پیدا ہوتی ہے۔

کئی مرید اور عقیدت مند قادری سرکار کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر، ان کے گھٹنے چھو کر ان سے رخصت کی اجازت طلب کر رہے تھے۔کئی لوگ جوان کے تخت کے پاس قریب کھسک آئے تھے۔اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورے اور راہنمائی کے طالب تھے۔

اچانک کسی نے قدیر کا کندھا ہلایا۔ ''سنیے۔۔!''

''جی۔۔۔!'' قدیر ایک دم چونکا۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔

''آپ تنزیل میاں کے دوست ہیں۔ قدیر بھائی۔؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں مگر آپ۔۔!'' قدیر نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟۔''

''قادری سرکار آپ کو بلا رہے ہیں آپ اندر تشریف لے چلئے۔۔ میں ندیم ہوں سرکار کا خادم۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے مڑ گیا۔

قدیر اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ قدیر کو ندیم نے ایک سادہ سے فرنیچر سے آراستہ کمرے میں بٹھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک اور خادم نمودار ہوا۔ اس نے چائے کی ٹرے اس کے آگے رکھی۔ جس میں بھاپ اڑاتی چائے اور کچھ بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

''سرکار ابھی تشریف لاتے ہیں۔ جب تک آپ چائے پیجئے۔'' خادم نے آہستگی سے کہا۔ اور سر کو خم دیکر رخصت ہو گیا۔ قدیر نے ایک بات محسوس کی کہ یہاں سب بہت نرم لہجے، میٹھے انداز اور دھیرے بات کرتے تھے۔ خانقاہ کے ماحول میں ایک سکون، ایک متحرک سکون کی کیفیت ہوتی تھی۔ ایسا سکون، جس میں بدنظمی کے بجائے ترتیب اور توازن پایا جائے۔ ورنہ بعض اوقات سکون نیم دلی بھی پیدا کرتا ہے۔

اچانک کمرے کا پردہ ہلا، باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ اور دوسرے ہی لمحے قادری سرکار دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ قدیر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو۔۔ بیٹا بیٹھو۔!'' انہوں نے شفقت سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

''تنزیل میاں! بالکل خیریت سے ہیں۔ وہاں ضمنی الیکشن ہو رہا ہے۔ وہ خادم حسین کی انتخابی مہم کی نگرانی کریں گے۔!''

قادری سرکار نے بنا تمہید کہا۔ ''اگر آپ بھی جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ ہم آپ کے لئے گاڑی کا بندوبست کروا دیتے ہیں۔!''

''جی میرا خیال ہے کہ وہ اکیلا ہو گا۔'' قدیر نے کہا۔ ''کبھی وہ گھر سے اتنی دور، اور تنہا نہیں رہا۔ کہیں گھبرا نہ جائے۔'' قدیر کے انداز میں بے حد فکرمندی تھی۔

''تنہائی کا دھیان رکھنا بہت اچھی بات ہے۔'' قادری سرکار نے کہا۔

''جی۔۔!'' قدیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی تائید کی۔ وہ مسکرا دیئے۔

''تم بہت اچھے لڑکے ہو، بہت محنتی، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔!'' انہوں نے کہا۔

قدیر کو حیرت ہوئی۔ قادری سرکار اس کے متعلق کیا جانتے ہیں اور ایسا کیا ہونے والا ہے کہ جس کے لئے وہ اس کو حفاظت کی دعا دے رہے ہیں۔

''ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت طلب کرتے رہنا چاہیے۔'' وہ بولے۔ ''کریم آقا خوش ہوتا ہے کہ اس کا بندہ ہر وقت اس سے بخشش طلب کرتا ہے۔ وہ ایسا دینے والا ہے کہ نہ مانگنے پر خفا ہوتا ہے۔''

اچانک قدیر کو جیسے کوئی خیال آیا۔ ''مانگنا کیوں ضروری ہے؟۔ وہ تو ہماری ہر ضرورت، ہر خواہش سے آگاہ ہے۔ عالم الغیب ہے پھر کیوں چاہتا ہے کہ بندہ اپنی انا توڑ کر اس کے آگے جھک جائے۔ آخر یہ انانیت بھی تو اسی قادر مطلق کی عطا ہے۔!'' قدیر نے اپنا خیال سوال کی صورت میں ان کے آگے رکھ دیا۔

''ہمارے لئے جذبے بہت ضروری ہیں۔ قدیر میاں۔!'' قادری سرکار نے بہت دھیمے سے، اطمینان سے اس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا۔ ''جذبات ہی ہمیں مخلوق میں افضل بناتے ہیں۔ کوئی ہمیں اچانک اچھا لگنے لگتا ہے۔ مگر ہم چپ رہتے ہیں۔ راز دل میں چھپائے رہتے ہیں۔ اور اس طلب میں ہوتے ہیں کہ ہمارے جذبات کی پذیرائی ہو، پھر ہمیں کوئی سراہنے والا مل جاتا ہے۔ ہمیں جونہی اظہار کا اذن ملتا ہے ہم خود کو انتہائی کامیاب و کامران سمجھنے لگتے ہیں۔!''

''جی۔۔۔!'' قدیر کچھ یوں لگا کہ جیسے وہ قادری سرکار کے آگے پرت در پرت کھل رہا ہے۔

''بات ساری اپنائیت اور چاہت کی ہے۔ خدا کی یہ مصلحت ہے کہ ہم اس سے مانگیں۔ کہیں، بار بار کہیں۔ اسے اچھا لگتا ہے کہ اس کی تخلیق بار بار اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اُسے پیار آتا ہے۔ اُس ماں کی طرح، جس کا بچہ اس کی قمیض کا دامن پکڑے، کبھی اس کا آنچل تھام کے، کبھی اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر، ماں۔ ماں کہتے ہوئے ننھے ننھے سے قدموں سے اس کے پیچھے آگے ہو رہا ہو۔ ماں اپنی مصروفیات میں اس کو جھڑک رہی ہے۔ ڈانٹ رہی ہے۔ کبھی جھنجھلاہٹ میں ایک آدھ چپت بھی رسید کر رہی ہے۔ مگر بچہ ہے کہ دو چار منٹ کے لئے رکتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ سے وہی معاملہ شروع کر دیتا ہے۔'' قادری سرکار کے لفظ جیسے منظر کشی کر رہے تھے۔

''کیا دیکھا ہے کبھی یہ منظر۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بالکل۔۔!'' قدیر نے فوراً کہا۔ ''آپ کی بات سے مجھے اپنی بہن کی دو سالہ بیٹی یاد آ گئی، بالکل یہی منظر ہوتا ہے۔''

''تو پھر قدیر میاں۔! خدا ہمیں پیار کی، محبت کی، اظہار کی تربیت دے رہا ہوتا ہے۔''

قادری سرکار نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''بندے کے اندر گہرائی و گیرائی دونوں ہی طلب کرنے، انکار ہونے سے آتی ہیں۔ طلب اس ملمع کو اتار پھینکتی ہے جس کا تعلق عزازیل کی کٹھ حجتی سے تھا۔ اور عطا میں انکار یا دیری سے صبر حاصل ہوتا ہے۔ اور صبر سے ترک کی منزلیں ملتی ہیں۔''

آج قدیر کو پہلی بار احساس ہوا کہ اقبال کے اس شعر کا اصل مفہوم کیا ہے۔ صحبتِ پیر روم سے، مجھ پر ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم نکتہ رس، ایک کلیم سر بکف۔

اس سے پہلے اس کے پاس آنے والے کتنے ہی لوگوں نے علمیت، فلسفے، مغرب کی تحقیق، انسانی سائیکالوجی پر جو کچھ کہا۔ جو

تجزیئے کئے۔ وہ کتنے بودے اور معمولی تھے۔ بے روح الفاظوں کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے۔ علم تو یہاں ہے۔ ٹھہراؤ، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔ جب تک علم کو رضائے الٰہی کی بنیاد پر استوار نہ کیا جائے۔ بھٹکنے کی صد فیصد گنجائش رہتی ہے۔ صرف خدا کی رضا ہی انسان کو عالم بناتی ہے۔ جو کہ علم کا حقیقی منبع ہے۔ پاکیزہ، دلکش سچا اور تحیر آمیز منبع اگر پاکیزہ ہو، تو پھر پانی کی لہریں جہاں تک جائیں گی۔ پاکیزگی ہمراہ ہوگی۔

قادری سرکار کے نرم لہجے کی پھوار سے، ان کے لفظوں سے معنی و مفہوم کا ایک دریا تھا۔ جو سبک خرامی سے اس کو اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''پھر اللہ کو پسند ہے۔ دینا، عطا کرنا۔ دنیا کے حفظِ مراتب کو دیکھ لو۔ باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اولاد کچھ مانگے۔ ماں کی آرزو ہوتی ہے کہ بچے کچھ بولیں۔ عاشق کی آرزو ہوتی ہے کہ محبوب کچھ کہے اور وہ پورا کرنے کے لئے جان لڑا دے۔ شاعر کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اشعار پر کوئی سر دُھنے۔ لکھاری کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے لفظوں کی داد دے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ ہر کوئی اپنا اظہار چاہتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ مختار ہے۔ تخلیق کار ہے۔ منصف ہے۔ عادل ہے۔ کریم ہے۔ احسان کرنے والا ہے۔ پھر ایسے کریم آقا کے آگے جھولی پھیلانا، اس سے طلب کرنا، اس کی خوشنودی کا باعث ہے۔ وہ تو ایسا محبوب، ایسا دلبر، ایسا پیارا ہے۔ جو کہ خود کہہ رہا ہے۔ آؤ مجھ میں سما جاؤ۔ مجھے مانگ لو۔ مجھے محسوس کر لو۔!''

قدیر کے اوپر ہر لفظ ایک نئے مفہوم سے وارد ہو رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ صحبت کتنی ضروری ہے۔ لفظ فقط تشریح ہی کے نہیں، بلکہ جذبے کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ جب تک لفظوں کے مفہوم میں، جذبے کی نرم و گرم آنچ نہ ہو۔ دل نہیں پگھلتے۔

''آپ مجھے بدل دیں گے۔!'' قدیر کو اپنا آپ اجنبی لگنے لگا۔

''بدل دیں گے یا خود کو دریافت کرنے لگو گے۔؟'' ان کا سوال بے حد سادہ مگر پُرکار تھا۔

''معلوم نہیں۔۔!'' قدیر نے گردن جھٹکی۔ ''بہت سارے معاملے روشن ہوئے ہیں۔''

''معاملے تو پہلے بھی تھے۔۔!'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''توجہ اب دی، سمجھنا اب شروع کیا۔''

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔!'' وہ بولا اور پوچھا۔ ''کیا مجھے اجازت ہے۔؟''

''بالکل۔۔!'' وہ مسکرائے۔ ''محبت اور معافی، تعلق اور ٹھہراؤ دونوں میں جبر نہیں۔!''

''کیا میں تنزیل کے پاس جاؤں۔؟'' اس نے سوال کیا۔

''اگر مصروفیت نہ ہو تو چلے جاؤ، زندگی کے کچھ رنگ، کچھ پہلو خبر کی صورت اخبار میں دیکھنے اور پڑھنے کے بجائے خود اس کا حصہ بن جاؤ۔۔!'' انہوں نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد آیا۔'' قدیر نے پوچھا۔ ''اگر گستاخی نہ سمجھیں تو عرض کروں۔۔!''

''کہو۔۔!'' قادری سرکار نے اجازت دے دی۔

''آپ کی پیش گوئی ہے کہ اس ضمنی الیکشن سے موجودسیٹ اپ متاثر ہو جائے گا۔!'' قدیر نے پوچھا۔

''قادری سرکار نے اسے دیکھا اور کہا۔'' حادثہ ایک پل میں نہیں ہوتا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ جب بھی کوئی نظام خلق خدا کی بھلائی نہ کر پائے گا۔ ملکی مفادات کو پس پشت ڈالا جائے گا۔ مملکت خداداد میں اسلام کے حقیقی اغراض و مقاصد سے انحراف کیا جائے گا۔ تو کوئی نہیں بچے گا۔ جب ظلم، ناانصافی، برداشت سے باہر ہو جائے تو قدرت کا اپنا تخلیق کردہ نظام انصاف حرکت میں آجاتا ہے۔ پھر کوئی بھی کمزور لمحہ، کوئی بھی فیصلہ، کوئی بھی ابتداء پورے نظام کو نابود کر دیتی ہے۔ یہ مکافات عمل ہے یا نوشتہ دیوار۔ اب اس سے فرار ناممکن ہے۔!''

وہ بولے اور پھر خاموش ہو گئے۔ ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

قدیر کو ایسا لگا کہ وہ جیسے قضاوقدر کے احکامات سن رہے ہوں۔ اس وقت ان کے چہرے پر کچھ انوکھا تاثر تھا کہ قدیر کچھ محسوس نہ کر سکا۔ سوائے اس کے کہ وہ اس لمحے انہیں تنہا چھوڑ دے۔ وہ آہستہ قدموں سے پلٹ آیا۔

قدیر خانقاہ اس لئے آیا تھا کہ جب تنزیل سے اس کی فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے پوچھا کہ کیا وہ بھی آجائے۔ مگر تنزیل نے جواب دیا کہ قادری سرکار کی اجازت کے بغیر اس کا آنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے وہ قادری سرکار سے اجازت لے، پھر آئے۔ وہ اسی لئے آیا تھا مگر یہاں آکر اب اس کو معلوم ہوا کہ لوگ کیوں ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان کے اندر معنی و مفہوم کے ایسے دریا بہتے ہیں کہ پیاسے جوق در جوق ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ اور پھر جو ایک بار اس چشمے سے ایک گھونٹ بھی پی لے۔ پھر اس کو کسی اور رہٹ کا پانی اچھا نہیں لگتا۔ قدیر نے باہر نکلتے ہوئے تنزیل کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆.....☆

''پولیس آئی ہے۔۔!''۔ غلام حسین نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیوں۔۔؟''

''گھبرانے کی کیا بات ہے۔'' خادم حسین نے کہا۔ ''چل کر دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ اٹھا اور اس نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم لوگوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''جی تھانیدار کہو۔۔ کیا بات ہے۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔

''ہم لوگ ملنے آئے ہیں آپ سے۔۔!'' تھانیدار نے کہا۔ ''کل کے واقعے کے بعد سخت آرڈر آئے ہیں کہ کوئی جلسہ، جلوس بغیر اجازت نہ کیا جائے اور سکیورٹی کے لئے پورا بندوبست کیا جائے۔ آپ لوگ بھی انتخاب میں کھڑے ہو، جلسے، جلوس کے لئے، نفری کے لئے درخواست دے دینا۔ کتنے پولنگ اسٹیشن، کتنے کیمپ لگاؤ گے جی۔۔!'' اس نے پتلا سا بید ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا۔۔؟'' اس کی طویل بات کے جواب میں خادم حسین نے صرف اتنا جواب دیا۔ ''ہم تھانے آکر آپ کو بتا دیں گے۔!''

''ٹھیک ہے۔!'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''ادھر کوئی ٹینٹ شینٹ، بینر شینر، کھانے پینے کا پروگرام نظر نہیں آرہا۔ خیر تو ہے۔ کہیں پیسے

سیٹے لیکر بیٹھنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟۔'' وہ ہنسا۔ایک معنی خیز ہنسی۔جیسے کہہ رہا ہو۔ہم تمہیں سمجھ گئے بچو۔!

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔!'' خادم حسین نے کہا۔''لیکن اِدھر کی کوئی بات تم سے چھپی بھی ہے۔؟'' خادم حسین کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

''آپ تو جی ناراض ہو گئے۔ہمیں کیا پتا کل آپ بھی اسمبلی کے ممبر بن جاؤ۔ہم آپ کا خیال رکھیں گے۔پھر آپ ہمارا خیال رکھنا۔'' اس نے بات بنائی۔اور اچک کر جیپ میں جا بیٹھا۔''چل بھئی شیدے۔۔!'' اس نے پتلا سا بید جیپ کے اسٹیرنگ پر مارا۔اونگھتا ہوا ڈرائیور سپاہی چونک گیا۔اور تیزی سے جیپ آگے بڑھا لے گیا۔اس کے پیچھے پولیس کی بقیہ گاڑیاں بھی دھول اُڑاتی چلی گئیں۔

ہم واپس کمرے میں آ گئے۔اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

''تو یہ بتایئے۔اب آپ لوگ کیا حکمت عملی اختیار کریں گے۔؟''

''آپ پریشان نہ ہوں خلیفہ جی۔!'' حافظ معراج دین نے کہا۔''اب آپ دیکھئے گا کیا ہوتا ہے۔مرشد کی دعائیں ساتھ ہوں تو سوہنا رب بھی مہربان ہو جاتا ہے۔انشاءاللہ اب تو اپنا بچہ ہی جیتے گا۔آپ بس یوں کیجئے کہ یہ خط ہمیں دے دیں۔کتنے ہیں جی۔؟''

''دس ہزار چھپے ہیں۔اگر کم ہیں تو اور منگوالوں۔؟'' میں نے تعداد بتاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جی ٹھیک ہیں۔اس حلقے میں چھوٹی بڑی ملا کر اٹھارہ مساجد ہیں۔ان میں تقسیم کریں گے۔اس سے پہلے تمام امام صاحبان اس موضوع پر تقریر کریں گے۔آپ دیکھئے گا جی کہ ہوتا ہے کیا۔؟'' حافظ صاحب کے اندر جیسے نیا جوش، بے پناہ جذبہ بھر گیا۔

''اور کیا۔۔!'' میاں سلمان نے کہا۔''یہ ایسی کمپین ہوگی کہ جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔''

''ہم سب اس کے لئے جان لڑا دیں گے۔پہلی بار تو مرشد کا حکم آیا ہے۔'' محمد حنیف صحرائی نے کہا۔

بلاشبہ۔۔میں نے سوچا۔ایک ایسی الیکشن کمپین کہ جس میں نہ کوئی کیمپ، نہ کوئی جلسہ، نہ کوئی خطاب، نہ خرچا۔جو دلوں کو فتح کر لے۔وہی فاتح زمانہ۔بہت بچپن کا پڑھا ہوا شعر پتا نہیں کیسے ذہن کے نہاں خانوں سے اچھل کر ذہن کے شعوری حصے میں آ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ خلیفہ جی۔؟'' انہوں نے مجھے مستقل ہی خلیفہ کہنا شروع کر دیا تھا۔میں نے چونک کر دیکھا۔حافظ سلمان میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا شان بے نیازی ہے کہ بے وسیلہ لوگوں کو محبت اور پیار کا وسیلہ عطا کر دیتا ہے، اور صاحب زر و مال کو اپنے تمام کروفر کے ساتھ ایسی جگہ نشانہ بنا دیتا ہے۔جہاں سب اپنے ہوتے ہیں۔مگر بے بس ہوتے ہیں۔''

''یہ اسی بے نیاز کا کرشمہ ہے۔جو چاہے تو مولے کو لڑا دے شاہ باز سے۔۔!'' حنیف صحرائی نے گنگنا کے کہا۔

''آپ لوگوں کو میں نے خط سننے کے بعد گہری فکر میں مبتلا دیکھا تھا۔۔!'' میں نے سوال کیا۔

حافظ سلمان نے میرا سوال سن کر ذرا پہلو بدلا اور پھر کہا۔''خط کے مندرجات میں جو حوالے ہیں ان سے کوئی ذی شعور انکار کر ہی نہیں سکتا۔ہمارے سامنے ایک سوال، ایک خوف ایک لمحے کے لئے نمودار ہوا تھا۔کہ ہم جس کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔کیا وہ ان

معاملات کے دوران ترغیب، لالچ، خوف، عدم اعتمادی کا شکار تو نہیں ہو جائے گا۔ لیکن ابھی جو رویہ اس نے پولیس کے ساتھ رکھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ سرکار کا انتخاب غلط نہیں ہے اور پھر وہ تو جوہری کی نگاہ رکھتے ہیں۔"

"حافظ جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔!" میاں سلمان نے کہا۔ حنیف صحرائی نے بھی سر ہلا کے تائید کی۔

خادم حسین اٹھا اور ان تینوں کے آگے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "یہ سر حاضر ہے۔ یہ جسم حاضر ہے۔ اگر اپنے ارادے سے پھر جاؤں۔ اگر نیت کا کھوٹا پاؤں، تو اللہ کی قسم مجھے اپنے ہاتھوں سے مار کے پھینک دینا۔ کسی مردار جانور کی طرح۔ غدار اور ننگ قوم قرار دیکر میری لاش پر تھوکنا۔ پیشاب کرنا۔ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں مٹی بھی نہ دینا۔ میرا مرنا، جینا سب آپ کے ہی کے لئے ہے۔ یہ میرا قول ہے آپ کو۔۔۔" خادم حسین سخت جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ چہرہ لال بھبھوکا انگارہ ہو رہا تھا۔ نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ گندمی رنگت والی لمبی گردن کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اور بدن میں ایسا کھچاؤ محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ستار کی مانند، ذرا سا چھیڑو گے تو آواز نکل پڑے گی۔۔۔!

آدمی بھی ستار ہی ہوتا ہے۔ ذرا سا انگلیوں کو حرکت دو، ٹونٹیاں کسو تو تار جھنجھنا جاتے ہیں اور آواز چیخ کر نکلتی ہے۔ ارر اراں۔۔۔ تر رراراں راراں۔۔۔ اراں۔۔۔ پھر کہیں جا کر سُر ترتیب میں آتے ہیں۔ راگ تخلیق پاتا ہے۔

"ارے بیٹے ہو تم ہمارے۔!" حافظ سلمان نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ "بھلا ہم تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ پھر بچے ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ لمحے بھر کو خیال آ گیا۔ مگر دیکھو بھروسہ تو تم ہی پر ہے۔!"

"اور کیا۔۔۔!" حنیف صحرائی نے اس کی پشت پر تھپکی دی۔ "ہمیں تم پر فخر ہے۔!"

"سوہنے رب کا شکر ہے۔!" غلام حسین نے بے اختیار اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔ "وہ کتنے سوہنے دل والے یاروں سے ملا دیتا ہے۔"

"یہ سب قادری سرکار کے نظر کرم کا فیضان ہے۔!" حنیف صحرائی نے عقیدت سے کہا۔ "جب وہ کوئی بات کہتے ہیں۔ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت والی بات ہوتی ہے۔۔!"

میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ سب سچے اور کھرے لوگ تھے۔ اپنی بات کو کہنے والے، اپنے باطن کو باہر لا کر بلا کم و کاست بیان کرنے والے۔ مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

"کیا حساب کتاب کر رہے ہو۔!" زینت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

پیر ستارہ شناس جو الماری کے اندر منہ دیئے نجانے کیا کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اس بری طرح چونکا اور بدک کے پیچھے ہٹا کہ اس کا سر الماری کے پٹ سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اور بے ساختہ ایک کراہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

''کیا مصیبت کی طرح نازل ہوتی ہو۔!'' پیر ستارہ شناس نے غصے میں کہا۔ ''کمرے میں دستک دے کر داخل نہیں ہو سکتی ہو کیا۔؟''

''ارے میں تمہاری بیوی ہوں کہ ملازمہ کہ باقاعدہ اجازت لیکر اندر داخل ہوا کروں۔ تم کونسا کسی کو دم کر رہے تھے۔'' زینت نے اسے کرارا سا جواب دیا اور معنی خیز ہنسی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

''تم کبھی نہیں سدھرو گی۔۔۔!''۔ پیر ستارہ شناس نے قدرے جھینپ کر کہا۔ ''اب میں ایسا بھی نہیں ہوں۔!''

''اب اگر ایسا دم بھی کرو گے نا تو دم نکال دوں گی۔!'' اس نے بڑے ٹھسے سے کہا اور بیڈ پر ہچک کر بیٹھی پورا بیڈ لرز کر رہ گیا۔ ''اور ذرا یہ بتاؤ کہ تم میری الماری میں گھسے کیا کر رہے تھے۔؟'' اس کا لہجہ مشکوک سا ہو گیا۔

''میں ذرا اپنے پیسے گن رہا تھا۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''اور یاد رکھو کہ یہ ہماری مشترکہ الماری ہے۔!''

''خیر دی تو میرے باپ نے تھی۔ اب تمہارے پاس تھا کیا۔؟ وہی ایک ٹین کا صندوق جس کو اب بھی تمہاری اماں نے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ شروع شروع میں تو میں سمجھتی تھی کہ شائد تمہاری اماں نے انڈین کلچر کے زیر اثر، تمہارے ابا کا کریا کرم کروا کے اس کی راکھ کو صندوق میں حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔''

''کیا بکواس ہے۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس بھڑک اٹھا۔ ''یہ تم ہر معاملے میں اماں اور پھر مرحوم ابا کو کیوں بیچ میں لے آتی ہو۔ ہر معاملہ کھینچ تان کرا بایا پھر اماں پر ہی جا رکتا ہے۔''

''تمہاری اماں جو ہر وقت تمہارے بیس سال پہلے مرے ہوئے ابا کا ذکر خیر کرتی رہتی ہیں تو تمہیں برا نہیں لگتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ابا مرنے کے بعد بھوت بن کر تمہاری اماں کو چمٹ گئے ہیں۔ اور وہ عذاب بن کر ہم پر مسلط ہو گئی ہیں۔ ستر کے پیٹے میں ہیں۔ مگر اطوار سترہ برس کے، ابھی تک آنکھوں میں کاجل پھیکا نہیں ہونے دیتی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یقین نہ آئے تو جا کر اندر دیکھ لو۔ نارنجی رنگ کا جوڑا پہنے بیٹھی ہیں۔ پوچھا۔ اماں آج یہ ہار سنگھار کس لئے۔ شرما کے کہنے لگیں۔ آج تمہارے ابا یاد آ رہے ہیں۔ رات ہی خواب میں دیکھا۔ بڑے اداس، اداس تھے۔ کہہ رہے تھے۔ زبیدہ تمہاری یاد کی آگ میں جل رہا ہوں۔ دل و بدن میں آگ سی لگی ہے۔ دیکھو تپش سے میرا رنگ کیسا سرخ ہو رہا ہے۔ جوان بچی کے سامنے ایسے بول رہی تھیں۔ سچ میری تو جان ہی جل کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ اماں وہ آپ کی یاد میں نہیں جل رہے تھے۔ بلکہ جہنم کے فرشتے آگ کے سرخ سرخ شعلوں سے ان کو جلا کر عذاب دے رہے تھے۔ اور وہ خواب نہیں تھا۔ سچ تھا۔ لائیو ٹرانسمیشن فرام جہنم۔ اوٹلی فار یو۔۔ آپ کا اگلا اپی سوڈ۔۔۔''

''الو کی پٹھی! میری ماں کے پیچھے ہی پڑی رہتی ہے۔!'' پیر ستارہ شناس نے اپنا منقش کھسہ کھینچ کر اس کو مارا۔ زینت نے بڑی صفائی سے فضا میں ہاتھ بلند کر کے پکڑ لیا۔

''تم بھی بڈھے ہو گئے ہو۔!'' اس نے پیر ستارہ شناس کا کھسہ اس کو گود میں پھینک دیا۔ ''ذرا سی دیر میں بلڈ پریشر ہائی کر لیتے ہو۔!''

''بڈھا کہاں ہوا ہوں۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''یہ سب شوگر کے مسائل ہیں۔ مگر اب تو دوا کھا رہا ہوں۔ شوگر کنٹرول میں ہے۔ اور اعصاب بھی۔!''

''اونہہ۔۔۔!'' زینت نے منہ بنایا۔ ''اُسی منڈی بہاؤالدین والے حکیم کی باتوں میں آ کر الٹا سیدھا کچھ نہ کھا لینا۔ دو مقدمے چل رہے ہیں اس کے اوپر، اُسی کے مریضوں کے۔ طاقت کی دوائی کھانے کے چکر میں گردوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب ڈائیلائسس پر ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا۔۔!'' پیر ستارہ شناس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''اس کی بیوی نے بتایا تھا۔!'' زینت نے مسکرا کے کہا۔ ''ایک دن میں نے اس جعلی حکیم سے کہا کہ ذرا ایک منٹ کے لئے فون دیجئے گا۔ وہ کم بخت جانے کیا سمجھا۔ فون مجھے پکڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ بھابھی آپ کے لئے، ساری عمر کے لئے فون حاضر ہے۔ ایک منٹ کے لئے کیا؟۔ میں نے کہا روزانہ پانچ سو روپے کا کارڈ لوڈ کرواتی ہوں۔ میرا سارا میکہ دوبئی میں ہے۔ اس میں تو ٹوٹل چالیس روپے کا بیلنس ہے۔ بری طرح کھسیا کے رہ گیا۔''

''اس کمینے کی یہ جرأت۔'' پیر ستارہ شناس پھر بھڑکا۔

''ارے رہنے دو یہ ڈرامے کی بہادری۔۔!'' زینت ہاتھ نچا کر بولی۔ ''پیٹ کی بھوک، اور نیت کی خرابی منہ پر لکھی ہوتی ہے۔ یہ ہم عورتیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو خود سے باندھ کر رکھتی ہیں۔ عہد وفا کی نظر نہ آنے والی زنجیروں سے۔ جو مرد کی بے وفائی اور موت دونوں سے نہیں ٹوٹتی ہیں۔ سنا نہیں۔ عورت رُکے تو رُکے اپنے آپ سے۔۔ نہ رُکے تو نہ رُکے باپ سے۔!''

پیر ستارہ شناس منہ پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''حکیم کی بیوی بڑی بھلی عورت ہے۔ میں نے بات کی تو رونے لگی۔ وہی بے تکا حال، پوری دنیا کا علاج کرتا ہے اور خود بھائی کا لڑکا لیکر پال رہا ہے۔ کہنے لگی! بہن کیا تم بھی میرا گھر خراب کرو گی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا کیا۔ تم سمجھتی ہو کہ تم نے گھر بنا لیا۔؟ یا دو اجنبی ایک مکان میں رشتوں کی مجبوری نبھا رہے ہیں۔ اور ویسے بھی تمہارے میاں میں ہے کیا۔؟ جو میں اس کو پھانسوں گی۔ اگر ایسا خوف ہے تو میں اپنے میاں کا نمبر ایس ایم ایس کر دیتی ہوں۔ تم بھی جواباً میرے میاں پر ڈورے ڈال لینا۔ مگر نتیجہ نہ نکلنے کا۔ تیرا موٹا میاں ہاتھی کی طرح ایک جگہ کھڑا جھولتا رہتا ہے۔ اور میرا مرغ کی طرح پر پھیلا کر دو چار قدم ہی دوڑتا ہے۔ پوچھنے لگی۔ بہن تم کیوں جڑی ہوئی اس کے ساتھ۔ میں نے کہا۔ جس بیماری میں تم مبتلا ہو یہی میرا مرض بھی ہے۔ مجھے اس کم بخت سے محبت ہے۔ اور تمہیں اس کمینے کی چاہ۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہاں یاد آیا۔ ''اللہ ملائی جوڑی۔۔۔ ایک اندھا ایک کوڑھی۔!'' زینت ہنسی۔

پیر ستارہ شناس اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہنسنے لگا۔

''خدا کی قسم تم آج تک نہیں بدلیں۔ بالکل ویسی کی ویسی ہو۔ جیسے پہلے تھیں۔ شعلہ سا۔ پٹاخہ جیسی۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''تمہاری گفتگو ہی تو مجھے لے ڈوبی۔'' وہ بولا۔ ''کیسی کیسی باتیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم شہری لڑکی نے مجھ جیسے معمولی پڑھے

لکھے پینڈو کے لئے کتنی بڑی قربانی دی۔"

"ارے چھوڑو جی۔!" زینت محجوب سی ہوگئی۔ "نجانے کیا بات تھی کہ بس۔۔۔شائد اسی کو تو کہتے ہیں قسمت کا ملنا، جوڑوں کا بننا۔۔خیر چھوڑو یہ بتاؤ چائے پیو گے بناؤں۔!"

"ارے چائے وائے چھوڑو۔تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔؟"

"ہاں کہو۔۔!" زینت اس کے قریب کھسک آئی۔

پیر ستارہ شناس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم جانتی ہو نا میری برسوں کی آرزو کو، جس کے لئے میں نجانے کب سے ترس رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔وہ اب پوری ہوگئی ہے۔۔۔!"

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

اپنی اپنی خواہشات کی گندگی میں لتھیڑ دیا

''ہاں میں جانتی ہوں۔!'' زینت نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟۔''

''مجھے ڈھیری مل گئی ہے۔!'' وہ ہیجان آمیز لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں شوق، جذبہ، لالچ جیسا امتزاج تھا۔ جب ہم اکیلے میں، یا کسی اپنے آپ پر عیاں شخص کے سامنے اپنے خواب پورا ہونے کا بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ تو باہر کے چھلکے کو توڑ کر اپنے اندر سے باہر نکل آتے ہیں۔ چٹختے ہوئے، ٹھنکتے ہوئے بچوں کی طرح۔ سارا ملمع اتر جاتا ہے۔ ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا کے مصداق''۔

''ڈھیری۔؟'' زینت نے حیرت آمیز سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''کونسی ڈھیری۔۔ یہ کیا ہوتی ہے۔۔؟''

''ارے تجھے ہر بات کھول، کھول کے سمجھانے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔'' وہ چڑ گیا۔ ''اتنے برس ہو گئے مگر کچھ ہمارے دھندے کو جان کر نہ دیا۔''

''مجھے تمہارے کاموں سے کیا۔ اچھا کرو، برا کرو۔ اپنی قبر میں خود ہی جاؤ گے۔ میرا کیا؟۔''

''اچھا۔ یہ سب جو کماتا ہوں۔ تو کیا سوچ کر کھا لیتی ہے من من بھر اناج، یہ زرق برق کپڑے، یہ بچے اور ان کے خرچ۔'' وہ بری طرح بھنا گیا۔ ''قبر میں جاؤ گے۔''

''دیکھو میاں جی۔!'' زینت نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''شادی تم نے مجھ سے اپنی مرضی سے کی۔ بچے اپنی مرضی سے پیدا کروائے۔ جب ذمہ داریاں لی ہیں تو پورا تو خود ہی کرنا تھا۔ ہمارے اوپر کیا احسان جتاتے ہو؟۔ یہ جو پیری مریدی کا رعب ہے نا یہ گھر سے باہر جھاڑنا۔ ہم سے دین کی باتیں اگر کرو گے، تو پھر سنو گے بھی دین کی باتیں۔'' اس کا انداز خاصا مضحکہ اڑانے والا تھا۔ ہر لفظ کہہ رہا تھا کہ وہ پیر ستارہ شناس کی ہر رگ سے اچھی طرح واقف ہے۔

''تم نے مجھے کہاں الجھا دیا۔ کوئی خوشی کی بات کرو تو اس میں بھی کھنڈت ڈال دیتی ہو۔!'' وہ دفعتاً صلح جو ہو گیا۔ ''اتنی جلدی ناراض نہ ہوا کرو۔!''

''تم بھی پاجامے میں رہا کرو۔!'' زینت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اچھا بابا معاف کرو۔!'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''تم ڈھیری کا کہہ رہے تھے۔'' زینت نے بات ختم کرتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''اصل میں ہمارے ہاں ڈھیری سے مراد ایسی قبر ہوتی ہے۔ جس میں مردہ تو ہوتا ہے مگر کون ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔ بعض لوگ خود ہی بے نام قبروں کو معتبر بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جن کی نہ کوئی تاریخ ہوتی ہے۔ نہ کوئی حقیقی سلسلہ، یا صاحب علم و کرامت شخصیت، بس مفروضوں پر عمارت کھڑی کر کے کرامات گھڑ لی جاتی ہیں۔ جبکہ مزار شریف، دربار وہ ہوتے ہیں جو کہ باقاعدہ سلسلوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ جن میں صاحب مزار معروف شخصیت ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت داتا گنج بخشؒ۔ حضرت لعل شہباز قلندر سیہون شریف والے۔ تین ہٹی والے بابا نور شاہ شہید۔ کلفٹن والے غازی بابا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگیاں تبلیغ دین کے لئے وقف ہو گئیں اور پھر جب انہوں نے پردہ فرمایا تو ان کے مزارات مرجع خلائق ہو گئے۔'' پیر ستارہ شناس نے تفصیل سے بتایا۔ پھر ذرا رک کے بولا۔ ''یہ تو میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔ دراصل مجھے درگاہ حضرت میاں مل گئی ہے۔''

''وہ درگاہ۔!'' مارے حیرت کے زینت کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

''ہاں ہاں وہی درگاہ۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''تمہیں کیسے مل گئی۔!'' زینت نے پوچھا۔ ''وہ تو بہت بڑی ہے درگاہ ہے۔ ہر وقت زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ نذرانے، چندے، چادریں، دیگیں کیا، کیا نہیں ہوتا وہاں۔؟''

''ہاں۔!'' پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں بے پناہ روشنی تھی۔ ''کیا کیا نہیں ہوتا وہاں۔ رحمتیں برکتیں، روپیہ پیسہ، رعب، دبدبہ۔ بس ایک یہی تو کمی تھی۔''

''چھوڑو جی۔ تم میں کیا کمی ہے بھلا۔؟'' زینت کا لہجہ محبت سے بھرا تھا۔

''زینت سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔ کوئی دینی خاندان نہیں، ہم لوگ تو دو سو برس پہلے مسلمان بھی نہیں تھے۔ پتا نہیں کس نیک بخت شخص نے ہمارے پرکھوں کو کلمہ پڑھا کے مسلمان کیا۔ اللہ اس کی قبر ٹھنڈی رکھے۔ ہماری ساری مسلمانی ختنے اور کلمے تک ہی محدود رہ گئی ہے۔ سچی پوچھو تو دین تو سراسر خیر ہے۔ بھلائی ہے۔ معصومیت ہے۔ پیار ہے۔ ہم نے تو اس کو اپنی اپنی خواہشات کی گندگی میں لتھیڑ دیا ہے۔ خدا اور بندے کے بیچ راستہ روک کر بیٹھ گئے ہیں۔ بندے ہمیں خدا سے قریب سمجھتے ہیں۔ ہمیں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ ہمارے لئے سر وقد کھڑے رہتے ہیں۔ مگر ہم کیا ہیں۔؟ گندے گھناؤنے!'' پیر ستارہ شناس کا لہجہ تاسف سے بھرپور تھا۔ بعض اوقات اندر کا سچ باہر آنے لگتا ہے۔ خواہ یہ کیفیت وقتی ہی کیوں نہ ہو۔!

''یہ درگاہ کیسے ملی۔؟'' زینت نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے ذریعے۔'' پیر ستارہ شناس نے بتایا۔ ''اس کے ذریعے محکمے سے ہمیں ٹھیکہ مل جائے گا۔''

''مگر ٹھیکہ تو سالانہ ہوگا۔ بس صرف ایک سال کے لئے۔؟'' زینت نے سوال کیا۔

''ارے نہیں نیک بخت۔!'' پیر ستارہ شناس نے اسے سمجھایا۔ ''بس ایک بار سرکاری طور پر ٹھیکہ مل جائے تو پھر سجادہ نشینی بھی مل

جائے گی۔ سجادہ نشینی کی ذمہ داری تو خود پیر جہانگیر شاہ نے اٹھالی ہے۔!"

"وہ تو جی بڑے سید ہیں۔" زینت نے عقیدت سے کہا۔ "سید تو بادشاہ ہیں ہمارے پیارے۔ ہماری نجات۔!"

پیر ستارہ شناس نے بے ساختہ ایک قہقہہ مارا اور ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے تمہیں کیا ہوا۔؟ پاگل ہو گئے ہو کیا۔؟" زینت نے الجھ کر پوچھا۔

"میں تمہاری عقیدت پر ہنس رہا ہوں۔!"

"بری بات ہے۔!" زینت نے اسے گھرکا۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے۔!"

"میں تمہاری عقیدت پر نہیں، بلکہ جہانگیر شاہ سے عقیدت کی بات پر ہنس رہا ہوں۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ وہ ہمیں اپنا بنا رہے ہیں۔ عنقریب ہم بھی گداسے شاہ ہو جائیں گے۔!"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔؟"

"وہ ہمیں شجرہ بنا کر دے رہے ہیں۔" پیر ستارہ شناس نے کہا "ہم بھی کچھ سے کچھ ہو جائیں گے باضابطہ طور پر۔"

"توبہ کرو جی توبہ۔" زینت نے گھبرا کے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔!"

"جب انہیں نہیں آتی تو ہمیں کیا آئے گی۔" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "قبضہ گروپ جب کروڑوں کی پراپرٹی کو ہزاروں میں فروخت کرتا ہے۔ تو اس کو کچھ نہ کچھ آ رہا ہوتا ہے۔ بلکہ سارا کا سارا۔ اس لئے کہ اس کا کچھ اس میں لگا ہی نہیں ہوتا۔ زینت بیگم جو نام و نسب بیچتے ہیں۔ وہ اصل میں خود بے اصل ہوتے ہیں۔"

"توبہ کیوں بادشاہوں پر شک کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔" زینت نے کہا۔ اس کا رواں رواں سیدوں کی محبت میں، آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔ "دین و دنیا ان ہی کے دم سے ہے۔!"

"سچ کہہ رہی ہو۔" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "ہماری نجات آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ خالی خولی سیدوں سے نہیں۔ سید تو اب ریڈی میڈ بن رہے ہیں۔"

"بس کفر بکے جاتے ہو چپ کرو۔!" زینت نے گھبرا کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

پیر ستارہ شناس چپ ہو گیا۔ اس نے سیدوں کو دیکھا ہے۔ کیا بتاتا اس کو؟ سادہ اور محبت سے بھری عورت کو۔ سید تو وہ ہوتے ہیں کہ جن کے روئیں روئیں سے خوشبوئیں آتی ہیں۔ جن کے چہرے پر نور ہوتا ہے۔ آنکھوں میں ایک نرالی جوت۔ جو کچھ نہ کہیں۔ کچھ نہ بولیں۔ صرف اپنے وجود کی برکت سے ہی ماحول بدل دیں۔ اور اگر دعا دیں تو زندگی کو سنوار دیں۔ ایک ایسے ہی سید ملے تھے اسے۔ آج وہ جو بھی کچھ تھا انہی سید کی برکت سے تھا۔ وہ تو تقسیم کی لہر بہر ہوتے ہیں۔ سوکھے کو سیراب کر دیتے ہیں۔ اور پھر خدا بھی کتنا پیار کرتا ہے ان سے۔ اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت جو ہیں۔ خود ہی تخلیق کیا۔ خود ہی سجایا، بنایا۔ اور پھر خود ہی عاشق ہو گیا۔ جن کا رب آپ

عاشق ہو۔تو اِن کا کیا کہنا۔پھر ان کی ذریت کے درجات کا کیا کہنا۔سچے اور کھرے لوگ ان ہی سے تو ڈھلتے ہیں۔پھر ان کی تربیت سے ذرہ آفتاب، کرن مہتاب ہو جاتے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہو۔!''۔زینت نے اسے ٹہوکا دیا۔

پیر ستارہ شناس چونک گیا۔''کیا کہہ رہی ہو۔؟''

''میں پوچھ رہی ہوں۔کہاں کھو گئے۔ابھی سے سجادہ نشینی کی لذت میں گم ہو گئے۔''زینت ہنسی۔''مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ ٹھیکہ ملے گا کیسے؟اور خرچا وغیرہ کہاں سے ہوگا۔؟''

''پچاس ساٹھ لاکھ کا خرچا ہے۔''پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''پچاس، ساٹھ لاکھ کا خرچا۔!''زینت یوں اچھلی۔مانو اس کو بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔''اتنے پیسے ہم کہاں سے لائیں گے۔؟''اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

''کیوں اس میں مشکل کیا ہے۔؟''پیر ستارہ شناس نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔''اللہ میاں کے لئے سبب پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر ہم کہاں کے ایسے خاص کہ وہ ہم پر ایسا کرم کرے۔ہم گناہگار پاجی لوگ۔!''

''اچھا پہلے کیوں نا بتایا۔؟''پیر ستارہ شناس نے کہا۔''بلاوجہ تمہارے ساتھ ہوں۔کہیں اللہ ناراض ہوا تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائیں گے۔''

''پیر جی میں نے، ہم گناہگار، پاجی لوگ کہا ہے۔جمع کے صیغے میں۔''زینت چیخ کر بولی۔''دھوکے باز، مکار، فریبی کی سزا تو کہیں زیادہ ہوتی ہے اور وہ فقط تو۔تنہا تو۔''زینت بھلا کب پیچھے رہنے والی تھی۔

پیر ستارہ شناس ہنسنے لگا۔''ارے باولی ہوئی ہے کیا۔اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔اس نے ایسا سبب بنایا کہ سبحان اللہ۔!''

''اچھا تو کافی معرکے سر کئے ہیں تم نے آجکل۔!''زینت نے کہا۔''اب بتاؤ گے یا یونہی اشتیاق بڑھا بڑھا کر جان نکال لو گے۔؟''

''کافی عرصے سے درگاہ کی تلاش میں تھا۔''پیر ستارہ شناس نے بتانا شروع کیا۔''پیر جہانگیر شاہ کے علاوہ یہ ممکن نہیں تھا۔مگر وہ پیسے کے بغیر پلہ بھی نہیں پکڑاتے، ٹال دیتے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں ایک مرید کا ایک کام اللہ نے ایسے بنا دیا کہ وہ بے پناہ خوش ہو گیا۔اس نے پانچ لاکھ روپے دیئے۔سچی جانو!تو میں نے پہلی بار کسی مرید سے اتنا بڑا نذرانہ وصول کیا۔میں نے سوچا یہ تو ادھر ادھر خرچے ہو جائیں گے۔کیوں نہ ان سے کوئی مستقل باعزت ٹھکانہ ڈھونڈھ لوں۔وہ پیسے لیکر سیدھا پیر جہانگیر کے پاس چلا گیا۔پھر وہاں تو معجزہ ہی ہو گیا۔''وہ کہتے کہتے رکا۔

''کیا معجزہ۔!'' زینت سے لمحاتی صبر بھی نہ ہوسکا۔ ''بتاؤ بھی۔!''

''بتا تو رہا ہو بابا، سانس تو لینے دیا کرو۔!'' وہ مصنوعی غصے سے بولا۔ ''وہاں ملک ریاض بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا مشہور صنعت کار ہے۔ نیا نیا سیاست میں داخل ہوا ہے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ ہم تو چہرے ہی پڑھتے ہیں نا۔'' وہ ہنسا۔ پھر بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہاں بیٹھے بیٹھے تعارف ہوگیا۔ مجھے کہنے لگا کہ اگر سچ مچ پیر ہیں تو کوئی فوری کرامت دکھائیں کہ میں مان جاؤں۔!''

میں نے پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہیں۔؟''

کہنے لگا۔ ''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی مان جائیں۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کر دیں تو آپ کو مان جاؤں گا۔!''

میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ ہوگیا تو کیا کرو گے۔؟''

وہ بولا۔ ''پھر دیکھئے گا کہ میں آپ کے لئے کیا کرتا ہوں۔؟''

میں نے اسی لمحے ایک تعویز لکھا اس کی ماں کے نام کے ساتھ اور کہا کہ اس کو کس کے مٹھی میں دبا لے الٹے ہاتھ کی، جب تک جہانگیر شاہ مانے نہیں اس کو خوب بھینچ کر رکھنا۔ وہ تعویز لیکر اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں جلدی میں ہوں یہ میرا کارڈ ہے لے لیں۔ اس پر میرے گھر کا پتا لکھا ہے۔ میں گھر پر کسی سے نہیں ملتا مگر آپ رات میں آئیں کھانے پر باتیں کریں گے۔!''

''واہ۔! تمہارا تعویز پیر جہانگیر شاہ ہمدانی پر چل گیا۔؟'' زینت نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں پڑھ لکھ کر جاہلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''سارا انسانی نفسیات کا کھیل ہے۔!''

''کیا مطلب۔؟'' زینت نے پوچھا۔

''ارے بھلی لوگ ئے۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''پیر جہانگیر شاہ ہمدانی ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو کسی کو مفت میں اپنا بخار بھی نہ دیں۔ ملک ریاض جیسا ارب پتی صنعت کار بندہ، جب پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے پاس آئے گا تو وہ پھر خالی ہاتھ تو نہ آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا لفافہ تھا۔ مجھے اس میں پانچ ہزار کے نوٹوں کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ کروڑ سے کم تو نہیں ہونگے۔ بعد میں اس نے بتایا بھی کہ اس نے پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو دو کروڑ روپے کی نذر دی ہے۔!''

''دو کروڑ روپے کی نذر۔!'' زینت کی آنکھیں پھٹ پڑنے کو ہوگئیں۔ ''اس کے سامنے تمہارے پانچ لاکھ کی کیا اوقات ہو گی۔؟''

''وہی جو دو کروڑ کی ہوتی ہے زینت بیگم۔ نوٹ کی مالیت یکساں ہوتی ہے۔ پانچ ہزار کی ڈھیری میں دس کا نوٹ دس کا ہی ہوتا ہے۔ نو روپے کا نہیں ہو جاتا۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔'' زینت نے آہستگی سے کہا۔

''شام کو میں ملک ریاض کی کوٹھی پہنچا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ بنا تمہید بولا۔ پیر جی! اگر میرا ایک کام کردو تو جو کہو گے کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ کل دن کے بارہ بجے سے پہلے ہو جائے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے بتایئے پھر کچھ جواب دوں گا۔!''

وہ بولا۔ ''رائما کو جانتے ہو۔!''

میں نے کہا۔ ''کون نہیں جانتا اس پری چہرہ، غارت گر ایمان کو، کیا ہوا اس کو، اس پر جن آتے ہیں یا بھوت۔ اب کوئی نہیں، ہم آئیں گے۔''

وہ بولا۔ ''ہم نہیں میں آؤں گا۔ اگر وہ میرے ساتھ ہفتے بھر کے یوکے ٹرپ کو مان جائے تو میں تمہیں مان جاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''جو صبح مانا تھا وہ بھول گئے۔''

''صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ میں تو صبح بھی نہیں بھولا تھا۔ اب شام بھی نہیں بھولا۔'' وہ ہنسا۔ کہنے لگا۔ ''بڑی تیز و طرار ہے قابو میں نہیں آتی۔ کہتی ہے میں ایسی ویسی نہیں۔ باعزت ہوں۔ ایسی ہی شرم والی ہے تو گھر میں بیٹھے، اسکرین پر کا ہے کو جلوے دکھاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دل جلانا چھوڑ دو! تمہارا یہ کام تو چٹکیوں میں ہو جائے گا۔ مگر بیچ میں اس نامہ بر کو کیا ملے گا۔؟''

کہنے لگا۔ ''کیا چاہتے ہو۔؟''

میں نے بتایا۔ ''مجھے درگاہ حضرت میاں کے لئے ایک کروڑ روپے چاہیے ہیں۔ تم میرا کام کرو، میں تمہارا کام کروں گا۔''

وہ بولا۔ ''اگر نہ ہوا تو۔؟''

میں نے کہا۔ ''گردن اتار لینا۔ مگر میری ایک شرط ہے نقد مال لوں گا۔ فون تو وہ آج ہی کر دے گی۔ اس کا پتہ دو، اس کے لئے کوئی تحفہ شحفہ ہے تو مجھے دو، اپنی گاڑی میں کوچۂ جاناں کی طرف بھیجو۔ جو دراصل جائے ملامت ہے۔ مگر سمجھ داروں کے لئے۔ عاشقوں اور پاگلوں کے لئے جائے خرچ۔''

وہ ہنسا اور اٹھا۔ دراز سے ایک ڈبہ نکالا۔ اور بولا۔ ''یہ ہیروں کا ایک سیٹ ہے۔ اس کی سالگرہ پر دینے کے لئے لایا تھا۔ اگر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہو جاتی۔''

میں نے کہا۔ ''لاؤ میں راضی کر دیتا ہوں۔ مگر میرے پیسے۔؟''

وہ بولا۔ ''یہ بھی لو!'' اس نے ایک دراز کھولی۔ اس میں سے پانچ ہزار کے نوٹوں کی دس گڈیاں نکال کے مجھے دیں۔ اور کہا'' جاؤ۔!'' اس کے ساتھ ہی بیل بجا کر ایک نحس صورت آدمی کو بلایا۔ اور بولا۔ ''اس کی منحنی قد و قامت پر نہ جانا۔ اس کا نشانہ بڑا اچھا ہے۔ پرندے کو ایک گولی سے چھیدتا ہے۔ تم تو اس کے ساتھ ہی ہو گے۔ فراڈ کرو گے تو پھر یاد رکھنا۔ کھوپڑی میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ

ہو جائے گا۔ خواہ تمہیں آکسیجن کی ضرورت بھی نہ رہے۔ ویسے بھی پیر جی! مردے آکسیجن لیتے ہیں کیا۔؟"

میں نے کہا۔ "ملک مجھے ان چیزوں سے نہ ڈراؤ۔ ہم بے ایمانی پر آجائیں تو یہی پیسہ تم روزانہ صبح و شام حاضر ہو کر ہمیں نذر میں پیش کرو۔ مگر ہم لات مارتے ہیں اس پر۔ بلایا تم نے تھا۔ ہم بغیر بلائے نہیں جاتے۔ کام تم نے دیکھ لیا۔ اب کام کراؤ گے تو پیسے پورے ہونگے ورنہ یہ طمنچہ اور یہ چمچہ دونوں ہی جہنم رسید کر دوں گا گھر بیٹھے بیٹھے۔ ایسی مٹی پڑھکر پھونکوں گا کہ لاکھ کا خاک ہو جائے گا۔ ساری عمر کے لئے کوڑھی ہو جاؤ گے۔ پیروں سے الجھ لینا، مگر عاملوں کے منہ نہ لگنا۔ پیر تو بس دعا کرتے ہیں۔ ہم عمل کرتے ہیں۔ دل میں بھی آگ لگاتے ہیں اور پانی میں بھی۔ تم جیسے نوکری کرتے ہیں ہماری۔" میں نے اس کے ہار کے ڈبے پر تھوکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ملک ریاض سے پہلے اس کا موت کا ہرکارہ میرے قدموں میں گر پڑا۔ کہنے لگا۔ "پیر جی غصہ تھوک دیں۔ صاحب کو مذاق کی عادت ہے۔ معاف کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "مذاق تو ہم برداشت کر لیتے ہیں مگر توہین نہیں۔ اس میں سراسر توہین ہے ہماری۔"

ملک ریاض نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور بولا۔ "یار پیر جی تم سے دل مل گیا ہے۔ اس لئے ذرا مذاق کر لیا۔ تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ چلو غصہ تھوک دو۔"

میں نے کہا۔ "چلو غصہ تھوکا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بیش قیمت قالین پر تھوکا۔ اور کنکھیوں سے اس کو دیکھا۔ اس نے برا تو منایا مگر بولا نہیں ڈر گیا تھا۔

"وہ تم سے ڈر گیا تھا۔؟" زینت نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔!" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "غلط کام کرنے والا ہر بندہ ڈرتا ہے۔ یہ ارب پتی سیدھے سبھاؤ نہیں بنتے۔ کچلتے ہوئے، پیستے ہوئے، طاقتور، روڈ رولر کی طرح آگے بڑھتے ہیں، کام نکالنے کے لئے۔ طاقت کو منوانے کیلئے، لوگوں کو مار دینا ان کو مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسلسل کام، ضمیر کی لچک اور خوف سے اعصابی دباؤ میں آجاتے ہیں۔ اور پھر کوئی ان سے مرعوب نہ ہو تو یہ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ وہ تو ملک ریاض کی وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ وہاں تو بولنا ہی بہادری تھی زینت بیگم۔ سارا کھیل اعصاب کا ہوتا ہے۔ جس کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں وہ جیت لیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔؟" زینت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔

"پھر ہوا یوں کہ میں رائما کے گھر پہنچا۔ وہ مجھے پہلے سے جانتی ہے۔ وہ ہے نا اخبار نویس ابراہیم نوید۔ اس نے ملوایا تھا ایک بار مجھ سے۔ پانچ سات برس پہلے کی بات ہے۔ پھر اس کی فلم کا مسئلہ تھا۔ پھر اس کے ایک امریکی عشق کا مسئلہ تھا۔ بیچ میں ہم دو چار بار ملے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہو گئی۔ چائے پی کر میں نے پوچھا کہ وہ ملک ریاض سے کیوں ناراض ہے۔ وہ بولی۔

"میں کیوں ناراض رہنے لگی۔ مگر آدمی وہ گھٹیا ہے۔ دینے کے بعد چیزیں گناتا ہے۔ مجھے رخشی نے بتایا ہے۔" اس نے ایک اور

مشہور و معروف ماڈل کا نام لیا۔ ''پھر ایسے گھٹیا آدمی سے دوستی کا کیا فائدہ؟۔ کیوں پیر جی!''

مگر میں نے اس کو فائدے بتائے اور یہ بھی بتایا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔

وہ بولی ''وہ اتنا الو ہے۔؟''

میں نے کہا۔ ''وہ اس سے بڑا الو ہے۔ مگر مشرق میں ہے۔ اس لئے بے سپاس ہے۔ اگر مغرب میں ہوتا تو عقل و دانش کا نشان ہوتا۔ چلو میری مانو اس کو فون کر دو۔ یہ ہیروں کا ہار رکھ لو۔ یہ فرہاد جیولرز والوں کا ہے۔ ان کی معمولی چیزوں کی ابتداء بھی پانچ لاکھ سے ہوتی ہے۔ کم از کم یہ سیٹ چالیس پچاس لاکھ کا تو ہوگا۔ چلو اس سے رابطہ کرو۔ آدمی گھٹیا، خسیس اور کمینہ ہے تو کیا ہوا۔ چیزیں تو گھٹیا نہیں؟۔''

''ٹھیک کہتے ہیں پیر جی!۔'' وہ بولی اور اپنے بلیک بیری پر اس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ ''ذرا جلاؤں۔ ستاؤں؟''

میں نے کہا۔ ''جو چاہے تمہارا حسن کرشمہ ساز کرے۔''

وہ بولی۔ ''ہم ناز و ادا کی کھاتے ہیں۔ آپ باتیں بناتے ہیں اور حالِ دل اگلوا لیتے ہیں۔''

''ہیلو۔۔!'' دوسری طرف سے سلسلہ بحال ہوتے ہی وہ بولی۔۔ ''یہ کیا کیا آپ نے۔ کس کو بھیج دیا پتا نہیں انہوں نے کیا کیا، میرے دل میں ایک آگ سی جل اٹھی ہے۔'' وہ ہنسی دوسری طرف سے کوئی بات سن کر۔

''نہیں جی! ہم تو پیر جی کے تابع ہیں۔ وہ تو کہیں ہم گٹر میں چھلانگ لگا دیں جی۔!'' اس نے جان بوجھ کر دریا یا آگ کے بجائے گٹر کا لفظ استعمال کیا۔ دوسری طرف سے قہقہہ آیا۔ رائما نے اسپیکر آن کر دیا۔

''تو۔۔ کب چل رہی ہو میرے ساتھ۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو کئی ہفتے لگیں گے۔''

''کیوں۔؟'' وہ بے تاب ہو گیا۔

''اصل میں آپ کو تو پتا ہی ہے۔ آجکل فلم تو بند ہو گئی ہے۔ صرف انڈسٹری چل رہی ہے۔ چاروں طرف مندا ہے۔ اچھے دنوں میں ایک کوٹھی کا سودا کیا تھا ڈھائی کروڑ میں۔ ایک کروڑ دے دیا تھا اب ڈیڑھ کروڑ کے لئے ذلیل ہوتی پھر رہی ہوں۔ غنی صاحب سے کہا تو انہوں نے حامی بھر لی۔ مگر اب پندرہ دن سے ملک سے باہر ہیں۔'' اس نے ایک مشہور انڈسٹریلسٹ کا نام لیا۔

''جہنم میں ڈالو اس کو۔'' ملک ریاض نے کہا۔

''چلیں جہنم میں ڈال دیا۔ مگر کوٹھی کہاں ڈالوں۔؟''

''ارے ہم کیا مر گئے ہیں۔ میں تمہیں ابھی چیک بھجوا دیتا ہوں ڈیڑھ کروڑ کا۔۔''

''لو جی! ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک۔ پھر ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں گے۔ مگر کھائیں گے کیا؟۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ گھومنے چلی جاؤں۔ یہ پیسہ کوٹھی میں لگا دوں تو پھر پیٹ کی دوزخ کس سے

بھروں۔ کمر شلز سے تو بجلی کا بل بھی نہیں نکلتا۔"

"اچھا۔!" ملک ریاض نے کہا۔

"چھوڑیں ملک جی! یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ ہم غریبوں کو کون منہ لگاتا ہے۔" راحما نے بیک وقت دو طرفہ حملہ کیا۔ ایک

[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"وہ ہار بھول گئی ہو لیا۔!" میں نے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تم میں کیا نذر کرو گی!" میں نے پوچھا۔

"ملک ریاض کو نچوڑا نہیں؟" وہ ہنسی اور بولی۔ "پیر، وکیل اور طوائف جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کا کچھ نہیں رہتا۔"

میں نے جواب دیا۔ "صحیح کہتی ہو مگر اپنے الائنس کے ہر رکن کا خیال رکھنا چاہیے۔"

میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔ "بہت خوب پیر جی! اچھا الائنس بنایا۔ اگر یہ الائنس ووٹ مانگنے جائے تو کیا ووٹ نہیں ملے گا؟"

میں نے کہا۔ "ووٹ تو نہیں! البتہ ناکام عاشقوں، مقدمہ ہارنے والے موکلوں اور ہمارے مریدوں کی آہیں معہ جوتے پھٹکار ہمیں لے ڈوبیں گی۔"

وہ بولی۔ "میں ایک انکشاف کر رہی ہوں۔ جب تک معاشرہ ہم حقیقتوں کو قبول نہیں کرے گا۔ چوری چھپے خون دیتا رہے گا۔ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "جو جیسے چل رہا ہے اس کو ویسا ہی چلنے دو۔ طوفان کے بعد جب گرد و غبار بیٹھتا ہے۔ تو چیزیں آہستہ آہستہ اپنے مقام پر خود ہی آ جاتی ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت بلاوجہ مشقت میں پڑنے کی، اس قوم کو مہذب بنانے کی!"

دفعتاً زینت کے حلق سے قہقہے کا فوارہ چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا۔؟" پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔

"میں یہ سوچ سوچ کر ہنس رہی ہوں کہ تم جیسے لوگ ہماری قوم کو مہذب بنانے کا بیڑہ اٹھائیں گے؟"

"حالات اپنے تو بہتر بنانے کا بیڑہ اٹھائیں گے اور بنانا بھی شروع کر دیا۔" پیر ستارہ شناس نے کہا۔ "ذرا الماری میں سر ڈال کر تو دیکھو۔!"

''وہاں کیا ہے۔؟'' زینت نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''اوکھلی میں سر ڈالتے ہی موسلوں کی بہار نہیں ہونے کی۔ نہ ہی اندر سانپ بچھو ہیں جو تمہیں ڈس لیں گے۔''

''ارے میں ڈرتی نہیں ہوں جو تم ساز ہر سہہ لے اس کو سانپ بچھو کیا کہیں۔؟'' وہ ہنسی اور اٹھ کر الماری کے خانے کے اندر جھانکا۔ پھر اسے کچھ نظر نہیں آیا تو پھر کپڑے ہٹا کر اندر دیکھا۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔!'' وہ جیسے چیخی۔

''آہستہ بولو۔۔۔کیوں چیخ و پکار کر رہی ہو۔؟'' پیر ستارہ شناس نے اسے ہلکی آواز میں ڈانٹا۔

''یہ۔۔یہ۔۔۔سب جو تم کہہ رہے تھے واقعی سچ تھا۔؟'' زینت نوٹوں کی گڈیوں کو سلیقے سے سجا دیکھ کر بولی۔

''الو کی پٹھی۔!'' پیر ستارہ شناس کو سخت تاسف ہوا۔ ''تو کیا میں اتنی دیر سے بکواس کر رہا تھا۔ ہذیان بک رہا تھا۔ کیا سمجھا تم نے۔؟''

زینت بس اندر ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ پیر ستارہ شناس بھی کچھ نہ بولا تھا۔

جب وہ نوٹوں کی گڈیوں کو لیکر گھر آیا تھا تو اس پر بھی شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی۔ ابھی تو اس نے اس چیک کے متعلق نہیں بتایا تھا جو ملک ریاض نے اسے دیا تھا پچاس لاکھ کا چیک۔ وہ زینت کو آہستہ آہستہ بتانا چاہتا تھا تاکہ زینت ہر بات کو برداشت کرتی جائے۔

☆.....☆.....☆

ساری حویلی بھری ہوئی تھی۔ دور، دور سے وزیر، مشیر، سیاستدان، صنعت کار، دوست، ملنے والے تعزیت کے لئے آ رہے تھے اور سب ہی بے حد دکھ سے ان کے اس غم میں شریک ہو رہے تھے۔ موت انسان کو چوکنا کر دیتی ہے۔ بدل دیتی ہے۔ تعلق، محبت، رشتے، اعتبار ہر چیز بدل دیتی ہے۔ خود بدلنے والے انسان کو بھی یقین نہیں آتا کہ وہ کیوں بدل رہا ہے۔ مگر جن حقیقتوں کے باعث وہ بدلتا ہے۔ وہ اتنی اٹل ہوتی ہیں کہ انہیں جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔

شاہ ہارون گیلانی بھائی کی موت کے چند ہی گھنٹوں کے بعد بدل گئے تھے۔ اور اس لمحے سے تو وہ بالکل ہی بدل گئے تھے جب انہوں نے اظہر صدیقی کے ساتھ ڈیل کی تھی۔ طاقت، اختیار کی سب سے اعلیٰ ترین صورت عہدہ ہے۔ اور عہدہ بھی وہ حرف آخر کہ جس کے بعد کوئی حد و حساب نہ رہے۔ ان کی نظر میں پچاس کروڑ ایسے ہی تھے جیسے کہ پچاس لاکھ۔ انہیں ہر ماہ پیسہ کہاں سے، کیا کیا، کتنا آتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ پاکستان میں ان کی کئی معروف غیر ملکی برانڈز کی چین میں سرمایہ کاری تھی۔ جو ہر ماہ اتنے انڈے بچے دیتی تھی کہ منافع ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر پاکستان سے باہر دوبئی اور سعودی عرب میں انہوں نے سرمایہ کاری کی تھی۔ جرمنی میں ان کی بہت جائیداد تھی۔ اور سب کرائے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس طرح امریکا میں انہوں نے کرایہ داری میں ہی سرمایہ کاری کی تھی۔ وہ بنکوں کی نیلام ہونے والی سفید

پوش لوگوں کی پراپرٹی خرید لیتے تھے جو انہیں سنبھالنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ پھر ان عمارتوں کو مناسب سرمایہ کاری کر کے ہوٹل یا پھر ہوسٹلز میں تبدیل کر دیتے تھے۔ یوں چند سالوں میں بلڈنگ اصل لوٹا دیتی تھی اور وہ نفع میں بلڈنگ کے مالک بھی رہتے تھے۔ ماہانہ کہیں سے پونڈز، کہیں سے یورو، کہیں سے درھم، کہیں سے ریال اور کہیں سے ڈالر آ رہے تھے۔ اور یہ رقم بھی شاہ ہارون گیلانی کے پاکستان اکاؤنٹس کے بجائے سوئس بنکوں میں، یا امریکی بنکوں میں جمع ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ایک ایسی سرمایہ کاری بھی کی تھی۔ جس کا خاص خاص لوگوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا۔ انہوں نے سوئزرلینڈ میں ایک فرم قائم کی تھی۔ جس کے زیرِ انتظام وہ ایک بنک کو ڈیل کرتے تھے۔ سوئس میں یہ بنک اچھے درجے میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں پاکستان کے نامور صنعت کاروں، اعلیٰ افسران اور زمین داروں کے اکاؤنٹس تھے۔ انکے ان اکاؤنٹس کو لینے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ سوئزرلینڈ سے ایک نمائندہ خاتون ٹوریسٹ بن کر آتی وہ خاموشی سے ان کو کچھ نام فراہم کر دیتے۔ وہ ان لوگوں سے مل لیتی اور اکاؤنٹس مل جاتے۔ پاکستانی اشرافیہ گوری چمڑی سے ویسے ہی مرعوب ہے۔ جب وہ رازداری سے انہیں بتاتی کہ وہ کون ہے اور ان کے اکاؤنٹس ہولڈرز میں کیسی کیسی شخصیات شامل ہیں تو وہ اعتماد کر لیتے۔ ہر ماہ خاموشی سے اربوں روپیہ ڈالر میں تبدیل ہو کر بیرون ملک غائب ہو جاتا۔ ارباب اختیار کبھی اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ پاکستان میں کھلی مارکیٹ میں کثرت سے ڈالر خریدنے والے لوگ کون ہیں۔ اور کیوں خرید رہے ہیں۔ وہ اس لئے بھی توجہ نہیں دیتے تھے کہ وہ خود اس ریکٹ کا حصہ تھے۔ بڑے سرکاری اور غیر سرکارے اداروں کے سرخیل اس معاملے میں شامل تھے۔

دولت چاروں طرف سے آ رہی تھی اور بھنور کی طرح شاہ ہارون گیلانی کے گرداب میں ڈوب رہی تھی۔ شاہ ہارون گیلانی اب وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے۔ ان کی پارٹی میں شامل ہونے کے پہلے ہی دن سے خواہش تھی کہ وہ اس دوڑ میں نمبرون ہونگے۔ لیکن کمال کا ضبط رکھتے تھے۔ کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی، کئی بار سیاسی معاملات میں اتار چڑھاؤ آیا۔ پارٹی پر شدید برا وقت بھی آیا۔ مگر ان کی طرف سے یہ بات کبھی سامنے نہیں آئی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پارٹی سربراہ سے انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ خدمت کے لئے ہیں۔ اگر وہ کہیں گے تو وہ پبلک الیکشن تو کیا پارٹی الیکشن میں بھی حصہ نہیں لیں گے۔ انہیں صرف اپنے لوگوں سے پیار ہے۔ اس حکمت عملی نے انہیں پارٹی ورکرز میں بہت احترام دیا تھا۔ تقریباً پچیس برسوں میں کوئی پارٹی رکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شاہ ہارون گیلانی کو کسی بڑے سے بڑے عہدے کا معمولی سا بھی لالچ ہے۔ مگر ان کی دولت، ان کا مقام، علاقے میں ان کی اہمیت، ان کے خاندان کی سیاسی قوت ایسی تھی کہ وہ کبھی بھی نظر انداز کئے نہ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی خواہش دوسروں کے ذریعے اتنے سہل طریقے سے منظر عام پر لاتے کہ ہر شخص اس خواہش کو اپنی خواہش جان کر پورا کرنے پر کمربستہ ہو جاتا۔

اور اب تو عوامی ہمدردی کا ایک سیلاب ان کے لئے اُمڈ رہا تھا۔ انہوں نے اس ملک کی خاطر اپنے بھائی کی جان قربان کی تھی۔ اپنا سگا بھتیجا، اپنا ہونے والا داماد داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور پھر ملک کا سب سے بڑا نیوز چینل آئندہ وزیراعظم کے طور پر ان کو پیش کر رہا تھا۔ تمام تجزیے، تمام تبصرے غیر محسوس طور پر ان کی شخصیت کو اُبھار رہے تھے۔ ان کی پارٹی کے سربراہ کا انہیں کئی بار فون آ چکا تھا۔ وہ ان

سے تعزیت کے لئے آنا چاہتے تھے مگر وہ سیکورٹی کا بہانہ بنا کر انہیں روک رہے تھے۔ وزیراعظم کا فون انہیں آیا وہ بھی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔

''نہیں سر۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ آپ کی جان ہم سب سے زیادہ قیمتی ہے دہشت گردوں، تخریب کاروں، خودکش حملہ آوروں کا کیا پتہ کہاں سے نمودار ہو جائیں۔ اندھی گولی کھانے والے کا نام تو جانتی ہے مگر چلانے والے کو کب ظاہر کرتی ہے۔ میری جان آپ پر قربان۔''

انہوں نے بے پناہ تسلی اور دلاسوں کے ساتھ انہیں آنے سے روک دیا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن میں حالات ٹھیک ہوتے ہی آنا چاہوں گا۔'' وزیراعظم نے کہا۔

''بالکل سر! یہ آپ کا گھر، آپ کا ہی علاقہ ہے۔ بھلا میری جرأت کہ میں آپ کے استقبال سے انکاری ہوں۔'' ان کے لہجے میں مرجانے والا خلوص جھلک رہا تھا۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وزیراعظم نے فاتحانہ انداز میں پارٹی سربراہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے تھے۔ آپ نے سنا ہارون گیلانی کے انداز میں کس قدر نرمی، انکساری اور جانثاری موجود تھی۔ آج تک ان کی طرف سے کبھی کسی عہدے کا مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ کیا یہ ان کی وفاداری اور لاغرضی کا ثبوت نہیں۔؟''

''بات تو ٹھیک ہے!۔ لیکن جو کچھ میڈیا کہہ رہا ہے اس کا پس منظر ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔'' پارٹی سربراہ نے جواب دیا۔

ہماری انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق گذشتہ ایک ہفتے سے ہارون گیلانی کی کسی میڈیا پرسن، اینکر پرسن، یا میڈیا اونر سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ گذشتہ ایک ہفتے میں ان کی کوئی نئی میڈیا بریفنگ بھی سامنے نہیں آئی ہے۔ میڈیا یونہی چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا رہا ہے۔''

''مانا کہ تم بڑے اچھے سیاسی کارکن رہے ہو۔ لیکن ابھی سیاست کے جوڑ توڑ سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ میڈیا کوئی بھی اینگل بلاوجہ تبدیل نہیں کرتا۔ بہرحال تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ سردار حیات اللہ بھی سخت ناراض ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بے پر کی کون اڑا رہا ہے۔ کیا پارٹی پر ہماری گرفت ختم ہوتی جا رہی ہے۔'' پارٹی سربراہ نے بڑے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور سامنے میز پر اپنے پاؤں پھیلا دیئے۔

شاہ ہارون گیلانی نے اپنے میڈیا ایڈوائزر کی طرف غور سے دیکھا۔ مسکرائے اور پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں، میں پارٹی سربراہ اور وزیراعظم کو یہاں آنے سے کیوں روک رہا ہوں۔؟''

''سیکوریٹی کی وجہ سے۔!'' اس نے جواب دیا۔

''سیکوریٹی کا کیا مطلب ہے۔؟''

''ان کی حفاظت کا معاملہ۔''

''اور وہ رک گئے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ''جو اپنی سیکوریٹی کا بہت زیادہ خیال کرے اور حفاظتی اقدامات کو سب سے اولیت دے وہ کون ہوتا ہے۔؟''

''کمال کر دیا سر۔!'' احمد اورنگ زیب اٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''جو صرف حفاظتی اقدامات پر غور کرتا رہے۔ اس کا ایمان تو کمزور ہوتا ہی ہے۔ عرف عام میں اس کو ڈرپوک بھی کہتے ہیں۔ آپ نے اپنی حکمت عملی سے پارٹی سربراہ اور وزیراعظم کو اخلاقی اعتبار سے بدتر ثابت کر دیا۔''

''اور یہ بات کس کو بتانی چاہیے۔!'' شاہ ہارون گیلانی کو اپنا یہ بچہ بہت پسند تھا۔

ان کی بات کی تہہ تک اتر کر، سمجھ کر ان سے آگے کے معاملات کو سنبھالنے والا۔ شاہ ہارون گیلانی صرف لائن دیتے تھے۔ باقی کام وہ خود سنبھال لیتا تھا۔ ذہین اور فطین احمد اورنگ زیب اٹھا اور ٹہلتا ہوا حویلی کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔ جہاں کام کرنے والوں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ خالی پڑا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا۔ سم بدلی اور اظہر صدیقی کے نمبر پش کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

اپنی بے نیازی کا رُعب جمانا چاہتا تھا

''ہیلو۔۔اسلام علیکم۔!'' احمد اورنگ زیب نے سلسلہ ملتے ہی کہا۔

''وعلیکم السلام۔!'' اظہر صدیقی نے ایک لمحے میں اسکی آواز پہچان لی۔ ''کہو کیا خبر ہے۔؟''

''پارٹی سربراہ اور وزیراعظم صاحب سیکورٹی کے مسائل کے باعث تعزیت کے لئے نہیں آپا رہے ہیں۔اپنے اس ساتھی اور پارٹی راہ نما کے پاس، جوان کے لئے فنانس کا انتظام بھی کرتا ہے۔اور جس کے بھائی نے اپنی جان کی قربانی بھی دی ہے۔ہم بے خوف و خطر علاقے میں موجود ہیں۔لوگوں سے مل رہے ہیں۔ملاقاتیں چل رہی ہیں۔لوگ آجا رہے ہیں۔مگر ہماری اعلیٰ قیادت بزدلوں کی طرح اپنے مرکز سے باہر نہیں نکل رہی ہے۔۔۔''

''[illegible] ہے۔آج ہی سے دیکھ لینا۔لائیو پروگرامز کا انداز ہی بدل جائے گا۔''

''[illegible] اور فون بند کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔وہ اکثر اس جگہ کو فون کے [illegible] نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔بس پارٹی کا ایک خوف زدہ چہرہ سامنے [illegible] انہیں سامنے ہی نظر آرہا تھا۔شاہ ہارون گیلانی۔ایسا شخص جس نے کبھی [illegible]

☆.....☆.....☆

[illegible] سچ تنہا ہو گیا ہے۔اتنا اکیلا، اداس، اور بے آسرا تو اس نے اس وقت [illegible] اپنی ماں سے بہت محبت تھی، مگر حقیقت میں وہ باپ سے بہت قریب تھا اور [illegible] ہاتھا کہ جس سے وہ اپنا حال دل کہہ سکتا۔دونوں بہنیں آگئی تھیں۔ان [illegible] سب خالی، بے روح لگ رہا تھا۔

[illegible] اعتبار کا پل صراط کتنا نازک، کتنا مشکل ہوتا ہے۔یہ اس کو آج معلوم [illegible] ؟اس کو اب معلوم ہو رہا تھا۔شروع شروع میں جب اس کو اس مکروہ، [illegible] کاش ایسا نہ ہوتا۔کاش اس کو پاپا کا فون ملا ہی نہ ہوتا۔مگر ہمارے کاش [illegible] نے حقائق کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔چیزوں کو ایک ایک کر کے پرکھا۔تو

پھر اس نے فیصلہ کرلیا۔ کہ شاہ کو شہ مات دینے کا۔ رنج کا خوگر ہو تو مٹ جاتا ہے رنج۔ سیاسی خاندان کے خون میں رچی سیاست خود بخود یوں تیر کر اوپر آ گئی جیسے ضرورت پڑنے پر شارک سانس لینے سطح سمندر پر ابھر آتی ہے۔ سب سے پہلے مجھے خود کو مرتب کرنا چاہئے۔ اپنے ٹکڑے جوڑنے چاہئیں۔ اس نے اپنی زندگی کا پہلا اور تنہا مضبوط فیصلہ کیا۔ پھر اس کی مشکلیں آسان ہونے لگیں۔ شاہ سکندر گیلانی کے دفن کے ٹھیک دوسرے دن اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ تمام بدلے لینے کا۔ احتساب کرنے کا۔ مگر اس کے باوجود وہ بے سکون تھا۔ مجھے تھوڑا سا سکون چاہیے۔ وہ مجھے اس ماحول سے باہر ہی مل سکتا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ فرحان یعقوب سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست سے جو اس کے ساتھ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹا تھا۔

وہ باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ بالا آ گیا۔

''چھوٹے سرکار کہاں جا رہے ہیں۔؟'' اس نے آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں ذرا شہر جا رہا تھا۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''اکیلے ہی جا رہے ہیں ان حالات میں۔!'' بالے نے تشویش ظاہر کی۔

''اب تو اکیلے ہی ہیں۔!''

''اللہ نہ کرے کہ جی آپ اکیلے ہوں۔ ہم سب ہیں آپ کے جانثار، آپ کے خادم، آپ کے غلام۔!''

''اچھا۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی مسکرایا۔ ایک زخم آلود مسکراہٹ۔

''آپ بیٹھیں۔۔ میں چلاتا ہوں گاڑی۔!'' بالے نے ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ شاہ نے چابی اسے پکڑا دی۔ اس نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا۔ عبداللہ شاہ بیٹھ گیا۔ وہ دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ ان کا رخ شہر کی طرف تھا۔

''کسی سے ملنے جا رہے ہیں یا یونہی گھومیں پھریں گے۔!'' بالے نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''فرحان یعقوب کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ آیا تھا میرے ساتھ ہی واپس، اس کا فون آیا تھا۔ وہ آنا چاہ رہا تھا۔ پر میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا ذرا باہر نکل کے خود مل آؤں۔!'' عبداللہ شاہ نے بتایا۔

''آپ بہت نرم دل ہو۔ بہت پیارے۔!'' بالے نے کہا۔ ''بہت چھوٹے تھے آپ تب بھی آپ سارے بچوں میں الگ تھے۔ نرم سے، دھیمے سے، کبھی لڑائی نہیں، غصہ نہیں۔!''

''تمہیں یاد ہے میرا بچپن۔!'' عبداللہ شاہ کی دلچسپی عود کر آئی۔ اسے اچھا لگا کہ کوئی پاپا کے علاوہ بھی اسکے بچپن کا گواہ ہے۔

''کیوں نہیں یاد ہوتا جی۔!'' بالا پہلی بار ہنسا۔ ''آپ تو اتنے پیارے سے، موہنے سے تھے کہ بے ساختہ آپ پر پیار آ جاتا تھا۔ بڑے شاہ جی بس آپ کے ساتھ بچہ بنے رہتے تھے۔ سارے بچوں میں آپ سب سے مختلف تھے۔ پھر جب ایک بار آپ سیڑھیوں سے پھسل گئے تھے۔ تو اس وقت میں اور بڑے شاہ جی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ میرے لاکھ کہنے کے باوجود بڑے شاہ جی نے آپ

کوایک لمحے کے لئے بھی گود سے نہیں اتارا تھا۔ وہ تو دیوانے تھے آپ کے۔'' بالے کی آنکھوں میں بچپن کے مناظر گھومنے لگے۔

عبداللہ شاہ گیلانی کا حلق نمکین ہو گیا۔

''جب آپ پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ تب وہ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ بہت دیر تک آپ کے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ آپ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔!''

''تمہیں کیوں اچھا لگتا تھا۔؟'' عبداللہ شاہ نے پوچھا۔

''مجھے تو جی اپنے ماں، باپ نہیں یاد۔ ہوش سنبھالا تو آپ ہی لوگوں کو، بڑے شاہ جی کو، شاہ جی کو ہی اپنا سب کچھ پایا۔ تعلیم بھی آپ ہی لوگوں کے سکول سے پائی۔ پر بندے کے دل میں پیاس تو ہوتی ہے نا جی۔ پیار کی۔'' بالے نے کہا۔

آدمی اندر سے کتنا دکھی، کتنا اکیلا، اور کس قدر طلب گار ہے۔ عبداللہ شاہ نے سوچا۔

''کس طرف جانا ہے جی۔!'' اس نے چونک کر دیکھا۔ بالا ڈیفنس کے مین بلیوارڈ پر کھڑا تھا۔

اس نے اسٹریٹ نمبر اور گھر کا نمبر بتایا۔ بالا نے اسی طرف اسٹیرنگ موڑ دیا۔ چند ہی منٹوں میں وہ فرحان یعقوب کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ ابھی اس نے کار کا اطلاعی ہارن ہی دیا تھا کہ بڑے گیٹ کے ساتھ چھوٹا گیٹ کھلا اور اس میں سے فرحان یعقوب باہر نکلا۔ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' فرحان یعقوب نے کہا اور اس سے گلے ملا۔ عبداللہ شاہ کو بہت اچھا لگا۔ اس کی گرمجوشی۔ اس کا تپاک۔

''گاڑی اندر لے آؤ۔!'' اس نے بالے کو اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں گن مین نے آ کر بڑا گیٹ کھول دیا۔ بالا گاڑی وسیع پورچ میں لے گیا اور فرحان یعقوب، عبداللہ شاہ گیلانی کا ہاتھ پکڑے پکڑے اس کو اندرونی حصے کی جانب لے گیا۔

وہ سیدھے ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ جہاں کھانے کی وسیع و عریض میز چنی ہوئی تھی۔ ''آؤ بیٹھو۔!'' فرحان یعقوب نے ایک کرسی آگے کی۔ وہ بیٹھ گیا۔ فرحان یعقوب اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''چلو شروع کرو۔۔۔!''

''اتنا سارا اہتمام۔؟'' عبداللہ شاہ حیران تھا۔ ''یہ تو درجنوں افراد کے لئے بنوالیا۔!''

''اصل میں ہم لوگ وہاں اتنے عرصے اکھٹا رہے۔ ہمیشہ تم نے میرا خیال رکھا۔ مجھے تو، تمہاری کوئی پسند معلوم ہی نہیں کہ تم کیا کھاتے ہو؟ کیا پیتے ہو؟ کیا پسند کرتے ہو؟ اس لئے میں نے کہا، کئی چیزیں بنا دو ان میں سے کوئی نا کوئی چیز تو تمہیں پسند آئے گی۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

اس نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے متعلق۔ بڑے شاہ جی کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ یہ بھی دلداری کا، دل دہی کا ایک انداز ہوتا ہے کہ دوسرے کو آپ کے تمام دکھوں کا اندازہ ہو۔ لیکن صرف عمل سے، ورنہ بار بار دکھوں کا پرسا دیتے رہنے سے، زخموں پر کبھی کھرنڈ نہیں آتا۔ لوگ بڑی محبت سے دکھ بانٹتے ہوئے بھی دکھوں کو دہراتے رہتے ہیں۔

''اتنا خیال رکھ رہے ہو میرا۔؟'' عبداللہ شاہ مسکرایا۔

محبت کا بدلہ، محبت کے سوا کیا ہے۔؟ تم نے وہاں ہوسٹل میں، پڑھنے کے دوران میرا کیسا کیسا ساتھ دیا۔ دیار غیر میں تو لوگ اپنوں کو بھول جاتے ہیں۔ تم نے تو سچ مچ دوستی کا حق نبھایا۔'' فرحان یعقوب نے دھیمے سے کہا۔

''یار میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' عبداللہ شاہ کو عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ تو بس ہر ایک کے کام آنے کی پرخلوص کوشش کرتا تھا۔ اس نے بعض معاملات میں فرحان یعقوب کو سپورٹ کیا تھا۔

''تم بہت بدل گئے ہو۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ اور ونگز کا ایک پیس منہ میں ڈالا۔

''ہاں جب نیناں نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ عورت پر بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ شراب بھی شروع کر دی تھی۔ ان دنوں ہی، تو تم نے مجھے سنبھالا تھا۔ میرے دکھوں کو سمجھا تھا۔ پھر ایک دن مجھے ایک پیر کا نمبر ملا۔ میں نے سوچا نیناں کو اس کی بے وفائی کی کڑی سے کڑی سزا ملے۔ وہ پاگل ہو جائے، دیوانی ہو جائے، کتے کی طرح میرے پیچھے دم ہلاتی رہے۔ میں نے سنا تھا کہ پیروں کے پاس ایسے عملیات ہوتے ہیں۔ جو کسی کا کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس عملیاتی طاقتیں ہوتی ہیں۔ جنہیں موکل کہتے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا اور اپنی حالت سنائی۔ یار میں لگاتار آدھے گھنٹے بولتا رہا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی میری بات نہیں کاٹی۔ اطمینان سے، تحمل سے میری بات سنتے رہے۔ پھر آخر میں بولے۔

''بیٹے آپ کو ایک مشورہ دوں۔؟''

''جی۔۔!'' میں بے تاب تھا۔ کسی بھی صورت انتقام لینے کو۔

''لالچ ترک کر دیجئے۔'' انہوں نے سکون سے کہا۔

''کیا۔۔۔؟ سچ پوچھو تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرے ہزاروں ڈالر کھا گئی۔ حالانکہ میں نے اسے انگلی بھی نہیں لگائی۔ ورنہ یہاں تو دس ڈالر میں مل جاتی ہیں۔!''

''جب ہی تو کہہ رہے ہیں بیٹے کہ لالچ ترک کر دیں۔ آپ کو ناکامی کا صدمہ ہے۔ ہزاروں ڈالر کا صدمہ ہے۔ اس کے بدن کو نہ برتنے کا صدمہ ہے۔ اس میں محبت کہاں ہے؟ محبت تو بے ریا، بے مطلب ہوتی ہے۔ کسی سے کچھ حاصل کرنے کا نام محبت نہیں ہوتا۔ تجارت ہوتا ہے۔! جس محبت میں وفا کی ذرا بھی طلب ہو تو وہ محبت نہیں رہتی، لالچ بن جاتی ہے۔ لالچ ترک کر دیں سکون آ جائے گا۔'' فرحان یعقوب خاموش ہو گیا۔

عبداللہ شاہ حیرت سے چمچہ تھامے اس کی گفتگو سنتا رہا۔

وہ پھر بولا۔ ''یار اس وقت تو میں نے غصے میں فون بند کر دیا اور پھر۔۔! اور پھر آہستہ آہستہ مجھے ان کی بات کی سچائی کا احساس ہونے لگا۔ واقعی میری محبت پاکیزہ تو نہ تھی۔ سچ مچ اس میں لالچ تھا۔ نیناں بہت خوبصورت تھی۔ میرے سارے دوست رشک کرتے تھے۔ یار اتنی خوبصورت لڑکی تیرے ساتھ ہے اور میں اس کو ہمیشہ ہی شوکرواتا تھا کہ مجھے تمہارے بدن کی طلب نہیں۔ مگر میں اندر سے،

خوابوں میں جو کچھ چاہتا تھا۔ وہ وہی تھا۔ جو ہر نوجوان سوچتا تھا۔ مگر میں اس پر اپنی بے نیازی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ میری محبت واقعتاً لالچ ہی تھی اور مجھے انہوں نے جذبات کا احترام سکھایا۔ احساسات کی تفہیم کرنا سکھائی۔ وہ تمام پیروں سے بہت مختلف ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی شفیق باپ، خیال رکھنے والا باپ، بھروسہ دینے والی ماں ہوں۔ یار بعض لوگوں سے کس قدر رشتے جڑ جاتے ہیں۔!''

وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پھر چونک کر بولا۔ ''ارے میں نے تو تمہیں اپنی باتوں میں الجھا لیا۔ کچھ کھاؤ تو سہی۔!''

''کھا تو رہا ہوں۔۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ اور چائے کا کپ اپنی طرف سرکایا۔

''تو پھر تم نے ان سے رابطہ تو رکھا ہوگا۔؟''

''ہاں بالکل۔ پاکستان آ کر سب سے پہلے ان ہی سے ملا۔ بہت اچھا لگا۔ انہوں نے اتنے غیر محسوس طریقے سے مجھے بدل دیا کہ خود بھی حیرت ہوتی ہے۔!''

''وہ تو مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ وہ لاابالی، غصہ ور، چلبلا فرحان یعقوب جو پل میں تولہ، پل میں ماشہ ہو جاتا تھا۔ بدل گیا ہے۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔

''یار تم بھی ان سے ملو۔ میں وہاں جاؤں گا تمہیں لیکر تمہیں اچھا لگے گا۔!'' فرحان یعقوب نے کہا۔

''کب جاؤ گے۔۔؟''

''تھوڑی دیر میں، ان کا درس شروع ہونے والا ہے۔'' فرحان یعقوب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں درس دیتے۔ مگر یار اس میں بھی دریا کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ دیکھنا کیسے کیسے لوگ ان کے سامنے سر تسلیم خم کئے دیتے ہیں۔!'' فرحان یعقوب پُر جوش ہو گیا۔

عبداللہ شاہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ پھر اٹھ کر فرحان یعقوب کے کمرے میں آ گئے۔ ڈھیر ساری گفتگو۔ پرانی باتیں۔

☆.....☆.....☆

''دوستو! زندگی بہت پیاری بہت مختصر ہے۔ اس کو ہم اپنی منصوبہ بندی سے، اپنی خواہشات سے، اپنے مفادات سے مشکل اور پیچیدہ بنا لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی، جیسے کوئی خوش ذائقہ شربت کو بڑھانے کے چکر میں مسلسل اس میں پانی کا اضافہ کرتا جائے۔ اور یاد رکھئے۔! طلب کو، آرزو کو خالص رکھئے۔ بے طمع آدمی سکون میں رہتا ہے۔ لالچ انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ حرص اور ہوس انسان کو رشتوں سے، تعلق سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انسان کے پیٹ کے گڑھے کو قبر کا گڑھا ہی بھرتا ہے۔ پیسے بچے دیتے ہیں۔ پہلے انسان اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ پھر یہ بڑھتے ہیں اور انسان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان قدریں ترک کر دیتا ہے۔ احکاماتِ الٰہی کو پسِ پشت

ڈال دیتا ہے۔ مال کی طلب اور حرص نے تمہیں غفلت میں مبتلا کر دیا۔ تم نے اپنے دینی فرائض اور اخلاقی اوصاف کو تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ تم قبر رسیدہ ہو گئے۔ اور پھر وہ بدن جس کو بڑے پیار سے، لوگوں کا حق مار مار کر پروان چڑھایا، سب سے پہلے یہی پیٹ پھٹے گا۔ جسے تم نے ہر رشتے کو کچل کر، ہر تعلق کو بھسم کر کے بھرا۔ اور پھر معلوم ہو گا کہ اللہ کا وعدہ کیسا ہوتا ہے۔ اور یہ تمہیں معلوم ہو کر رہے گا۔ جس کو نظر انداز کر کے، جھٹلا کے، تم نے شرف انسانیت کی توہین کی۔ کیوں کہ ہمارے احکامات، ہماری تعلیمات، ہمارے بندے کی سعی کو تم نے نہ مانا۔ بلکہ اپنے طرز عمل سے جھٹلا دیا۔ اور علم رکھنے کے باوجود تم نے اپنے آپ کو ضائع کر دیا اور اب تم ضرور دوزخ میں جاؤ گے۔ اس دوزخ کا حصہ بنو گے۔ جس کو تم نے جاننے کے باوجود نظر انداز کیا۔ اور اب تم سے ان تمام نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔ جو تم کو ہم نے دیں۔'' ان کے لہجے میں بے پناہ جلال تھا۔ وہ جلال جو رب اپنے بندوں کو اس وقت عطا کرتا ہے۔ جب ان سے اپنی مخلوق کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ تمام لوگ، مریدین، عقیدت مند ساکت ان کی تقریر سن رہے تھے۔

''دوستو۔! توبہ کر لو۔ اس مالک حقیقی کے حضور۔! جو دلوں کے حال کو، اس کی کجی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم بے یار و مددگار تختہ غسل پر پڑے اپنے بدن پر پانی پڑنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ہماری بیوی ہمیں رو رہی ہو۔ ہمارے بچے بلک رہے ہوں۔ ہمارے پیارے ہماری جدائی میں جگر خراش آہیں بلند کر رہے ہوں۔ اور ہم تاسف اور پچھتاوے سے انتظار کر رہے ہوں۔ خواہش کر رہے ہوں۔ مزید مہلت، جو نہ ملی ہے اور نہ ہی ملے گی۔ یا اللہ۔! ہماری توبہ کو قبول فرما۔ ہماری حرص، ہوس کو دور فرما۔ ہماری کجی کو سیدھا کر۔ ہماری زندگی اور طرز عمل کی اصلاح کر۔ ہمیں معاف کر دے۔ ہم گناہگار، خطا کار ہیں۔ پھر بھی تیری رحمت کے طلبگار، تجھ سے معافی کے خواستگار ہیں، ہمیں معاف فرما۔!''

فرحان یعقوب، عبداللہ شاہ گیلانی لوگوں کے ہجوم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گفتگو جو آخر میں نجانے کیسے دعا کے قالب میں ڈھل جاتی تھی۔ آج لوگوں کو رُلا رہی تھی۔ عبداللہ شاہ گیلانی کو تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے قادری سرکار صرف اس سے ہی مخاطب ہیں۔ گزشتہ چند دنوں میں جو کچھ ہوا تھا۔ اس سب کا خلاصہ انہوں نے اپنے مختصر خطاب میں کر دیا تھا۔

''ارے عبداللہ تم رو رہے ہو۔!'' دفعتاً فرحان یعقوب نے اسے چونکا دیا۔

عبداللہ شاہ کا ہاتھ بے ساختہ اپنی آنکھوں سے جا لگا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے پر، رخساروں پر بے تحاشا نمی تھی۔ ''اور تم۔۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے فرحان یعقوب سے کہا۔ ''تم اپنی حالت دیکھو۔۔۔!''

فرحان یعقوب نے ایک جذب کے عالم میں آنکھیں میچیں۔ کئی آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔ ''سب ہی رو رہے ہیں۔ ایک میں اور تم کیا۔!'' عبداللہ شاہ نے ادھر ادھر دیکھا۔

رو تو سب ہی رہے تھے۔ کئی لوگوں کے سسکیوں سے بدن ہل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں ہر طرف سے آ رہی تھیں۔ کسی کے تصور میں ہولناک، تاریک قبر کا منظر تھا۔ تو کوئی اپنے آپ کو سڑی ہوئی لاش کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اپنا پیٹ پھٹتا ہوا

محسوس ہو رہا تھا۔ اور کوئی اپنی بے نور آنکھوں کو بہتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ کسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ دوزخ کے فرشتے اس کو کھینچ رہے ہیں۔ تو کسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ تختہ غسل پر اس کو نیم و بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دیا جا رہا ہے۔

اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ اچانک کسی طرف سے معافی کی گردان شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کے سارے لوگوں کی زبان سے ذکر جاری ہو گیا۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ ہر کوئی زور۔ زور سے بول رہا تھا۔ سر ہل رہے تھے۔ بدن لرز رہے تھے۔ اچانک کئی لوگ وجد میں آ گئے۔ کئی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھوم جھوم کر ایک ہی تکرار کرنے لگے۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ ہر شخص زبان سے، دل کی گہرائیوں سے۔ بدن کی حرکت اور زبان کے لفظوں کے تال میل میں بہہ رہا تھا۔ اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔!

اللہ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔ کی گردان پھیل کر ساری خانقاہ کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ اللہ معافی۔۔ فضا گونج رہی تھی۔ ایک عجیب سا رنگ پوری محفل پر چھا رہا تھا۔ اچانک جیسے عبداللہ شاہ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ لوگ ایک بہت بڑے گنبد میں بند ہوں۔ جس [illegible] ئی آسمان سے زمین تک اور اس خانقاہ کے ہر شخص کو اپنے دائرے میں [illegible] شے بے وزن ہو رہی ہے۔ اس کا وجود غبارے کی طرح بلند ہو رہا ہو۔ بے وزنی۔۔۔ کشش ثقل کے ٹوٹنے کا احساس۔ بے وزن جیسے کاغذ۔ معافی۔۔۔ پھر دفعتاً انتہائی تیز چکا چوند روشنی۔ پھر ہر شے جیسے تحت [illegible] ۔اللہ معافی۔

☆.....☆

[illegible] رہا تھا۔ عبداللہ شاہ کو اچانک اپنے اوپر بارش کے قطرے گرنے کا احسا [illegible] ب اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس تھا۔ جس [illegible] ۔ بولا۔

[illegible] نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کئی لوگ اسی طرح بے حال پڑے تھے۔

"بے خود، کیف اور مستی، جب اپنا بھی ہوش نہ رہتا ہو۔۔۔!"

[illegible] لوگوں کا سر سہلا رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو سہارا دے کر باہر لے جا رہے [illegible] خادم ٹرے میں جگ اور گلاس لے آیا۔

''شربت لیجئے گا۔؟'' اس نے ادب سے پوچھا اور بیٹھ گیا۔

''ہاں۔۔۔!'' فرحان یعقوب نے گردن ہلائی۔ خادم نے شیشے کے شفاف گلاسوں میں جگ سے شربت انڈیلا اور انہیں پیش کر کے جگ اور ٹرے وہیں رکھ کر چلا گیا۔

ٹھنڈا، میٹھا خوش ذائقہ شربت نے پہلے ہی گھونٹ سے ان کے اندر توانائی کی کیفیت پیدا کر دی۔ چند لمحوں پہلے کی تھکن جیسے غائب ہونے لگی۔ عبداللہ شاہ نے چند ہی گھونٹوں میں گلاس خالی کر دیا اور دوسرا گلاس بھر لیا۔ اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا۔

''کیا محسوس ہوا تھا۔۔؟'' فرحان یعقوب نے اس کی حالت بحال دیکھ کر سوال کیا۔

''پتا نہیں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ ''جو وہ آج باتیں کر رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی اور کی نہیں، میری داستان بیان کر رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ میرے اوپر منطبق ہو رہا تھا۔!''

''ان کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔!'' فرحان یعقوب نے انتہائی عقیدت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا تم مجھے ان سے ملوا سکتے ہو۔؟'' عبداللہ شاہ نے سوال کیا۔

''دیکھتا ہوں۔۔۔!'' فرحان یعقوب نے کہا۔ ''خطاب و دعا کے بعد اکثر لوگ ان سے اپنے ذاتی معاملات میں مشورہ لینے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر رش نہ ہوا تو پھر ملاقات کوئی مسئلہ نہیں۔!'' وہ کہتا ہوا اٹھ گیا اور تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف غائب ہو گیا۔

عبداللہ شاہ شربت کی ننھی ننھی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹوں کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ بے حد پرجوش ہو رہا تھا۔ ''آج چند ہی لوگ تھے ورنہ بے تحاشہ لوگ ہوتے ہیں۔ دو تین لوگوں کے بعد ہی باری آ جائے گی آؤ چلیں۔''

عبداللہ شاہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی معیت میں چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خانقاہ کے اندرونی ہال میں پہنچ گئے۔ جہاں قادری سرکار ایک تخت پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس دو تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی جا کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ افراد قادری سرکار سے اجازت لیکر اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر رخصت ہو گئے۔

انتہائی ادب سے سلام کرنے اور دست بوسی کے بعد فرحان یعقوب نے کہا۔ ''سرکار میرے دوست آپ سے شرف ملاقات کے آرزومند تھے۔ میں انہیں لے آیا ہوں۔!''

''آیئے تشریف رکھئے۔!'' قادری سرکار نے مسکرا کے انہیں دیکھا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔

عبداللہ شاہ ان کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ ''سرکار یہ کیا تھا۔؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔؟''

''آہستہ آہستہ شعور کے دروازے کھلتے ہیں۔'' قادری سرکار مسکرائے۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے کیا سارے دروازے بند ہو گئے۔؟''

''معلوم نہیں لیکن اعتبار کے دروازے بند ہو گئے۔ یقین رخصت ہو گیا۔'' عبداللہ شاہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دکھ پندار ٹوٹنے کا ہوتا ہے۔!'' وہ دھیمے سے لہجے سے بولے۔''بہت نازک، بہت باریک۔''

''آپ کو معلوم ہے۔!'' عبداللہ شاہ جیسے بے بس سا ہو گیا۔''آپ سب جانتے ہیں۔!''

''یقیناً اللہ جتنا چاہتا ہے۔اپنے بندے کو بتاتا ہے۔یہ تو اس کی مرضی پر منحصر ہے۔!''

''حقیقتیں کیوں کھل جاتی ہیں۔؟''

''تاکہ سچ کا پتا لگ جائے۔'' قادری سرکار نے شفقت سے کہا۔''اکثر لوگ حقیقت کو ہی سچ سمجھتے ہیں۔مگر سچ تو حقیقت سے آگے کی چیز ہوتا ہے۔!''

''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔''اب مجھے یہاں کچھ نہیں اچھا لگ رہا۔!''

''نہیں۔۔۔!'' قادری سرکار نے دوٹوک انداز میں کہا۔''تمہیں واپس جانے کے لئے نہیں بلوایا گیا۔تمہیں ذمہ داری دینی ہے۔تمہیں بہت تیاریاں کرنی ہیں۔تم مستقبل ہو ہمارا، ہمارے وطن کا مستقبل، تم نوجوان ہی ہمارے لئے اثاثہ ہو، ہم تو بنیاد ہیں۔ہمیں کون جانے گا۔چہرہ تو تم لوگ ہو۔جذبے سے سرشار، توانائی سے بھرپور۔!''

''میں اہل کہاں۔؟'' عبداللہ شاہ نے کہا۔''میں تو خالی ہوں۔تنہا۔!''

''جو دکھ کی گٹھری ساتھ لیکر چلتے ہیں۔وہ خالی نہیں ہوتے۔راز طاقت بھی دیتا ہے۔سمجھنے سمجھنے کی بات ہے۔!''

فرحان یعقوب کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آ رہی تھیں۔پہلی بار ملنے والے یوں گفتگو کر رہے تھے کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں۔بات تو وہ بھی سن رہا تھا مگر اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔وہ حیرت کے عالم میں کبھی قادری سرکار کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی عبداللہ شاہ کی طرف۔

''فرحان میاں پریشان ہو رہے ہیں۔'' دفعتاً قادری سرکار نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔

''جی نہیں۔۔۔ہاں جی۔۔۔!'' فرحان یعقوب گڑبڑا گیا۔

قادری سرکار نے مسکرا کے کہا۔''اجنبی تو وہ ہوتے ہیں جن کے مقاصد جدا ہوتے ہیں۔جن کی سمت مختلف اور خواہشیں متضاد ہوتی ہیں۔یہاں تو سب ایک ہیں، یکسو ہیں۔''

''سرکار میری سمجھ سے یہ رمز باہر ہیں۔!'' فرحان یعقوب نے کہا۔''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔!''

''بیٹھو اطمینان سے۔!'' قادری سرکار نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔''کچھ باتیں تفصیل طلب ہیں۔تمہارے لئے مختصراً بیان کرتا ہوں۔!''

فرحان یعقوب اور عبداللہ شاہ فرشی نشست پر بیٹھ گئے۔خادم نے ایک گاؤ تکیہ ان کی کمر سے ٹکایا۔انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''اسلامی تاریخ پر تھوڑا سا بھی غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام میں جو بھی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ان تمام کا مقصد قتل و

غارت گری نہیں تھا۔ دوسروں کے وسائل پر قبضہ کرنا۔ آزاد اقوام کو غلام بنانا۔ ممالک کی جغرافیائی حدود کو پامال کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسانیت کو اللہ کا، صانع حقیقی کا اصل پیغام پہنچایا جائے۔ دولت کے ارتکاز کو روکا جائے اور دنیا کے میسر وسائل میں سے سب کو ضرورت کے مطابق حصہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لڑی گئی تمام جنگوں میں صرف ۹۲۳ کفار قتل ہوئے اور ۱۲۵ مسلمان شہید ہوئے اور اس بات کو خصوصی طور پر مدنظر رکھو کہ دعوتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نا صرف قلب بدل دیئے۔ نظریات بدل دیئے۔ رہن سہن، رشتے ناطے بدل دیئے۔ بلکہ دنیا کا جغرافیہ بدل دیا۔ اور یہ تمام معاملات آج بھی جوں کے توں ہیں۔ بے شمار مذاہب آئے۔ لیکن وہ مخصوص جغرافیائی حدود، لسانی اور قومی وحدتوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن تبلیغِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو سکون، اطمینان، آزادی، غلامی سے نجات اور معاشی ترقی عطا کی۔!''

وہ ایک ایسے مفکر کی طرح گفتگو کر رہے تھے کہ جس کی نگاہوں کے سامنے تاریخ اسلام کھلی پڑی ہو۔ اور وہ ان سب کا تجزیہ کرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ مبہوت ان کی گفتگو سنتے رہے۔

''اس کے برعکس جنگ عظیم اول اور دوم دونوں کو لے لو، ان جنگوں میں کئی کروڑ لوگ ہلاک ہوئے۔ چھ کروڑ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ لاکھوں کے حساب سے جنگی قیدی بنائے گئے۔ چار کروڑ سے زائد لوگ غائب ہوئے۔ جن کا پتا نہیں چل سکا۔ لاکھوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بھوک، افلاس، صنعتی تباہی، ناجائز اولادیں، بے حرمتی، معذوری کیا کیا گن سکتے ہو۔! اس کے سوا کیا حاصل ہوا؟۔ یہ جنگیں کیوں لڑی گئیں۔؟ انسانیت کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔؟ کیا ملا۔؟ یورپ، ایشاء، امریکا، افریقہ سب ہی متاثر ہوئے۔ لیکن اسلامی فتوحات کے برعکس خوشحالی، بے فکری، حقیقی آزادی کسی کے حصے میں نہ آئی۔ دنیا کمیونزم اور کیپٹل ازم کے خونی پنجوں میں جکڑی گئی۔ اور آج تک دنیا ان کے مکروہ اثرات سے چھٹکارہ نہ پا سکی۔''

قادری سرکار خاموش ہو گئے۔ ان کے لہجے میں بے پناہ تاسف تھا۔ دکھ تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو ایسی تاریک راہوں میں مارے گئے کہ ان کو کسی راہ کے تعین کا اختیار تھا۔ اور نہ ہی ادراک۔

''پھر دنیا کے نقشے پر قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زیر قیادت مسلم ریاست وجود میں آئی۔ جس کو بدقسمتی سے شروع ہی میں مفاد پرستوں نے گھیر لیا۔ بے ضمیروں نے آزاد وطن کی حمیت کا سودا کر لیا۔ یوں ہم ایک کی غلامی سے چھوٹ کر دوسرے کی غلامی میں چلے گئے۔ فرق صرف یہ تھا۔ اس غلامی میں زنجیریں بہت طویل، اور کڑیاں چھبتی نہیں تھیں۔ اس لئے غلامی کا ادراک نہیں رہا۔ مگر آج وقت چلتے چلتے ہمیں وہاں لے آیا ہے۔ جہاں ہمارے لوگ بھوک، افلاس، بے انصافی بے سمتی کے اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ جہاں ان کے پاس سوائے اٹھ کھڑے ہونے کے کوئی راہ نہیں رہ گئی۔'' وہ ذرا ٹھہرے اور پھر گویا ہوئے۔

''اب ساری ذمہ داری تم لوگوں کی ہے۔ تم لوگ جو ہمارا مستقبل ہو۔ ہمارے آج سے جنم لیتا ہوا کل ہو۔ تمہیں اٹھنا ہے۔ عام لوگوں کے لئے۔ بے سہارا، بھوکے، ننگے، پسے ہوئے، کچلے ہوئے لوگوں کا سہارا بننا ہے۔ ورنہ اس قوم پر مسلط ہر طبقے کے سربرآوردہ

لوگ شائیلاک کی صورت لوگوں کے زندہ بدن سے گوشت نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔!'' قادری سرکار کے لہجے میں بے پناہ حدت تھی۔ وہ جولپٹ کی صورت اٹھتی ہے اور پورے ماحول کو خاکستر کر دیتی ہے۔

''ہم حاضر ہیں۔!'' دونوں جیسے بیک وقت بولے۔ اور اپنی ہی آواز کی گونج سے چونک گئے۔ ''ہمیں حکم دیجئے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ اس مملکت کے لئے۔ اپنے لوگوں کے لئے۔ ہم اپنے بدن کا ریشہ، ریشہ قربان کر دیں گے۔!''

''شاباش مجھے یہی امید تھی تم لوگوں سے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دو خادم اندر داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں دو ٹرے تھیں۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے دستر خوان بچھایا اور کھانا لگایا۔ مونگ کی دال کی کھچڑی، ایک پیالے میں بگھاری ہوئی پیاز۔ ایک میں چٹنی تھی۔ پورے کمرے میں کھانے کی مہک پھیل گئی۔

تیسرا خادم اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سلفچی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں پیتل کا چمکتا ہوا لوٹا۔ اس نے دوزانو ہو کر بڑے ادب سے پہلے قادری سرکار کے ہاتھ دھلائے۔ اس کے بعد فرحان یعقوب اور پھر عبداللہ شاہ کے۔

''آیئے کھانا کھا لیجئے۔'' قادری سرکار نے کہا۔

وہ دونوں بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ نہ فرحان یعقوب کو یاد تھا اور نہ ہی عبداللہ شاہ گیلانی کو، کہ کبھی اس سے پہلے انہوں نے مونگ کی کھچڑی بگھاری پیاز اور انار دانے کی چٹنی کے ساتھ کھائی ہے یا نہیں۔ لیکن دونوں کو جو ذائقہ، جو لذت محسوس ہوئی وہ اس سے قبل کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دانے دانے میں لذت کا احساس تھا۔

''شکر میں لذت اور قناعت میں عافیت ہوتی ہے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔

وہ ہر شخص کو جیسے پڑھ لیتے تھے۔

تمام کھانے کے دوران خدام ادب سے کھڑے رہے تھے۔ مبادا کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ قادری سرکار نے گلاس کی طرف دیکھا۔ ایک خادم نے تیزی کے ساتھ بڑھ کر پانی پیش کر دیا۔ انہوں نے تین گھونٹ میں پانی پیا۔ اور الحمدللہ پڑھی۔ ان دونوں نے بھی سیر ہو کر کھانا کھا لیا تھا۔ بے حد طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ گئے۔ خدام نے حسب معمول ہاتھ دھلائے۔ سفید تولئے پیش کئے۔ ایک خادم نے سونف، مصری اور بادام سے بھری طشتری آگے کی۔ جن میں سفید چمکتے ہوئے چمچے بھی رکھے ہوئے تھے۔ فرحان یعقوب نے چمچے سے دو تین بار سونف کو لوازمات سمیت ہتھیلی پر رکھا اور پھانک لیا۔

اچانک عبداللہ شاہ کی نظر برتن اٹھاتے ہوئے خادم پر پڑی۔ خادم نے قادری سرکار کی پلیٹ سے جو چند دانے چاول دال کے باقی رہ گئے تھے۔ انہیں بڑے احترام سے چن کر ہتھیلی پر رکھا اور وہ دانے اٹھا کر منہ میں رکھے۔ اور دوسرے خادم کو بھی دو، دانے دیئے۔ ایک اور خادم نے قادری سرکار کا گلاس اٹھایا اور اس میں جمع چند قطرے اپنے حلق میں ٹپکا لئے۔ عبداللہ شاہ عقیدت و احترام اور

محبت کے اس نظارے پر ششدر رہ گیا۔

احترام، محبت ادب تو اس کے ہاں بھی بہت تھا۔ بڑے شاہ جی، شاہ ہارون گیلانی سب سے لوگ پیار کرتے تھے۔ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ مگر یہ کیا معاملہ تھا۔ یہ تعلق، یہ محبت تو عقل سے ماورا تھی۔ ایسی محبت، عقیدت اور چاہت جب ہی میسر آتی ہے۔ جب کسی کی محبت آسمانوں سے دلوں میں ڈالی جائے اور یہ مقام اولیاء اللہ کو، اس کے ولیوں کو، اس کے پیاروں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

'کیا سوچ رہے ہو۔؟'' فرحان یعقوب نے اسے ٹہوکا دیا۔

''کچھ نہیں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے جواب دیا۔ ''جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بیان کا یارا نہیں۔!''

''ہاں۔۔۔!'' فرحان یعقوب نے آہستگی سے کہا۔ ''یہاں آؤ تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہیں۔''

ابھی وہ لوگ چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے کہ خادم قہوہ لے آئے۔ خوشبودار قہوے کی مہک نے ماحول کو معطر کر دیا۔ انہوں نے قادری سرکار کے پاس بیٹھ کر ان کے ہمراہ قہوہ پیا۔ پہلا ہی گھونٹ سرشار ہونے والے ذائقے سے بھرپور تھا۔

''تم لوگ پاکستان ہو۔ ہم کاغذ ہیں اور تم تحریر۔ ہمارے سنہرے مستقبل کی تحریر۔'' قادری سرکار نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم اپنے حلقے میں واپس جاؤ۔ وہاں تمہاری ضرورت ہے۔'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کو مخاطب کیا۔ ''قدرت کے ہاتھوں بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ جو لوگ دکھ کو ہمت اور راز کو طاقت بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے تئیں اپنا مستقبل طے کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ تیاریاں، ساری محنتیں قدرت ہم سے کسی اور کے لئے کروا رہی ہوتی ہے۔ ہم جس طمطراق سے، جس رعونت سے جگہ سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ سیڑھیاں چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے قدم کے نیچے سے، مقدر کے طاقت ور اسپرنگ نے ہمارے حصے کی زمین کھینچ لی ہے اور ہم گمنامی کی عمیق گہرائیوں میں گرنے جا رہے ہیں۔!''

قادری سرکار بات مکمل کر کے خاموش ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے اس ساری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اچانک عبداللہ شاہ گیلانی کے موبائل پر میسج کی مخصوص دھن گنگنائی۔ اس نے میسج پڑھا۔ بریکنگ نیوز تھی۔

''حکمران پارٹی کے اہم رکن سردار حیات اللہ نے پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے۔''

☆.....☆.....☆

کیسا بھید بھرا آدمی ہے۔اوپر سے سوکھا۔اندر سے ہرا بھرا

پورے قصبے میں ایک گہما گہمی کا عالم ہوگیا۔مغرب کی نماز کے بعد لوگوں کو جونہی پتا چلا کہ میں قادری سرکار کا بھیجا ہوا خانقاہ سے آیا ہوں لوگوں میں جوش وخروش پھیل گیا۔قادری سرکار کا بچہ،سرکار کا خادم الیکشن کی تیاریوں کے لئے آ گیا ہے۔سمجھو جیت تو ہوگئی۔لوگوں کا یہی خیال تھا۔

''خلیفہ جی۔!''ایک بوڑھی عورت نے بہت پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔''اب تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔جب اللہ والے حکومت میں آئیں گے تو دیکھنا کیسی کیسی برکتیں ہونگیں۔''

کہاں تک سوچتے تھے یہ سادہ لوح افراد۔مجھے احساس ہوا۔کچھ حقیقتیں،سچائیاں کائناتی ہوتی ہیں۔بے ریا،طمع سے پاک لوگ جب وسائل کی تقسیم کے ذمے دار ہونگے تو پھر ہی بھوک،افلاس،بے انصافی کا خاتمہ ہوگا۔رکھوالے ماں کی طرح ہونے چاہئیں جو کہ خود بھوکی رہ کر بچوں میں روٹی تقسیم کرتی ہے۔نا کہ ناگن کی طرح کہ بھوک کے عالم میں اپنے ہی بچے نگل جائے۔

''اماں اب سر چھوڑ دو بھی خلیفہ جی کا۔۔۔!''کسی کی شریر آواز آئی۔

''ارے میں تو اس لئے سر چھوتی ہوں کہ ان بالوں پر مرشد نے ہاتھ پھیرا ہوگا!''اماں نے کہا۔اور دھیرے سے میرے سر سے ہاتھ ہٹالیا۔

اس کے انداز میں بے پناہ پیار تھا۔عقیدت تھی۔

''یار یہ لوگ کتنا پیار کرتے ہیں قادری سرکار سے؟''قدیر نے بے پناہ حیرت سے کہا۔''اتنی محبت،ایسی چاہت،اتنا اعتبار تو لوگ بادشاہوں کو بھی نہیں دیتے ہیں۔!''قدیر آج صبح ہی پہنچا تھا اور یہ سب دیکھ کر بہت حیران بھی تھا اور خوش بھی۔

''میں بھی یہی سوچتا تھا کہ زندگی کیا ہے؟۔عناصر میں ظہورِ ترتیب۔اور موت کیا ہے؟ان ہی کا اجزاء کا پریشان ہونا۔مگر یہ تو ایک طبعیاتی اور نامیاتی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔زندگی تو اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔خاک کے اس پتلے کے بھیتر دل میں جب آلائش دنیا،مکروہات اسباب نکال دیئے جاتے ہیں تو پھر زندگی کا شعور بیدار ہونا شروع ہوتا ہے۔بے ریا۔بے طمع۔خالص،سچا سودا جو بیچنے والے،اور خریدنے والے دونوں ہی جان کی قیمت پر لیتے ہیں۔!''میں نے کہا۔

''تم بہت تبدیل ہوگئے ہو۔!''قدیر نے کہا۔''تمہاری باتوں میں گہرائی،اور طرز ادا میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔!''

''پتا نہیں۔۔۔!''میں نے کہا۔''مجھے خود نہیں پتا لیکن اندر سے یوں لگتا ہے کہ خالی ہوگیا ہوں۔!''

''پتر خلیفہ جی۔۔۔! جب تک برتن خالی نہ کریں۔ رگڑ رگڑ کر مانجھا نہ جائے کثافت کیسے اترے گی۔؟'' غلام حسین نے بڑے پیار سے مداخلت کی۔ اور میرے گھٹنے کو تھپتھپایا۔

''چاچا جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے گہری سانس لیکر کہا۔ ''میں نکما، بے سپاس، بے توقیر، غرض کا بندہ۔۔!''

''نہیں پتر جی۔!'' غلام حسین پیار سے بولا۔ ''برتن کا اپنا وزن، اپنا معیار بھی تو ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں تو زنگ ہوتی ہیں جی۔۔۔ پر مرشد کی نگاہ کیمیا اثر سے یہ سب چمک جاتا ہے۔ خالص مصفا۔۔!''

اس کے انداز میں بے پناہ خلوص تھا۔ اجلا پن تھا۔ ''آپ میں کچھ ہے تو مرشد کرم فرما رہے ہیں۔ سرکار تو جوہری ہیں۔ ان کی نگاہ سے کوئی ہیرا کیسے بچ سکتا ہے۔؟''

قدیر خاموش گفتگو سنتا رہا۔ غلام حسین کے انداز میں بہت کچھ تھا۔ اس کی گفتگو سادہ مگر اسرار سے بھری ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ غلام حسین بہت اونچی جگہ پر فائز ہے۔ بہت بلند مرتبہ ہے مگر اپنے آپ کو چھپائے رکھتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں قادری سرکار سے ضرور پوچھوں گا کہ غلام حسین کون ہے۔ کیا ہے۔ کیسا بھید بھرا آدمی ہے۔ اوپر سے سوکھا۔ اندر سے ہرا بھرا۔

''معمولی لوگوں کے متعلق کیا سوچنا، کیا جاننا۔؟'' غلام حسین نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''بیل جتنا بھی بھڑکیلا ہو اس کے لئے کھونٹا بہت۔ پھر کھونٹے کی طاقت تو بڑی ہوئی نا۔!'' وہ مسکرایا۔

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس پڑا میرے ساتھ۔

''کیا ہوا۔؟'' قدیر نے کہا۔

''کچھ نہیں بیٹا جی۔۔۔!'' غلام حسین نے مسکرا کے کہا۔ ''اپنے خلیفہ جی، شہری آدمی ہیں۔ ہر چیز کے متعلق پوری طرح جانچ پرکھ کے پھر یقین کرتے ہیں۔ ہم لوگ سادہ۔ بس جس کے ہو گئے، سو ہو گئے۔ جو پیا من بھائے وہی سہاگن۔ تیری ایک نگاہ سے، سب عالم بے ساکھ ہوئے۔!'' غلام حسین اٹھا اور مسکراتا ہوا تہمند سنبھالتا ہوا چلا گیا۔

''یہ کیا تھا۔۔؟'' قدیر حیرت سے بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔!''

مگر میں تو اس کے جملے کی حلاوت میں گم تھا۔ تیری ایک نگاہ سے، سب عالم بے ساکھ ہوئے۔ سچ ہی تو ہے۔ جب تک پرکھنے والی نگاہ نہیں ہوتی۔ قیمت کا صحیح ادراک نہیں ہوتا۔ ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھ کر لپک پڑتے ہیں۔ لالچ کے سکوں سے خواہشوں کے انبار خریدتے رہتے ہیں۔ جمع کرتے رہتے ہیں۔ آرزوؤں کے اتنے بڑے بڑے بلبلے بنا لیتے ہیں کہ پھر اسی بلبلے میں پھنس کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر جب پرکھنے والی آنکھ کھل جاتی ہے تو پھر اشیاء کی بے ثباتی سامنے آجاتی ہے۔ اور سارے عالم اس کی رضا کے لئے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ طلب ہی سے ساکھ بنتی ہے۔ خواہش کی شدت، قیمت متعین کرتی ہے۔ جب آدمی بے طلب، بے خواہش ہو جائے تو پھر کیا ہیرا اور کوئلہ، جھونپڑی اور محل، ٹاٹ کے بوریے اور حریر و دیبا میں کوئی کشش، کوئی قیمت نہیں رہتی۔ ساکھ تو لینے کی خواہش سے، حصولِ آرزو سے بنتی

ہے۔اور جب جذبہ حصول ہی ختم ہو جائے تو پھر ہر شئے بے ساکھ ہو جاتی ہے۔

''کہاں گم ہو جاتے ہو تنزیل۔۔؟'' قدیر نے مجھے جھنجھوڑا۔میں جیسے یکلخت اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

''کچھ نہیں۔۔!'' میں نے کہا۔

''کچھ تو ہے تم کچھ چھپا رہے ہو۔؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔''بہت بدل گئے ہو۔یوں جیسے لوگوں میں رہ کر،لوگوں سے دور ہو گئے ہو۔مجھے بھی کچھ بتاؤ۔''

''کچھ بتانے کو ہے کیا۔؟'' وہ آہستہ سے بولا۔پھر اچانک چونک کر بولا۔''ارے میں نے تمہیں یہ بتایا ہی نہیں کہ تمہاری کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' کا دوسرا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے۔اگر تمہاری اجازت ہو تو تیسرا ایڈیشن چھاپوں۔۔؟''

''تمہاری مرضی۔۔!'' میں نے بے نیازی سے کہا۔مجھے سچ مچ اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ویسے یہ کتاب بغیر پبلسٹی کے خوب بکی۔جمالی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی کروانا بہت ضروری ہے۔'' قدیر نے کہا۔''نہیں بے حد پسند آئی ہے یہ کتاب۔!''

''کیوں۔۔۔؟'' مجھے حیرت ہوئی۔''اس میں کیا ہے؟ سوائے بے تکے خیال۔ویران یادوں کے جزیرے۔امیدوں کے کملائے ہوئے باسی بے بو پھول،شکستگی،پامالی،بے ثباتی،بکواس فلسفہ محبت،بے تکی افلاطونی خواہشیں۔۔!''

''ایسا نہ کہو۔۔!'' قدیر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔''تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اس کتاب میں کیا کیا ہے۔؟ وہ آرزو،وہ آگ،وہ تپش جس سے ہر جوان کے سینے روشن ہیں۔محبت کی ایک نئی تفہیم،کسی کے لئے بے طلب ہونے کا گر ہے اس میں۔'' قدیر نے کہا۔''بعض اوقات ہمیں اپنے لکھے کی پرواہ نہیں ہوتی۔اپنے لفظوں کے اثرات کا،جملوں کی مسیحائی کا اعجاز معلوم نہیں ہوتا۔مگر لفظ جس میں،خلوص ہو،جذبہ جس میں پذیرائی ہو،ایک عالم کو متاثر کر لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمہاری کتاب جس نے شوق میں لی،پھر اس نے اس کو سمجھ لیا۔اس کو اپنی محبت کا۔اپنے جذبے کی شدتوں کا علم ہو گیا۔لفظ بڑے پر اثر ہوتے ہیں۔تنزیل لمحوں میں دنیا بدل دیتے ہیں۔!''

''کیا تمہاری بھی دنیا بدل گئی۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دنیا۔۔؟'' قدیر نے کہا۔''میری دنیا ہے کیا جو بدل جائے گی۔؟'' اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

''تمہارے اندر کچھ ہے۔جب جی چاہے بتانا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔مجھے اچھا نہیں لگا اس کو بے وجہ کریدنا۔اچانک میرے فون کی بیل بج اٹھی۔میں نے فون اٹینڈ کیا۔دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز سنائی دی ''اسلام علیکم! کیا حال ہیں کیسے ہیں آپ۔۔۔؟'' انداز بہت پرتپاک تھا۔

''میں ٹھیک ہوں طاہر بھائی آپ کیسے ہیں۔؟'' میں نے طاہر پریس والے کو فوراً ہی پہچان لیا۔

''ممبر صاحب کی وودنگ کی پرچیاں چھپ گئی ہیں۔ساتھ میں کچھ دوسرا لٹریچر بھی تیار ہے۔گاڑی آنے کو تیار ہے۔آپ ذرا

ڈرائیور کو پتا سمجھا دیجئے۔"

"ممبر صاحب۔!" میں نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے تو پہلے ہی نتیجے کا اعلان کر دیا۔"

"سرکار نے کہہ دیا ہے نا دیکھ لیجئے گا کہ خادم حسین نے ہی الیکشن جیتنا ہے۔ سرکار جو کہہ دیں وہی ہوتا ہے۔!" طاہر کے لہجے میں بے پناہ یقین تھا۔

میں نے خادم حسین کو فون تھمایا۔ وہ طاہر کے ڈرائیور کو پتا سمجھانے لگا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ قادری سرکار کیا ہیں؟ کس قدر پر اثر، زود اثر، تب مجھے پہلی بار ایک فخر کا احساس ہوا۔ میں کتنی اہم ہستی سے منسلک ہوں۔ ایسی ہستی جو لوگوں کی محبت، لوگوں کی عقیدت اور چاہت کا مرکز ہے۔ خود وہ لوگوں کی اصلاح، ان کی کردار سازی، ان کی بھلائی کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ صلے اور ستائش سے بے نیاز۔ لوگوں کے لئے وقف۔

"کیا سوچ رہے ہیں خلیفہ جی۔؟" مجھے چونکانے والی یہ آواز حافظ سلمان کی تھی۔ میں نے انہیں دیکھا نا معلوم وہ کب سے کھڑے تھے۔ "حضور بہت گہری سوچ میں ہیں۔ خیر تو ہے۔؟" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

"میں ٹھیک ہوں۔!" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ارے جناب الیکشن کا نتیجہ تو طے شدہ ہے۔!" وہ بے حد طمانیت سے بولے۔

"کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

"یہی کہ اپنے خادم حسین ہی ممبر منتخب ہونگے۔ انشاءاللہ۔ جنہیں ہمارے سرکار کی دعا ہو۔ وہ کیسے ناکام ہو سکتے ہیں۔؟"

حافظ سلمان کا لہجہ بے حد پر یقین تھا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جب بندہ پور پور یقین اور پیار میں ڈوبا ہوا ہو تو پھر وہی ہوتا ہے جو یقین اور پیار چاہتا ہے۔ ویسے بھی بزرگ کہتے ہیں کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔!"

"لوگوں میں تو جی بڑا جذبہ ہے۔!" حافظ سلمان نے بات آگے بڑھائی۔ "کئی دوسرے امیدواروں کی تو بڑی بڑی ہو رہی ہے۔ دو تین نے تو اپنی انتخابی مہم ہی بند کر دی ہے۔ ویسے بظاہر تو سب کا یہی خیال ہے کہ شاہ سکندر گیلانی کی شہادت کے بعد تو سیٹ پکی شاہ عبداللہ گیلانی کی ہے۔۔ مگر۔۔۔!"

"مگر کیا۔۔؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مگر لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ خادم حسین اور عبداللہ شاہ میں کانٹے کا مقابلہ ہوگا۔ ایک درویش کا نمائندہ ہے تو دوسرا سرمائے کا سرخیل، دنیا تو جی پیسے کی ہے۔ مگر سرکار کی دعا تو پیسے کو بھی بے اثر کر دیتی ہے۔!" ان کا لہجہ بہت پر یقین تھا۔

"یعنی یہ لڑائی حق اور سچ کے ساتھ۔ مفاد پرست فیوڈل ازم کے درمیان ٹکراؤ ہے۔!" قدیر نے مداخلت کی۔

"کہا تو جا سکتا ہے۔!" حافظ سلمان نے تائید کی۔ "مگر لوگوں کو گھر سے نکالنا بھی تو کام ہے۔"

''گھر سے نکالنا کیا مشکل ہے۔؟'' غلام حسین کے ساتھ بیٹھے ہوئے حنیف صحرائی نے کہا۔''جب لوگوں کو یہ یقین ہو کہ ہمارا نمائندہ اصل میں کون ہے۔ ہمارے مسائل کون سمجھ سکتا ہے۔ مکی کی روٹی جس نے چٹنی پیاز کے ساتھ کھائی ہے۔ وہی ہمارے مسائل حل کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ جس کے گھر ہم ہر لمحے پہنچ سکیں۔''

''اور وہ ہمارا خادم حسین ہے۔ حضرت حسینؓ کا خادم۔ قوم کا خادم۔'' منشی اللہ دتہ نے بڑے جذبے سے کہا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ دین کو نرمی اور پیار سے، اس کے اصولوں کو، حقائق اور معاشرت پر منطبق کر کے، کس طرح سے طاقت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو لوگوں پر حد درجے اثر انداز ہو۔ بلاشبہ قادری سرکار نے جو نقشہ ترتیب دیا تھا۔ ہر شئے اسی کے مطابق ہو رہی تھی۔

''لوگ تو اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اجنبیت کو پسند نہیں کرتا۔ پھر ہمارا نمائندہ بھی اندر سے، باہر سے دیکھا بھالا ہونا چاہیے۔ ہمارے درمیان بیٹھ کر دکھ سکھ پھرولنے والا۔!'' رحمت اللہ حجام نے کہا۔''ہم تو سرکار کے فرمان کے مطابق ووٹ صرف اور صرف اپنے بچے کو ہی دیں گے۔ پکی سڑکاں بنیں، اسکول کھلیں۔ ڈسپنسری میں ڈنگر کی جگہ سفید کوٹ والا ڈاکٹر ہو۔'' رحمت اللہ حجام کے لہجے میں آس تھی۔ امید تھی۔ اور آنکھوں میں روشنی۔

''سب ہوگا۔۔ انشاءاللہ سب ہوگا۔۔!'' قدیر نے کہا۔''وہ دن دور نہیں، جب راج کرے گی خلق خدا۔۔!''

''ووٹوں کی پرچیاں آ رہی ہیں۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے ہمیں علاقے کی ووٹر لسٹیں مل گئی ہیں۔ جتنے بھی لڑکے میٹرک یا انٹر میں ہیں۔ ان سب کی ڈیوٹیاں لگا دو کہ سب کے نام اور ووٹر لسٹ کا نمبر لکھ لکھ کر پرچیاں مکمل کریں۔ اور اس کے بعد گھر گھر جا کر تقسیم کریں۔'' میں نے ان کو کام بتانے شروع کئے۔

''اگر کوئی بینر لکھنے والا ہے تو اس کو بھی بلواؤ۔ تا کہ اس کو کچھ چیزیں لکھنے کے لئے دی جائیں۔'' میں نے خادم حسین کو مخاطب کیا۔''شہر سے طاہر بھائی نے جو گاڑی بھیجی ہے۔ اس میں لٹریچر وغیرہ بھی ہے۔ اس کو فوراً تقسیم کروانے کی تیاری شروع کرنا ہے۔ تا کہ ووٹرز تک بروقت تمام ضروری چیزیں پہنچائی جا سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پولنگ ایجنٹ کے لئے ہمیں ایک ٹیم تیار کرنی ہے۔ تا کہ اس حلقے کے تمام پولنگ اسٹیشن پر ہمارے ایجنٹ باضابطہ طور پر موجود ہوں۔۔!''

''فہرست میں نے حنیف صحرائی کے ساتھ مل کر بنائی ہے۔!'' خادم حسین نے کہا۔''ابا کے کئی دوست ہیں، اپنے کئی امام مساجد ہیں، سرکار کا حکم تھا کہ پولنگ ایجنٹ امام صاحبان کو ہی رکھا جائے۔!''

''چلو کافی کام تو نبٹ گیا ہے۔ اس لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

اسی وقت غلام حسین نے کہا۔''کام اور باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے کھانا کھا لیا جائے۔!''

''ٹھیک ہے۔۔!'' اچانک ہجوم چھٹنے لگا۔ لوگ سلام کر کے رخصت ہونے لگے۔

خادم حسین نے کہا۔''بھائیوں آپ لوگ کھانا کھا کے جائیں۔۔۔!''

''او یار۔۔۔!'' اللہ دتہ حجام نے خوش دلی سے کہا۔ ''ہمارے بچوں کو پڑھا بھی رہے ہو۔ ہمارے لئے لڑ بھی رہے ہو۔ اب کھانے کا بوجھ نہ ڈالو ہم پر۔ ہم لوگ گھر سے کھانا کھا کر آئے ہیں۔!''

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے دتہ۔۔!'' شریف حلوائی نے کہا۔ ''الیکشن والے دن رات میں میری طرف سے ایک کٹا ہے۔ اس کو بنا کر کھائیں گے۔ گوشت اور چاول کیا کہتے ہیں شہر والے برانی۔۔۔!'' وہ ہنسا۔

''برانی نہیں بریانی۔۔۔!'' حافظ سلمان نے اس کی تصحیح کی۔

''اور میٹھے چاول میری طرف سے۔!'' عبدالرشید نانبائی نے کہا۔

''دیکھتے ہی دیکھتے الیکشن کی دعوت کا نا صرف کھانا طے ہو گیا۔ بلکہ اس کے لئے سب نے اپنی اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔ محفل برخواست ہو گئی۔ ہم لوگ کھانے کے لئے اٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

شاہ ہارون گیلانی بہت مطمئن تھے۔ بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ وہ اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میڈیا ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے سب سے بڑے نیوز چینل کے ساتھ ڈیل کی تھی۔ مگر دیگر چینل بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ حالانکہ انہوں نے کسی دیگر چینل سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، کے مصداق اب سارے چینل ایک ہی راگ الاپ رہے تھے۔ مستقبل کا وزیر اعظم۔ شاہ ہارون گیلانی۔

انہیں صبح دارالحکومت جانا تھا۔ وہاں میٹنگ تھی۔ پارٹی سربراہ اور وزیر اعظم نے یہ ہنگامی میٹنگ طلب کی تھی۔ ان سے فون پر صرف اتنا ہی کہا گیا تھا کہ وہ فوراً پہنچیں۔ بہت ضروری میٹنگ ہے۔

مگر اس سے قبل ہی انہیں اس میٹنگ کا ایجنڈا معلوم ہو گیا تھا۔ انہیں منیجر طارق نے ایک لفافہ دیا تھا۔ سربمہر لفافہ۔ جس میں سے ایک پرچہ ملا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ ''میٹنگ صرف آپ کے لئے بلائی جا رہی ہے۔ تیاری کر کے آیئے گا۔۔۔ آپ کا خیر خواہ۔۔''

اس سے قبل بھی بعض مراحل پر انہیں اس قسم کے پرچے ملے تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ ان کا یہ خیر خواہ کون تھا۔ جو اجنبی ہونے کے باوجود ان کے ساتھ تھا۔

انہوں نے احمد اورنگ زیب کو بتایا۔ ''میں صبح دارالحکومت جا رہا ہوں۔ وہاں کوئی کانفیڈینشل میٹنگ ہے۔''

''یہ بڑے شاہ جی کی شہادت کے بعد پہلی میٹنگ ہے۔'' احمد اورنگ زیب نے بڑے احترام سے کہا۔ ''غالباً اس کا پس منظر میڈیا کا حالیہ رویہ ہے۔۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔!'' انہوں نے مسکرا کے کہا۔ ''مجھے تمہاری یہی سمجھ داری پسند ہے۔ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔۔''

''یہ سب کی آپ تربیت اور توجہ کا نتیجہ ہے۔!'' احمد اورنگ زیب نے شکر گزار لہجے میں کہا۔ ''سب آپ ہی سے سمجھا ہے۔!''

''صبح جلدی نکلنا ہے۔ میٹنگ کا آغاز ٹھیک نو بجے ہوگا۔'' انہوں نے بریفنگ دی۔ ''اظہر صدیقی سے کہنا کہ مجھے اس کے چینل کا نمائندہ پک کرلے اور صرف ایک ہی سوال پوچھے۔ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے۔؟''

''جی ٹھیک ہے۔!'' مستعد اور ذہین احمد اورنگ زیب مسکرایا۔

شاہ ہارون گیلانی بھی مسکرائے۔ ''تم بہت فطین ہو۔۔!''

احمد اورنگ زیب نے جھک کے انکے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ''آپ کے قدموں کے طفیل ہی ہوں۔ جو کچھ بھی ہوں۔!''

☆.....☆.....☆

وہ ایوان وزیراعظم کے بجائے دارالحکومت پارٹی کے سربراہ کی وسیع وعریض کوٹھی پر پہنچے تھے۔ انہیں یہیں بلایا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ گاڑی سے اترے۔ کئی رپورٹرز نے انہیں گھیر لیا۔ وہ ان سے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو سیدھا اپنے بھائی کی شہادت کے بعد یہاں آرہا ہوں۔ اب میٹنگ کے بعد ہی کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔''

''سر میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔!'' اچانک ایک نمائندے نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ انہیں دور ہی سے مائک پر لگا ہوا لوگو نظر آگیا۔''

''ہاں پوچھئے۔۔!'' انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر آپ کو اس غم کی فضا میں، اچانک کیوں طلب کیا گیا ہے۔؟'' اس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''مجھے طلب کیا گیا ہے۔؟'' اچانک شاہ ہارون گیلانی کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس سوال کو سنتے ہی سارے رپورٹرز اچانک چپ ہوگئے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شاہ ہارون گیلانی جیسی طاقت ور سیاسی شخصیت اور اتنے اہم وزیر کو طلب کیا جاسکتا ہے کہ جیسے الفاظ کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

''کس نے کہا ہے آپ سے۔؟'' ان کی گرجدار آواز جیسے سارے میں گونج گئی۔

''ہمیں اطلاع ملی تو یہ سوال پوچھ لیا۔ اگر ناگوار گزرا ہے تو میں اپنا یہ سوال واپس لیتا ہوں۔'' نمائندے نے گھبرا کے کہا۔ اور مائیک نیچے کردیا۔

ہارون گیلانی کچھ نہ بولے اور اندر کی جانب چلے گئے۔

پارٹی سربراہ اور وزیراعظم یہ لائیو کوریج دیکھ رہے تھے۔ ''یہ کیا کیا اس نے۔؟''

''کیا ہوا۔۔؟'' وزیراعظم نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے؟ ساری بازی الٹ کے رکھ دی اس نے۔'' پارٹی سربراہ نے غصے کے عالم میں کہا۔

وزیراعظم نے سوال کیا۔ ''آپ کیوں پریشان ہورہے ہیں۔؟''

''ابھی دیکھ لینا۔!'' وہ بری طرح تلملا رہا تھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔اور شاہ ہارون گیلانی اندر داخل ہوئے۔ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔اور اعصاب انتہائی کشیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ میری بے عزتی کیوں کی جا رہی ہے۔؟'' ان کا لہجہ بے حد سخت تھا مگر انداز دھیما۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔اور سردار حیات اللہ اندر داخل ہوا۔''میں بھی تو یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔؟''

''آپ بیٹھیں تو سہی، شکوے شکایتیں بھی ہو جائیں گی۔!'' وزیر اعظم نے کشیدہ ماحول کو سنبھالا دینے کی اپنی سی بھرپور کوشش کی۔

''میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے طلب کس نے کیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

''ہم نے تمہیں بلایا ہے۔شاہ ہارون گیلانی۔'' پارٹی سربراہ نے کہا۔''گفتگو بیٹھ کر، تسلی سے، اطمینان سے بھی ہو سکتی ہے۔!''

''کیا آپ لوگوں کو میری اس بے عزتی کے بعد مجھ سے کوئی توقع رکھنی ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی زہر آلود لہجے میں بولے۔

''کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ جب یہ میٹنگ انتہائی کانفیڈنشل تھی تو میڈیا یہاں کیا کر رہا تھا؟ اور پھر اس کو یہ بریفنگ کس نے دی؟۔آپ جانتے ہیں کہ اس سے میرے امیج کو کتنا نقصان پہنچے گا۔میرے ووٹرز کیا سوچیں گے۔ہمارے شاہ جی ہمارے ناخدا کو طلب کیا گیا ہے۔ایک مجرم کی طرح۔ایک ایسے شخص کو کہ جس نے پارٹی کے لئے اپنا خون دیا۔روپیہ پیسہ، تعلقات، وقت دیا۔بے لوث، بے طلب آدمی کی اتنی بے عزتی۔!'' شاہ ہارون گیلانی بولنے پر آئے تو لگاتار بولتے چلے گئے۔

''پتا نہیں۔۔۔یہ منحوس میڈیا ہر جگہ سائے کی طرح کیوں پہنچ جاتا ہے۔!'' وزیر اعظم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''رہنے دیجئے یہ بے تکی باتیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے ناگواری سے کہا۔''میڈیا کو پہنچایا جاتا ہے۔اس کے منہ میں سوال ڈالے جاتے ہیں۔''

''اور اگر یہی بات میں تم سے کہوں۔؟'' پارٹی سربراہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔''تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا کیا مطلب لیا جائے۔کھلی بغاوت۔؟''

''میری کوئی ایک بات، ایک سوال، کوئی ایک ایسی بریفنگ بتا دیں، جس میں کسی پارٹی فیصلے سے انحراف کیا گیا ہو۔کوئی ایسے معاملہ کی جس سے میرا کوئی قصور ثابت ہو۔یہ تو میڈیا کے معاملات ہیں کہ جس زاویئے سے وہ چاہیں اپنے تجزیئے کریں۔اس میں میرا کیا قصور۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ہمیں بیٹھ کر، ٹھنڈے دل سے بات کرنی چاہیے۔!'' پارٹی سربراہ نے صلح جو انداز اختیار کر لیا۔

''اس کے بعد بھی۔؟'' ہارون گیلانی ٹی وی کی طرف انگلی اٹھائی۔''دیکھئے وہاں کیا چل رہا ہے۔؟''

پارٹی سربراہ نے چونک کر کہا۔''یہ کیا۔۔۔؟''

تازہ ترین خبر کا ٹکر چل رہا تھا۔ ''شاہ ہارون گیلانی کی اچانک طلبی۔ پارٹی سربراہ اور وزیراعظم میں سے کسی نے ان کے استقبال کے لئے باہر آنا پسند نہیں کیا۔ کیا پارٹی ہارون گیلانی سے چھٹکارہ پانا چاہتی ہے۔؟''

''بہت خوب۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''یہ جملے کس صحافی کی جرأت ہے کہ اپنی مرضی سے اپنے قیاس سے لگائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے راستے جدا کر لینا ہوں گے۔'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''یہ کون کر رہا ہے۔؟''

''میں اب یہاں نہیں رکنا چاہتا۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔

''ایک منٹ شاہ ہارون گیلانی۔'' پارٹی سربراہ نے انہیں ٹوکا۔ ''یہ کوئی بہت بڑی سازش ہو رہی ہے ہمارے خلاف۔ ہمیں مل کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔!''

''یہ سب آپ کی کمزور شخصیت کا شاخسانہ ہے۔!'' اچانک سردار حیات اللہ نے مداخلت کی۔ ''آپ نے پارٹی ڈسپلن کا بیڑہ غرق کر دیا۔ ہر سیٹ پر آپ ہی کا کوئی زر خرید بیٹھا ہوا ہے۔ جس کو نہ کی [illegible] اپنے مفادات کی خاطر پارٹی کا سارا امیج تباہ کر دیا۔''

''یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے صدمے کے [illegible] کوشش کرو۔ تم لوگ تو خود ہی غیر بنتے جا رہے ہو۔!''

''آپ نے ساری زندگی صرف اپنی منوائی۔ آپ صرف [illegible] خوشامدی ہیں۔ جن کی سب سے بڑی قابلیت خوشامد ہے۔ آپ کی خوا[illegible]

''یا اللہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' سربراہ نے بے بسی سے کہا

''یہ سب آپ کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔!'' [illegible] فنڈز میں، وزیراعظم کو مرسڈیز بینز کا گفٹ دیا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ میرے [illegible] دانت کچکچائے۔ ''جس وقت پارٹی کو فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت [illegible]

''تم نے یہ کیا کیا۔؟'' پارٹی سربراہ نے غصے سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔!'' وزیراعظم نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگ [illegible]

''میں بتاتا ہوں۔!'' سردار حیات اللہ نے کہا۔ ''ٹینڈر [illegible] خرچ ہم کریں۔ اور منافع کمائیں دوسرے۔ دکھ کہیں بی فاختہ اور کو۔ مجھے۔ الٹا میری جان کو عذاب بن کر چمٹ گئے ہو۔!''

''حفظ مراتب بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔!'' وزیراعظم نے قدرے سنبھل کر کہا۔

''مجھے حفظ مراتب نہ سکھاؤ۔'' سردار حیات نے طنز کیا۔ ''حفظ مراتب کا لحاظ رکھا جاتا تو پھر تم آج بھی کسی معمولی وزارت سے زیادہ کے حق دار نہیں تھے۔ یہ تو انہوں نے تمہارے اوپر مہربانی کی ہے۔ کتنے ہی اہل لوگوں کو نظر انداز کر کے۔۔۔!''

اچانک ہی پارٹی سربراہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا پھر فون اٹھا کر قریب کر لیا۔

''سر لوگ سخت ناراض ہو رہے ہیں۔ فون پر فون آ رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟''

''کیا ہو رہا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے حیرت سے پوچھا۔

''سر لوگ سخت غصے میں ہیں۔ یہ آپ لوگوں نے سر ہارون گیلانی کے ساتھ کیا سلوک کرنا شروع کر دیا ہے۔ ذرا ٹی وی پر دیکھئے خبریں چل رہی ہیں کہ آپ لوگ شاہ ہارون گیلانی کو شوکاز ایشو کر رہے ہیں۔ ڈسپلن کی خلاف ورزی پر۔ سر آپ کو اندازہ نہیں کہ لوگ پارٹی سے برگشتہ ہو جائیں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ فوراً یہ اعلان کرو کہ شاہ ہارون گیلانی سے کوئی اختلافات نہیں۔ یہ میٹنگ صرف ضمنی الیکشن کے حوالے سے بلائی گئی ہے۔!''

''سر اس کا الٹا اثر ہوگا۔!''

''تو پھر کیا کروں۔؟''

''سر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جس خبر کی تردید کی جائے لوگ اس کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی اور طریقہ ڈھونڈیئے۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔۔!'' اس نے فون بند کر دیا۔

''کون تھا۔۔!'' وزیراعظم نے پوچھا۔

''ستار تھا۔!'' پارٹی سربراہ نے بتایا۔ ستار پارٹی کا مرکزی سیکریٹری اطلاعات تھا۔ ''کہہ رہا تھا کہ میڈیا کی ان خبروں سے اشتعال پھیل رہا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے۔؟''

''میری سن لو۔!'' سردار حیات اللہ نے مداخلت کی۔ ''میں خبر دے رہا ہوں، فی الحال سارا معاملہ دب جائے گا۔''

''کیا خبر۔۔۔؟''

''میں سردار حیات اللہ پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہوں۔'' سردار حیات اللہ نے جیسے دھماکا کیا۔

''کیا فضول بات ہے سردار صاحب۔ ناراض کوئی ایسے ہوتے ہیں۔!'' وزیراعظم نے اس کا بازو تھام لیا۔

''میں ناراض نہیں ہوں۔!'' سردار حیات اللہ نے اپنا بازو چھڑایا۔ ''ناراض تو ان سے ہوتے ہیں جن سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق

رکھنا ہو۔ مجھے اب آپ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔!"

"شاہ ہارون گیلانی آپ ہی سمجھائیں ان کو۔!" وزیر اعظم نے امداد طلب انداز میں انہیں دیکھا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ سردار حیات اللہ کو اگر کوئی شکایت ہے تو پھر ان کی ناراضگی بجا ہے۔!" شاہ ہارون گیلانی نے بڑی نرمی سے اپنا آپ بچا لیا۔

سردار حیات اللہ ان لوگوں کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ ڈیڑھ فرلانگ بعد ہی جیسے وہ پورچ میں پہنچا۔ اچانک جیسے چاروں طرف سے فلڈلائٹ کے درجنوں نمائندے ابل پڑے۔ انہوں نے چاروں طرف سے سردار حیات اللہ کو گھیر لیا۔ اور میٹنگ کے حوالے سے سوالات کرنے لگے۔ سردار حیات اللہ نے کہا۔ "اگر آپ لوگ خاموش رہیں تو میں کوئی بات کروں۔!"

اچانک جیسے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

سردار حیات اللہ نے کہا۔ "میں پارٹی سے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں۔!"

یہ بہت بڑی بریکنگ نیوز تھی۔ سارے میڈیا میں ہلچل مچ گئی۔ صحافیوں نے تابڑ توڑ سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ سردار حیات اللہ بغیر کوئی جواب دیئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک کسی نے چیخ کر پوچھا۔ "ارے صرف اتنا ہی بتا دیجئے کہ ہارون گیلانی کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ہے۔ کیا وہ بھی علیحدگی اختیار کر لیں گے۔؟"

"یہ ان کا مسئلہ ہے۔ وہ آنے ہی والے ہیں ان کا انتظار کر لیں۔!" یہ کہہ کر سردار حیات اللہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اندر جیسے فضا ایک دم سوگوار ہو گئی۔ پارٹی سربراہ، وزیر اعظم ہکا بکا ٹی وی اسکرین دیکھتے رہے۔ جس پر بریکنگ نیوز چلنے لگی تھی۔ "سردار حیات اللہ نے وزیر اعظم اور پارٹی سربراہ سے اختلافات کے بعد پارٹی چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ شاہ ہارون گیلانی بھی جلد ہی کوئی اہم فیصلے کا اعلان کرنے والے ہیں۔"

"شاہ ہارون گیلانی یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" پارٹی سربراہ نے بے بسی سے کہا۔

"بات اچھی تو نہیں ہے۔ لیکن سچ ہے۔" شاہ ہارون گیلانی نے نرمی سے کہا۔ "آپ اپنی پارٹی کے اوپر گرفت کھو رہے ہیں۔ اور اس بات کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔!"

"میں۔۔۔ میں۔۔ کیا کروں۔؟" پارٹی سربراہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ انجائنا کا مریض تھا۔ ایک حد سے زیادہ دباؤ اس کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور پارٹی سربراہ کو دیا۔ اس نے ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ شاہ ہارون گیلانی نے شیشی اٹھائی اور درد کم کرنے والی گولی نکال کر اس کو دی۔ پارٹی سربراہ نے فوراً ہی گولی زبان کے نیچے رکھ لی۔ چند منٹ خاموشی چھائی رہی۔ پارٹی سربراہ نے دو چار گھونٹ پانی کے لئے۔ پھر شاہ ہارون گیلانی کی طرف دیکھا۔ پھر وزیر اعظم کی طرف۔

''تم نے کیا کیا تھا۔؟''

''میں کیا کروں۔؟'' وزیراعظم نے کہا۔ ''سردار حیات اللہ ہر ٹینڈر، ہر ٹھیکے کو اپنی ہی ملکیت سمجھتے ہیں۔ مجھے کئی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پارٹی کو دوسرے لوگ بھی فنانس کرتے ہیں۔ ان کے مفادات بھی ہیں۔ ذرا سال بھر کے معاملات دیکھ لیں۔ سردار حیات اللہ اور ان کی نامزد فرم کو ہی ہر چیز ملتی رہی ہے۔ پھر دیگر وزراء ہیں، وزرائے مملکت ہیں، دیگر پارٹیوں کے لوگ ہیں۔ آخر کیا کیا کروں۔؟'' وزیراعظم نے بے بسی سے کہا۔

''سب کو ہی یہ کرسی اچھی لگتی ہے۔ مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔ اس کی قوت، اس کی کشش ہی ایسی نیاری ہے کہ ہر شخص اس کے لئے جو بھی کرے وہ تھوڑا ہے۔ مگر حلف اٹھانے کے بعد ہی یہ کرسی، موت کی کرسی لگنے لگتی ہے۔ ذمہ داری سے بڑا آزار کوئی نہیں ہوتا۔!'' انہوں نے کنکھیوں سے ہارون گیلانی کی طرف دیکھا۔ مگر ان کے چہرے پر قطعاً کوئی تاثر نہ تھا۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ انہوں نے ایک لفظ بھی سنا نہیں۔

''لیکن اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی ذریعہ بھی تو ڈھونڈو۔'' پارٹی سربراہ نے کہا۔

''کیسے۔۔۔؟'' وزیراعظم نے بے تابی سے پوچھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر پارٹی سربراہ کو مخاطب کیا۔ ''میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ چند دن آرام کیجئے۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ جہاں تک حالات کا تعلق ہے۔ تو ہمارے جہاندیدہ، سمجھ دار، وزیراعظم سارے معاملات سنبھال لیں گے۔''

''یہ اکیلے کیا خاک کرے گا۔؟'' پارٹی سربراہ نے ناگواری سے کہا۔ ''تقریر کرنا اور ہے۔ سیاسی جوڑ توڑ کرنا اور بات ہے۔ بندہ گڑ نہ دے۔ گڑ جیسی بات تو کرے۔ یہ تو گڑ مانگنے والوں کو مار بھگانے کا کام ہی کر سکتا ہے۔''

شاہ ہارون گیلانی کو اس ساری صورتحال میں پہلی بار اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کے لئے اپنے اوپر بڑا جبر کرنا پڑا۔

اچانک وزیراعظم نے رف پیڈ اپنی طرف کھینچا اور اس پر تیزی سے کچھ لکھ کر پیڈ پارٹی سربراہ کے سامنے رکھ دیا۔ اور خود تیزی کے ساتھ ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ بند کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

سحر زدگی اور حیرانی کی ایک واردات

میں اور قدیر خادم حسین کے علاقے کو دیکھنے نکل گئے۔ یہ تجویز قدیر ہی کی تھی۔ ''یار ذرا علاقہ گھومتے پھرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر ہرے بھرے کھیت فلموں میں دیکھے ہیں۔ یا کبھی دورانِ سفر۔ اب آئے ہیں تو ان کو بھی دیکھ لیں۔ ذرا ٹیوب ویل کا ٹھنڈا پانی پی لیں۔''

''چلو۔۔۔!'' میں نے کہا۔ اور یوں ہم لوگ گھر سے باہر نکل آئے۔ خادم حسین نے ہمارا ساتھ دینے کی پیش کش کی۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ وہ محبت سے بھرا تھا۔ اور تکلفات کی وجہ سے ہم لوگ آپس میں کھل کے باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم لوگ گھومتے پھرتے کھیتوں کے دائیں جانب آموں کے باغ میں نکل آئے۔ وہاں کسی کی بڑی سی چارپائی پڑی تھی۔ پاس ہی حقہ دھرا تھا۔ شائد کوئی ادھر ادھر، آس پاس ہی ہوگا۔

''چلو یار بیٹھیں۔۔۔!'' قدیر جا کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یار زندگی میں کتنا کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔'' قدیر نے کہا۔

''ہاں۔۔!'' میں نے بھی اس کی تائید کی۔ ''یہ زندگی کی بے چہرہ حقیقتیں، لوگوں کی کیفیات، دیہی زندگی کے سادگی آمیز کردار ہمیں شہر میں دیکھنے کو کہاں ملتے۔ شہر کے مسائل الگ ہیں۔ دیہات کے علیحدہ۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ استحصالی ٹولے کا نام بدل جاتا ہے۔ چہرہ بدل جاتا ہے۔ طریقۂ واردات بدل جاتا ہے۔ لیکن بنیادی [illegible]
کیا جائے۔ اور کس طرح لوگوں کے اندر سے احساس کی آخری رمق بھی [illegible]''

''سچ کہتے ہو۔۔۔!'' قدیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''یار ہاں [illegible]''

''مسئلہ سسٹم کا نہیں ہے۔!'' میں نے کہا۔ ''مسئلہ سسٹم کو چلا [illegible]
چیز نہیں ہے تو صرف سچی نیت اور اخلاص نہیں ہے۔ اور جب تک یہ مفاد [illegible]''

''اس بیماری کا علاج؟''۔ قدیر نے ہنس کر کہا۔ ''ایک مزہ [illegible]''

''نوجوانوں کی بیداری، شعور کو بیدار کرنا، اپنے حقوق اور [illegible]
آدمی کو، بے کردار کو، بے ضمیر کو، ذات، برداری یا کسی بھی لالچ کے باعث [illegible]
برابر کا حصے دار بھی ہوگا۔ اور دنیا اور آخرت میں عذابِ الٰہی کا سزاوار بھی [illegible]''

''تم بہت بدل گئے ہو تنزیل۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ تنزیل جو بچپن سے میرے ساتھ تھا۔ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ تو کوئی نیا سا، معتبر، معتبر سا تنزیل ہے۔ جس کی ہر بات میں ایک تجزیہ، ایک دلیل، ایک ذہانت ہوتی ہے۔ دوسروں کو متاثر کرنے والی۔ چھا جانے والی۔۔!'' قدیر کے لہجے میں پیار بھری ستائش تھی۔

''ہاں۔۔۔! میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بدل گیا ہوں۔!'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لفظ خود بخود نجانے کیسے ترتیب پا لیتے ہیں۔ منشتر سوچ یکسو ہو گئی ہے۔!''

''کتاب لکھنے کی کیفیت نے تمہیں گہرائی اور گیرائی دونوں عطا کر دی۔!'' قدیر نے کہا۔

''کتاب لکھنے کی کیفیت۔۔!'' مجھے قدیر کا جملہ اچھا لگا۔ ''واقعی زندگی مختلف کیفیات ہی سے تو عبارت ہے، کامیابی، ناکامی، محبت، حاصل کرنا، کھو دینا، رسائی اور کربِ نارسائی ہر ایک اپنی کیفیات کے حوالے سے ہی تو زندگی کے جواز مرتب کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے کتاب نے نہیں قادری سرکار نے بدل دیا ہے۔ وہ کمال سی شخصیت ہیں۔ بغیر کسی بوجھ کے، بغیر کسی ضد کے، اچانک ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اٹوٹ انگ۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ بہت دھیرج زندگی کی ایسی باتوں کی، ایسے معاملات، ایسے رخ کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ کہ جس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا ہے۔ مگر سب سے اہم رخ ہی وہی ہوتا ہے۔''

قدیر کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آموں کے درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس رخ کی جانب متوجہ تھا۔ جو قادری سرکار نے دیکھ لیا تھا۔ اور جس سے میں، اس کے بچپن کا دوست لاعلم تھا۔

''کوئی بات ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر گھما کے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بے تاثر تھیں۔ اجنبی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوا۔

وہ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جب نفس کی حرارت باہر نکلنا شروع ہوتی ہے تو پھر بدن ٹھنڈا ہونا شروع ہوتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے عمل تبخیر سے مٹی کے گھڑوں کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ماٹی کے پتلے کے بھیتر سے جب لوبھ، لالچ، طمع، حرص کی آگ نکلتی ہے تو پھر اس کا برتن ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ سکون پانے لگتا ہے اور اس میں نور، محبت، کشش کے رنگین کے دھارے جذب ہونے لگتے ہیں۔ اور مٹی کا آدمی اپنی جگہ پڑے پڑے سونا بن جاتا ہے۔ مقناطیس بن جاتا ہے۔ دیر بس ایک پارس بندے کے لمس کی ہوتی ہے۔

''کیا کوئی کسی پر اس طرح بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔؟'' میں نے سوچا۔

''پی ہُو۔۔۔ پی ہُو۔۔۔!'' دور کسی پرندے نے اثبات کا اعلان کیا۔

ہر مخلوق اپنے خالق کو پہچانتی ہے۔ روزِ ازل سے، پیدائش کے پہلے لمحے سے جبلت کا شعور کیسا تھ ہی۔ سوائے انسان کے۔۔!

اس کو راہ راست پر لانے کے لئے تخلیق کار نے کیسے کیسے تانے بانے بُنے۔ کتنے پیار، نکھار، اعتبار کے معاملات۔ مگر یہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتا ہے۔ اکڑے جاتا ہے۔ مگر وہ خالق۔ وہ مالک کتنے بھروسے سے اس کا انتظار کرتا ہے۔ مگر۔۔!'' اس مگر کے ساتھ خوف، اندیشے، ناکامی کے ناگ لپٹے ہوئے پھنکاریں مار رہے ہوتے ہیں۔

''خلیفہ جی۔۔۔!'' اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا نیما قصائی مجھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو پیالے تھے۔ اس کے دونوں بیٹے الیکشن کی پرچیاں بنانے میں جتے ہوئے تھے۔

''ارے تم۔۔۔!''

''ہاں جی۔۔۔!'' وہ مسکرایا۔ ''پیچھے ہی میرا گھر ہے۔ آپ کو یہاں بیٹھے، باتیں کرتا دیکھا تو سوچا ہمارے خلیفہ جی تو شہری ہیں۔ چائے کو دل چاہ رہا ہوگا۔ اس لئے بنا لایا۔ مگر گڑ کی ہے۔ آپ تو شکر والی پیتے ہونگے۔!'' اس نے دونوں پیالے باری باری ہمیں تھماتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو واقعی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔!'' قدیر نے ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔ چائے سے بڑی سوندھی سی مہک اٹھ رہی تھی۔ مٹھاس قدرے زیادہ تھی مگر ذائقہ تھا۔

''یہ سب فطرت سے کتنا قریب ہے۔!'' قدیر نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ فضا میں مٹی کی مہک اور کہیں دور چکی چلنے کی آواز گھلی ملی تھی۔

''سادگی فطرت ہے اور ہماری اصل کا حصہ۔ اس لئے جہاں مل جائے ہمیں اپنا لیتی ہے۔!'' میں نے کہا۔

''جیسے محبت۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''ہر انسان کی فطرت میں محبت کا عنصر ہے۔ وہ اندر سے محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ فقط خول توڑنے والا کوئی اخلاص والا چاہئے ہوتا ہے۔!''

''محبت کی طلب تو ازل سے ہے، جب ہی تمہاری کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' اتنی تیزی سے بکی، ہر آدمی اپنی تفہیم چاہتا ہے۔ کئی لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کی تقریب رونمائی کروائیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟'' قدیر نے پوچھا۔

''جیسا مناسب سمجھ کر لو۔!'' میں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''ویسے تقریب رونمائی ضروری ہے کیا۔؟''

''سچ پوچھو تو یہ کتاب کی پبلسٹی کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ بعض کتابیں اہم ہوتی ہیں۔ ان کی طرف توجہ دلانا ضروری ہوتا ہے۔ بعض کتابوں کو بکوانے کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اخبارات کو ریج دے دیتے ہیں۔ اور بعض کتابیں سچ مچ اس قابل ہوتی ہیں کہ انہیں سراہا جائے۔ سو یہ مختلف خیالات ہیں بزم آرائی کے۔!'' قدیر ہنسا۔

اسی وقت میرے موبائل پر بیل ہوئی۔ ''ہیلو۔۔۔ اسلام علیکم۔۔!'' میں نے کہا۔ دوسری طرف مومی تھی۔ ''کیسی ہو۔؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ لیکن آپ کب آئیں گے۔ میں بہت اداس ہو گئی ہوں۔!'' مومی کی روہانسی آواز آئی۔

''ابھی الیکشن تک تو آنا مشکل ہے۔'' میں نے کہا اور پوچھا۔ ''اماں کیسی ہیں۔؟''

''اب میں فون کر رہی ہوں تو سب کا خیال آ رہا ہے۔!'' وہ غصے سے بولی۔ ''خود سے فون نہیں کیا جاتا۔؟''

''اچھا معاف کر دو۔!'' میں نے کہا۔ ''تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں فون کا کتنا چور ہوں۔!'' میں نے معذرت کی۔

''اماں ٹھیک ہیں۔ تھوڑا بلڈ پریشر زیادہ تھا۔ مگر اب ٹھیک ہے۔ نرگس تو ان کی خوب خدمت کر رہی ہیں۔ سچ بہت اچھی ہیں۔ اتنی پیاری سی۔!'' مومی نے اچانک پٹڑی بدل لی۔

''چلو میری طرف سے اماں کو سلام کہنا اور نرگس کو بھی۔'' میں نے کہا۔ اس نے بھی سلام کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''چلو گھر چلیں۔!'' میں نے کہا۔ ''خادم حسین انتظار کر رہا ہوگا۔''

''چلو۔۔۔!'' قدیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے گھر آ گئے۔ راستے میں کئی لوگ ملے، سب نے بڑے تپاک سے سلام دعا کی۔

جب گھر پہنچے تو وہاں دو تین خواتین اور ایک بیس بائیس سال کی لڑکی بڑے کمرے میں موجود تھیں۔ لڑکی رُو رہی تھی۔ جبکہ کشور اس کو پانی پلا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت ہاتھ نچا نچا کر کسی غیر موجود شخص کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ سب بیک وقت خاموش ہو گئیں۔

ہمیں دیکھ کر کشور ہماری طرف آئی۔ اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ ''خیریت تو ہے نا۔۔؟'' میں نے کشور سے پوچھا۔

''ہاں جی۔۔۔!'' کشور نے جواب دیا۔ ''تانی شہر سے آئی ہے۔ تو باجی سے ملنے کے لئے آ گئی۔ ان کی بچپن کی سہیلی ہے۔ ایک اس کی ماں ہے۔ ایک خالہ اور ایک پڑوسن ہماری۔!'' کشور ہمیں جواب دیکر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں ہی باہر سے آنے والی آوازوں کا شور تھم گیا۔ چند منٹوں کے بعد کشور نے کمرے میں جھانکا اور پوچھا ''آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہے تو کھانا لگاؤں۔؟''

''بھوک تو نہیں لگ رہی۔ اس لئے کھانا ہم سب ساتھ ہی کھائیں گے۔ البتہ اگر چائے مل جائے تو اچھا ہے۔!'' میں نے کہا۔

''اچھا ابھی لاتی ہوں۔!'' کشور کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ہم لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔۔۔!'' میں نے گفتگو کے دوران ہی کہا۔ کسی نے ٹرے ہمارے درمیان رکھی۔ سیاہی مائل گہری کتھی رنگ کی ٹرے کو دو بے حد خوبصورت لانبی انگلیوں والے ہاتھ تھامے تھے۔ یہ کشور تو نہیں تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ کشور کی بڑی بہن تھی۔ تاج ور۔ ''آپ۔۔۔؟''

''جی کشور ذرا تانی کو چھوڑنے گئی ہے اس لئے چائے میں لے آئی۔!''

''مجھے آواز دے لیتیں۔!''میں نے کہا۔

''اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔!''وہ آہستہ سے بولی۔''اس کی آواز میں بڑی نغمگی تھی۔''کیا خادم حسین نہیں ہیں۔''اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔''میں بھائی کے لئے بھی چائے لائی تھی۔''

''وہ تو موجود نہیں ہیں۔لیکن اگر آپ چاہیں تو اس بھائی کے ساتھ چائے پی سکتی ہیں۔!''قدیر نے مسکرا کے کہا۔

''کیوں نہیں۔۔۔!''وہ مسکرائی اور ایک مونڈھے کو گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ بہت صبیح، بہت ملائم تھا۔بالکل تازہ تازہ سا، اخروٹی بال جو کنپٹیوں پر کس کر، کھینچ کر باندھے گئے تھے۔اس کے چہرے کی رنگت سے بہت مناسبت رکھتے تھے۔ستوان ناک میں کالی ڈوری کے ساتھ بندھا ہوا ننھا سا سرخ موتی، پیازی ہونٹوں پر باریک باریک سی افقی لکیریں۔اس کے حسن میں ایک عجیب سا بانکپن تھا۔تازگی اور سادگی کا۔

''تانی کیوں رو رہی تھی؟۔''میں نے پوچھا۔

''اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔''تاجور نے بتایا۔

''لیکن کیوں۔۔؟''قدیر نے سوال کیا۔

''شائد محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔''اس نے دھیرے سے کہا۔

''کیا مطلب۔؟''قدیر نے پوچھا۔''میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ عدم محبت ہے۔؟''

''معلوم نہیں۔!''وہ آہستہ سے بولی اور اپنا کپ اٹھا کر گھونٹ لیا۔اس کی سپید انگلیوں میں فاختی رنگ کا کپ بہت اچھا لگا۔وہ آہستہ سے بولی''دو سال پہلے یہاں ایک رورل ہیلتھ سنٹر بن رہا تھا۔اس کا کوئی بندہ تھا۔اس کی تانی سے سلام دعا ہو گئی، پھر اس نے رشتہ مانگ لیا اور یوں تانی بیاہ کر شہر چلی گئی۔مگر شادی کے چند ہی ہفتوں کے بعد تانی جاہل، اجڈ اور گنوار ثابت ہو گئی۔اولاد ہوئی تو وہ بھی لڑکی اور مری ہوئی۔یوں رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔اور اس بار تو اس نے کاغذ دیکر بھیج ہی دیا۔!''

کمرے میں محبت کے اس دردناک انجام سے فضا جیسے سوگوار ہو گئی۔تھوڑی دیر خاموشی رہی۔پھر قدیر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟۔''

''پوچھئے۔۔۔!''

''یہ گاؤں کی لڑکیاں شہری لڑکوں کی محبت میں کیوں گرفتار ہو جاتی ہیں۔؟''

''یہ محبت ہوتی ہی نہیں۔۔!''تاجور نے جواب دیا۔''یہ سحر زدگی اور حیرانی کی ایک واردات ہوتی ہے۔!''

''کیا۔۔۔؟''تاجور کی بات ایسی تھی کہ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔''کیا مطلب ہے اس بات کا۔؟''

''اب آپ لوگ برا نہ مانئے گا۔!''تاجور نے دھیمے سے کہا۔پھر چند لمحے کے وقفے کے بعد گویا ہوئی۔

''گاؤں کی فضا ٹھہری ہوئی، سادہ ہوتی ہے۔ دوٹوک گفتگو، ہاں اور نہیں۔ کے واضح اشاروں کے ساتھ۔ براہ راست۔ جب شہری لڑکے اپنے خوبصورت کپڑوں میں، گاؤں کے تروتازہ چہرے دیکھتے ہیں، سادگی دیکھتے ہیں تو اس سادگی کو چالاکی سے حاصل کرنے کے لئے باتوں کے وہ طوطا مینا اڑاتے ہیں کہ ساری فضا رنگین ہوجاتی ہے۔ اُپلوں کی بو، تعریف کے رنگوں میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ اور گاؤں کی سادہ لڑکی ان کی اس تیز رفتار پیش رفت پر ایک سحر زدگی کے عالم میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ گاؤں کی عورت پر ذمہ داریاں، فرائض اتنے لاد دیئے جاتے ہیں کہ تعریف اور ستائش کی چھاؤں کہیں زندگی میں ہوتی ہی نہیں۔ وہ اس طاقت ور مقناطیسی جال میں پھنس جاتی ہیں۔ تعریف کے جادوگر لفظوں کے طلسم سے ایسا سحر زدہ کردیتے ہیں کہ مارے حیرت کے ان کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ اور اسی عالم میں وہ اپنی مروجہ حدوں سے باہر نکل جاتی ہیں۔ مگر جب ایک دوسرے کے ذہنی تضادات، معاشرتی حقائق سامنے آتے ہیں تو پھر دونوں ہی اس حقیقت کا سامنا نہیں کر پاتے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رشتے ختم ہوجاتے ہیں۔!''

میں حیران سا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ کتنی گہری نگاہ اور سوچ تھی اس کی۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے عام لڑکیوں سے مختلف لگی۔ میں اور قدیر اس کی باتوں میں گم تھے۔

''شائد آپ کو میری بات پسند نہیں آئی۔!'' تاجور نے کہا۔

''یہ بات نہیں۔۔! ہم تو آپ کے تجزیئے پر حیران ہیں۔''

''کیوں۔۔ کیا میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی؟'' تاجور نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی بے ساختگی میں ایک معصومیت تھی۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔!'' قدیر نے کہا۔ ''بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ بظاہر آپ اتنی سادہ سی، کم عمر سی ہیں۔ لیکن آپ کا تجزیہ یہاں کے سماجی، اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔''

''میں نے نفسیات میں ماسٹر کیا ہے۔!'' تاجور مسکرائی۔ ''اور میری عمر چوبیس سال ہے۔ میں شہر میں رہی ہوں۔ ہوسٹل میں پڑھائی کے دوران بہت دیکھا، بہت سیکھا۔ تعلیم سے آپ سیکھ بھی سکتے ہیں اور سکھا بھی سکتے ہیں۔ تعلیم مکمل کر کے واپس آئی تو بھائی کے ساتھ اسکول میں بچوں کو پڑھانے لگی۔!'' اس نے نہایت اطمینان سے اپنا پس منظر بیان کیا۔

''ایک ذاتی سوال پوچھوں۔؟ اگر آپ برا نہ منائیں۔'' قدیر نے پوچھا۔

''پوچھئے۔۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ سوال تو حقائق کو سمجھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔!'' وہ بڑی رسانیت سے بولی۔ تاجور میں ہر پل حیران کرنے کی صلاحیت تھی۔

''آپ نے کبھی محبت کی۔۔۔؟''

''محبت۔۔۔!'' وہ کسمسا کر رہ گئی۔ ''میں پیاسی نہیں ہوں۔!''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''مجھے بہت محبت ملی، اعتبار ملا۔ میری ہر آرزو بابا نے، بھائی نے اپنے وسائل میں رہ کر پوری کی، ہمارے ہاں محبت نہیں ہوتی۔ بس پیاس بجھانے کی خواہشیں ہوتی ہیں۔ ماننے اور منوانے کی خواہش، اپنا آپ ظاہر کرنے اور ستائش کی آرزو، اگر یہ سب گھر میں مل جائے تو پھر پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ محبت اور مروت میں فرق ہی نہیں کر پاتے۔ وہ مروت کو محبت کا نام دے کر نبھائے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک دن انہیں احساس ہوتا ہے کہ ارے یہ شخصیت جو مجھے اب ملی ہے۔ یہ مجھ کو مکمل کر دے گی۔ میں اب تک جس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ تو ایک سایہ تھا۔ دھوکا تھا۔ صحرا میں نخلستان کا سراب۔۔!''

''لیکن پھر بھی محبت تو ہے نا۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔

''میں محبت سے کب انکار کرتی ہوں۔ محبت تو وہ ہوتی ہے۔ جو سیراب کر دے۔ جس کے بعد تسکین کا احساس ہو۔ جس میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہو۔ جس میں آپ مر جائیں اور اُف نہ کریں۔''

''آپ کے یہ خیالات، یہ افکار بہت منزہ، بہت قابل قدر ہیں۔!'' قدیر نے کہا اور پوچھا۔ ''کس مصنف کو آپ نے سب سے زیادہ پڑھا ہے۔ کس کے اثر کو زیادہ قبول کیا ہے۔؟''

''حجتہ الاسلام ابو محمد غزالی، علامہ جوزی اور مرشد کریم قادری سرکار نے میری تربیت کی ہے۔!'' تاجور نے بہت عقیدت، بہت محبت سے جواب دیا۔ ''جب میں رسائل غزالی پڑھتی تھی۔ یا علامہ جوزی کو، یا پھر ابن رُشد کو، تو جہاں جہاں سمجھ نہیں پاتی تھی وہ مقامات قادری سرکار اتنے پیار سے سمجھا دیتے کہ سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا تھا۔''

''قادری سرکار۔؟'' قدیر نے استفہامیہ انداز میں اس کو دیکھا۔

''ہمارے مرشد، جن کے یہ خلیفہ جی ہیں۔!'' تاجور نے بڑی عقیدت سے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔

''سرکار خواتین سے ملتے ہیں۔؟'' قدیر نے سوال پوچھا۔

''خواتین سے نہیں ملتے۔!'' تاجور مسکرائی۔ ''وہ ماں سے، بہن سے، بیٹی سے ملتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پیر کا کنبہ ساری دنیا ہوتی ہے۔ اور اس دنیا کی ساری آبادی خاتون امانت دار کے بغیر ممکن نہیں۔ عورت تو انبیاء کی گزرگاہ ہے۔ اس کا احترام، اس کا اکرام واجب ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مردوں سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ بھلی عورت ہی ایک بھلی نسل کو پروان چڑھا سکتی ہے۔!''

''بہت عمدہ۔۔۔!'' قدیر نے بے ساختہ تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''ایک وہ ہیں جو کہ خواتین کو اپنا چینل تک دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے کس قدر تضاد آمیز معاملات ہیں۔!''

''کوئی تضاد نہیں۔۔۔!'' میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی۔ ''فرق صرف نکتۂ نظر کا ہے۔ ایک بار یہ سوچ لیں کہ عورت اپنی بیوگی کا سارا وقت، اپنی طلاق کے بعد تنہائی کا زمانہ کس وقار سے گذارتی ہے۔ وقتِ مرگ تک کوئی اس کے کردار پر انگلی اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ لیکن صرف خیال پر مواخذہ، صرف تصور پر قدغن، یہ نہ صرف فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ بلکہ اسلامی فلسفے کی روح کے بھی خلاف

ہے۔ بھروسہ اور اعتماد، ان ہی ستونوں پر انسانی معاشرت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ ورنہ جتنی آسانیاں گناہ کی مردوں کو حاصل ہیں۔ جتنے مواقع مرد کے پاس ہوتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی خواتین کو نہیں ملتا۔ وہ تو سارا دن ماں کی، ٹیچرز، شوہر کی، ساس، نندوں کی نگرانی میں رہتی ہیں۔ جتنی کھوجنے والی نظریں خاتون کی حرکات پر متحرک ہوتی ہیں۔ مرد تو ان کا سامنا ہی نہیں کرتے۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں خلیفہ جی۔۔۔!'' تاجور نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر کھٹکا ہوا اور کشور اندر آ گئی۔ ''ارے آپ لوگوں نے چائے پی بھی لی۔!'' وہ بولی۔ ''لائیے میں برتن اٹھاؤں۔!'' اس نے کپ لے کر ٹرے میں رکھے۔ ''چلیں باجی کھانے کی تیاری کریں۔''

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا اور ہمیں سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ تاجور کے پیچھے پیچھے کشور بھی برتن اٹھانے چلی گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد قدیر نے کہا۔ ''یار ہم شہر والے کچھ غلط تو نہیں سوچتے ہیں۔؟''

''کیا۔۔۔؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھا۔

''یہی کہ گاؤں والے جاہل ہوتے ہیں۔ بے وقوف ہوتے ہیں۔ کسی بات کو گہرائی سے نہیں سمجھتے۔!'' قدیر نے سر کھجایا اور میری طرف دیکھا۔

''شائد۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔ ''بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن اگر تعلق رکھا جائے، خیالات کو ایک دوسرے سے بانٹا جائے تو پھر اس خلیج کو نا صرف یہ کہ دور کیا جا سکے گا۔ بلکہ دیہاتی اور شہری کی جو تفریق ہم نے از خود کر رکھی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔!''

''صحیح کہتے ہو۔!'' قدیر نے کہا۔

اسی وقت خادم حسین تین چار افراد کے ہمراہ اندر آ گیا۔ وہ سب بہت پُر جوش ہو رہے تھے۔

''کیا خبر ہے۔؟'' میں نے ان کے تمتماتے ہوئے چہرے دیکھ کر خادم حسین سے سوال کیا۔ ''بہت پُر جوش ہو رہے ہیں آپ سب، کیا کوئی اہم واقعہ ہو گیا ہے۔؟''

''بالکل۔۔۔!'' شریف حلوائی نے کہا۔ ''مخالف اُمیدوار علی مراد نے بندہ بھیجا ہے۔ وہ جی دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ اپنے خادم حسین کے حق میں۔!''

''اچھا۔۔؟'' میں نے کہا۔

''یہ تو زبردست خبر ہے۔!'' قدیر بھی پُر جوش ہو گیا۔ ''خادم حسین یہ ہماری بہت اہم کامیابی ہے۔!''

''لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ علی مراد میرے حق میں کیوں دستبردار ہوا۔ اصولاً تو اس کو عبداللہ شاہ گیلانی کے حق میں دست بردار ہونا چاہیے تھا۔ وہ سب سے طاقت ور، اور دولت مند، با اثر امیدوار ہیں۔!'' خادم نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ اس کا یہ نکتہ ایسا تھا کہ سب ہی سوچ میں پڑ گئے۔ اچانک جیسے خاموشی سی چھا گئی۔

تب ہی اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔اور میں نے کہا۔''علی مراد دست بردار ہونے کی وجہ تمہارے اپنے سوالوں میں موجود ہے۔''

''کیا۔۔؟''وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''تم نے کہا کہ علی مراد کو عبداللہ شاہ گیلانی کے حق میں دستبردار ہونا چاہیے۔کیونکہ وہی سب سے طاقت ور اور دولت مند امیدوار ہیں۔اب سنو!۔علی مراد اگر ان کے حق میں دست بردار ہوتا تو اس پر ہر صورت دو الزام لگ جاتے۔پہلا یہ کہ وہ پیسے لیکر ان کے حق میں بیٹھ گیا ہے۔دوسرے یہ کہ وہ ان سے ڈر گیا ہے۔یوں اگر وہ جنرل الیکشن میں دوبارہ کھڑا بھی ہونا چاہتا تو اس کی ساکھ کو ختم ہو جانا تھا۔جبکہ تمہارے حق میں دست بردار ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس پر نہ تو خوف زدہ ہونے کا الزام لگے گا۔اور نہ ہی پیسے لیکر بیٹھنے کا۔بلکہ اگر تم جیت بھی گئے تو دلی طور پر اس کے احسان مند رہو گے۔!''

''بالکل ٹھیک۔۔بالکل ٹھیک۔۔خلیفہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ایسا ہی ہونا تھا۔!''وہ لوگ میرے تجزیئے سے متفق ہو کر بیک وقت بولنا شروع ہو گئے۔

''لیکن۔۔!''میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کیا۔وہ سب خاموش ہو گئے۔''لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس دست برداری کا فائدہ خادم حسین کو ہو گا یا پھر عبداللہ شاہ گیلانی کو۔۔؟''میں نے سوال کیا۔

''خلیفہ جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔!''اللہ دتہ نے کہا۔''واقعی یہ بات تو سوچنے کی ہے۔!''

میں نے ان کے پُرسوچ چہروں پر نگاہ ڈالی۔وہ سب لمحے بھر میں اداس ہو گئے۔سچے اور سادے لوگ۔

''لیکن۔۔۔!''میں نے انہیں صورت حال کے دوسرے پہلو کی جانب متوجہ کیا۔''لیکن ہم اس سے ایک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔وہ فائدہ ہے اخلاقی برتری کا۔ہم سب اس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں کہ،کیونکہ جیتنا خادم حسین کو ہی ہے۔اس لئے یہ ہارنے کی شرمندگی سے بچنے کے لئے خود ہی الیکشن سے دست بردار ہو گیا۔!''

''زبردست۔۔!''حافظ سلمان نے کہا۔''بہت اچھی حکمت عملی مرتب کی ہے اپنے خلیفہ جی نے۔!''

''لیکن اس دست برداری کو فوراً میڈیا تک پہنچ جانا چاہیے۔!''قدیر نے کہا۔''اس بات کو جلد سے جلد پھیلانا بہت ضروری ہے۔!''

''لیکن کس طریقے سے۔!''ساری نگاہیں قدیر کی جانب سوالیہ ہو گئیں۔

''کیا علی مراد سے ٹیلی فون پر رابطہ ممکن ہے۔؟''قدیر نے پوچھا۔

''ہاں اس کا ایک بندہ میری بیٹھک میں موجود ہے۔!''رفیق الدین نمبردار نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو اس کو بلوائیں۔''قدیر نے کہا۔

نمبردار نے ایک آدمی کو فوراً ہی دوڑایا۔ قدیر نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ قدیر نے باہر آ کے مجھ سے کہا۔ ''یار یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کو فوراً پریس تک پہنچانا ضروری ہے۔ ایک تو مجھے علی مراد کی کوئی تصویر چاہیے۔ دوسرے یہ کہ میں ابھی احمد عبدالحئ سے رابطہ کر کے اس کو یہ بات بتاتا ہوں۔ اور اس کو کانفرنس لائن پر لیکر علی مراد سے اس کی بھی بات کروادوں گا۔ اور تصویر بھی فوراً بھیج دوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟۔''

''منصوبہ تو بہت عمدہ ہے!'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے علی مراد سے بات بھی تو کرنا چاہیے۔!''

''ٹھیک ہے۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''پہلے میں ذرا احمد عبدالحئ سے بات کرلوں۔!'' وہ اپنے موبائل پر احمد عبدالحئ کے نمبر پش کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ بحال ہو گیا۔ ''ہیلو اسلام علیکم کیسے ہیں آپ؟''

''کیا حال ہے بھئی قدیر کہاں ہو۔؟'' احمد عبدالحئ کی پُر جوش آواز سنائی دی۔

''میں ضمنی الیکشن کے سلسلے میں تنزیل کے ساتھ آیا ہوا ہوں۔!'' قدیر نے بتایا۔

''اچھا۔۔! وہاں تو زبردست معرکہ چل رہا ہوگا۔!'' احمد عبدالحئ نے کہا۔ ''لیکن تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو۔؟''

''ایک خبر دینی تھی بلکہ اس کو فوراً ہی ٹیلی کاسٹ کروانا ہے۔!''

''کوئی معرکہ سر کرلیا کیا۔؟'' احمد عبدالحئ نے پوچھا۔

''معرکہ ہی سمجھئے۔!'' قدیر ہنسا۔ ''خادم حسین کے مقابلے میں علی مراد نے الیکشن سے دست برداری کا اعلان کر دیا ہے۔''

''یہ تو زبردست نیوز ہے۔ لیکن یہ تو اس کی طرف سے اعلان ہونا چاہیے۔!'' احمد عبدالحئ نے کہا۔ ''ورنہ پھر خبر افواہ بن جاتی ہے۔!''

''یہاں کیمرے وغیرہ تو نہیں پہنچ سکتے۔ میں اس کو کانفرنس لائن پر دوران گفتگو ہی لے لونگا۔ آپ اس سے سوال جواب کر لیجئے گا۔ تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں۔!'' قدیر نے اپنی بات وضاحت سے بیان کی۔

''ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کے اندر مجھے رابطے میں لے لو۔!'' احمد عبدالحئ نے کہا۔ ''میں اس کو پروگرام میں آج ہی شامل کرلونگا۔''

''میں تھوڑی دیر میں ہی فون کرتا ہوں۔ وہ آپ سے ڈائریکٹ ہو جائے گا۔!'' قدیر نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اتنی دیر میں ایک آدمی کمرے سے باہر نکل کر ہماری طرف آیا۔ ''آپ کو نمبردار صاحب بلا رہے ہیں!۔'' اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے میں آ گئے۔ وہاں علی مراد کا بندہ آیا ہوا تھا۔ ہم نے اس سے سلام دعا کی، خادم حسین نے تعارف کرایا۔

''یہ ہمارے قادری سرکار کے خلیفہ ہیں۔ خانقاہ سے تشریف لائے ہیں۔ اور یہ علی مراد کے منشی جی ہیں علی مراد کا پیغام لائے ہیں۔!''

''میں تو جی سرکار کا خادم ہوں۔ سارے علاقے میں خلیفہ جی کی آمد کی خبر پھیلی ہوئی ہے۔ سرکار کا بچہ انتخاب لڑ رہا ہے تو پھر کوئی اور کیسے جیت سکتا ہے جی۔ دنیا والوں سے تو لڑا جا سکتا ہے جی، اللہ والوں سے کون لڑ سکتا ہے جی۔!'' منشی کو ہر بات میں جی کہنے کی عادت تھی۔

''ہمارے علی مراد جی تو سرکار جی سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ وہ خادم حسین کے حق میں بغیر کسی لالچ، کسی مطلب، دستبردار ہو رہے ہیں۔''

''یہ تو جی ان کی محبت ہے۔!'' غلام حسین نے مسکرا کے کہا۔ ''اللہ والوں سے محبت کا صلہ تو اللہ ہی دے سکتا ہے۔ ہم تو صرف خدمت ہی کر سکتے ہیں۔ دعا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علی مراد کو من مانگی مرادیں دیں۔!''

''بس ہمارے مراد جی کو دعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔!''

''کیا آپ ان سے ہمارا رابطہ کروا سکتے ہیں۔'' قدیر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں جی۔۔۔!'' منشی نے کہا۔ اور جیب سے موبائل نکال کر نمبر دبانے لگا۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ ''جی حضور میں منشی بات کر رہا ہوں۔ میں خادم حسین کے ڈیرے پر ہی ہوں جی۔ خلیفہ جی آپ سے سلام دعا کرنا چاہتے ہیں۔!''

اتنی دیر میں قدیر اپنے موبائل پر تیار ہو چکا تھا۔ ''میں خود علی مراد جی کو فون کرتا ہوں۔!'' قدیر نے فون پر کانفرنس لائن آن کر لی تھی۔ اس نے لائن ہولڈ کر کے علی مراد کے نمبر پش کیے۔ فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔

''السلام علیکم!'' قدیر نے کہا۔ ''ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

''نہیں جی شکریئے کا کیا ہے۔ خادم حسین بھی ہمارا ہی بچہ ہے۔ اب اپنے بچوں کی جی رعایت تو دینا ہی پڑتی ہے۔!'' علی مراد کا انداز بڑا رحم کرنے والا تھا۔

''اس کے لئے بھی شکریہ۔ ہمارے ایک صحافی دوست آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔

احمد عبدالحئی نے اس سے کوئی پانچ سات منٹ گفتگو کی، اس کے بعد قدیر نے خدا حافظ کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران سب خاموشی سے قدیر کی طرف دیکھتے رہے۔ قدیر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بات ہو گئی ہے۔ علی مراد صاحب کا ہماری طرف سے شکریہ بھی ادا کر دینا اور کہنا کہ ہم لوگ بہت یاد رکھیں گے۔ ان کے اس تعاون کو۔ بلکہ یہ سارا علاقہ ہی ان کی عزت پہلے سے بڑھ کر کرے گا۔!''

''اچھا جی اجازت۔۔!'' منشی بڑا جہاندیدہ تھا۔ سمجھ گیا کہ ہم اس کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ وہ اٹھا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

منشی کے جاتے ہی سب لوگ اچانک ہی بولنا شروع ہو گئے۔ قدیر نے تیزی سے میسج ٹائپ کیا اور احمد عبدالحئی کو روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے علی مراد کا ایک پوسٹر منگوایا۔ اور علی مراد کی تصویر اپنے موبائل سے کھینچ کر وہ بھی احمد عبدالحئی کو بھیج دی۔ پھر اپنی گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''ذرا یار ٹی وی تو آن کرو۔!''

خادم حسین سے پہلے کسی نے لپک کر ٹیلی ویژن کو آن کر دیا۔ اور ریموٹ قدیر کو تھما دیا۔ قدیر نے نیوز چینل کو ٹیون کیا اور سب سکرین کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کوئی تجزیاتی پروگرام چل رہا تھا۔ خبروں کے ٹکر چل رہے تھے۔ اچانک تازہ ترین کے فلیش کے بعد ٹکر چلنے لگا۔ ''ضمنی الیکشن کے اہم امیدوار علی مراد عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔ ٹکر پڑھتے ہی پورا کمرہ مبارکباد اور سلامت باد سے گونج اٹھا۔ کئی لوگوں نے تو اٹھ کر خادم حسین کو کمر سے پکڑ کر اونچا اٹھا لیا۔

''زندہ باد۔ ہمارا خادم زندہ باد۔ آوے گا بھئی آوے گا۔۔ جیتے گا بھئی جیتے گا۔ حسینؓ کا خادم جیتے گا۔۔۔ قوم کا خادم جیتے گا۔''

کمرہ پُر جوش آوازوں اور گرمجوش جذبات سے جیسے بھر گیا۔ حنیف صحرائی کمرے میں داخل ہوئے ''بھئی کمال کر دیا یہ کس نے میڈیا کو خبر پہنچائی۔!''

''اپنے قدیر بھائی نے۔!'' کسی نے کہا۔

''خدا کی قسم مزہ آ گیا۔ اب علی مراد کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر کہیں وہ پھر نہ جائے۔!'' حنیف صحرائی نے تشویش ظاہر کی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ بڑا پکا بندوبست کیا ہے۔ ذرا ہی دیر میں بریکنگ نیوز دیکھئے گا۔'' قدیر نے اپنے فون پر کوئی پیغام پڑھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت بریکنگ نیوز کے مخصوص ردھم نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

نیوز کاسٹر اسکرین پر نمودار ہوا۔ ''ہم اپنے ناظرین کے لئے ضمنی الیکشن کے حوالے سے اہم نیوز پیش کر رہے ہیں۔ علی مراد عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی فلش بیک سے علی مراد کی تصویر اسکرین پر ابھری۔ یہ وہی تصویر تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے قدیر نے اپنے فون سے کھینچ کر بھیجی تھی۔ ساتھ ہی سوال جواب ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔

''آپ نے عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبرداری کا فیصلہ کیوں کیا۔؟''

''اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ خادم حسین واقعتاً عوامی نمائندے ہیں اور ان کو آگے آنا چاہیے۔''

''یہ کیا اس کے لئے انہوں نے کچھ کہا تھا۔؟''

''نہیں اس معاملے میں ان سے کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''آپ اپنے ووٹرز کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔؟''

''میں ان سے یہی کہوں گا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کریں، اور خادم حسین کو ووٹ دیں۔ کامیاب کریں۔ کیونکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حقیقی عوامی نمائندے ہی اسمبلیوں میں بھیجیں۔ جو ہمارے عوام، ہمارے مفادات کے نگران ہوں نا کہ اپنے ذاتی مفادات کے۔''

''دیکھا خادم حسین دعائیں کیسے کیسے رنگ لاتی ہیں۔ تمہیں اتنے بڑے نیوز چینل پر کوریج مل گئی ہے کہ اب تمہیں واقعی، کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔'' حنیف صحرائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سرکار کی دعاؤں نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔!''

''یہ سب مرشد کی نظر کرم کا نتیجہ ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے ہمارے مرشد۔'' غلام حسین نے جھوم کر کہا۔

اچانک گلی میں شور ہونے لگا۔ پھر کئی لوگوں کے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ ''جیت گیا بھئی جیت گیا خادم حسین جیت گیا۔''

''دیکھو لڑکوں نے تمہاری کامیابی کا جلوس بھی نکال لیا ہے۔!'' ماسٹر فدا حسین نے کہا۔ ''اب تو منہ میٹھا کراؤ۔!''

''لو جی منہ میٹھا کرو۔!'' شریف حلوائی اسی وقت لڈوؤں کا تھال لیکر اندر داخل ہوا۔ میں نے تو ٹی وی پر دیکھا، خدا کا شکر ہے کہ لائٹ آئی ہوئی تھی تمہاری بھاوج کہنے لگی، چلو جلدی چل کر مبارکباد دے آئیں۔'' شریف حلوائی نے بتاتے ہوئے تھال میرے آگے کیا۔ ''خلیفہ جی بسم اللہ کیجئے۔!''

میں نے ایک لڈو اٹھالیا۔ قدیر نے بھی لڈو اٹھالیا۔ اسی وقت قدیر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ قدیر نے فون ریسیو کیا۔

''یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔!'' دوسری طرف سے علی مراد کی غصے بھری آواز اُبھری۔ قدیر نے اسپیکر آن کر دیا۔ سب فون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ علی مراد کہہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دورِ حاضر کے مسائل کے پس منظر میں لکھا گیا
محترمہ شمع حفیظ کا شاہکار رومانی ناول

تم ہو میرا آسمان

اب ماہانہ نہیں بلکہ ہر دس دن کے بعد
1st, 11th & 21st
کتاب گھر پر نئی قسط پیش کی جائے گی۔
http://kitaabghar.com

بطور خاص کتاب گھر قارئین کے لیے لکھا گیا
عشناء کوثر سردار کا بہت خوبصورت اور طویل ناول

اعادہ جاں گزارشات

آپ کو ایک ماہ انتظار کی ضرورت نہیں ہوگی، یہ اقساط
ہر جمعہ کتاب گھر پر پیش کی جائیں گی۔
http://kitaabghar.com

پست قامت عقلوں میں نکو

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔!'' فرحان نے بے بسی سے کہا۔

وہ اس وقت خانقاہ سے واپس آ رہے تھے۔ وہاں جو عبداللہ شاہ گیلانی اور قادری سرکار کی گفتگو ہوئی تھی۔ اور جس طرح دونوں نے ایک دوسرے سے معاملات کو پرکھا سمجھا تھا۔ یہ سارا معاملہ فرحان یعقوب کی عقل سے ماورا تھا۔

''قادری سرکار روشن ضمیر صاحب ادراک ہستی ہیں۔ فرحان تم کتنے خوش قسمت ہو کہ ان سے ملتے رہے، ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''ہاں ملتا تو میں بے شک رہا ہوں۔ مگر جو کچھ آج میں نے تمہارے حوالے سے دیکھا ہے۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔'' فرحان یعقوب نے صاف گوئی سے کہا۔ ''جس اپنائیت کا مظاہرہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہاری قسمت پر رشک آ گیا۔!'' فرحان یعقوب کے لہجے میں بے پناہ عقیدت تھی۔ ''تم میں ضرور کچھ خاص ہے۔!''

''پتا نہیں۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''یہ تو ان کا نظر کرم ہے۔ ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔!''

''وہ جوہری ہیں۔ ہیرے کی قدر جانتے ہیں۔ پارس ہیں۔ مس خام کو کندن بنا دیتے ہیں۔ بھٹی میں جلا کر کندن بنا کر واپس کرتے ہیں۔ شائد ہم میں کچھ نہیں۔!'' فرحان یعقوب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''ابھی تو منزل بہت دور ہے۔!''

''یار تم یونہی دل برداشتہ ہو رہے ہو۔'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اس کو دلاسہ دیا۔ ''میں کون سا ان کا مرید ہو گیا ہوں۔؟''

''یار عبداللہ میں تم سے حسد نہیں محسوس کر رہا۔ بلکہ تم پر، تمہاری قسمت پر رشک کر رہا ہوں۔ خوش ہو رہا ہوں۔ میرے دوست میں ایسی خصوصیت ہے جو اس کو دوسروں سے الگ کر دیتی ہے۔!''

عبداللہ شاہ کچھ نہ بولا۔ بس خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں فرحان کا گھر آ گیا۔ کار کا ہارن سنتے ہی گن مین نے دروازہ کھولا۔ اس کے عقب سے بالا برآمد ہوا۔ فرحان نے گاڑی اندر پورچ میں لے جا کر کھڑی کی۔

''یار مجھے اجازت دو۔!'' عبداللہ شاہ نے اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''خیریت۔۔؟ کھانا کھالو۔'' فرحان یعقوب نے حیرت سے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو قادری سرکار کے ہاں کھانا کھایا ہے۔ اس لئے قطعاً بھوک نہیں ہے۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہونگے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''چلو۔۔کوئی بات نہیں۔!''فرحان یعقوب نے خوش دلی سے کہا۔''اب کب ملاقات ہو رہی ہے۔؟''

''انشاء اللہ جلدی۔۔!''عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا اور ہاتھ ملا کر واپس ہو گیا۔ بالا پیچھے گاڑی لئے کھڑا تھا۔اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور فرحان یعقوب کو خدا حافظ کہتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔بالے نے سائڈ سے گاڑی باہر نکالی اور سڑک پر آ کر اس نے رخ اپنی مطلوبہ سمت کر دیا۔

گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔بالے نے کنکھیوں سے عبداللہ شاہ گیلانی کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر اس قدر خاموشی تھی کہ بالا کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھے۔آج اسے شاہ عبداللہ گیلانی بہت مختلف لگ رہا تھا۔یوں جیسے ایک سمندر جو اوپر سے بہت پرسکون ہو،مگر اس کے اندر سونامی جنم لے رہا ہو۔بالے کی چھٹی حس نے بتایا۔عبداللہ شاہ گیلانی بدل گیا ہے۔مگر کیا بدل گیا ہے۔یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ بھی نہیں جانتا تھا جو شاہ ہارون کے رازوں کا امین تھا۔

''یہ خادم حسین کون ہے۔؟''عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

بالا چونکا۔ایک نظر عبداللہ شاہ گیلانی پر ڈالی اس کی سوالیہ نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔''الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔لیکن دمڑی پاس نہیں۔کوئی جلسہ،کوئی جلوس،کوئی ہلچل نہیں ہے۔!''

''اچھا۔۔۔!''عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہرا سانس لیا۔''اور یہ علی مراد کی کیا پوزیشن ہے۔؟''

''جی علی مراد زمین دار ہے چھوٹا موٹا۔اس کو ملک ریاض سپورٹ کر رہا ہے۔علی مراد اور ملک کی دوستی بڑی پرانی ہے جی۔جب ملک ریاض نے شوگر مل لگائی تھی تو گنے کی ساری سپلائی اس کے ذریعے لیتا تھا۔اس میں علی مراد نے بڑا پیسہ بنایا۔پھر بھی زیادہ پیسہ نہیں ہے۔دس بیس کروڑ کا دس پندرہ فیصد جی کیا ہوتا ہے۔مگر ملک ریاض اس کو سپورٹ کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی سیاسی پارٹی بنا رہا ہے۔نئی پارٹی کی گراؤنڈ کے لئے وہ لوگوں کو چن رہا ہے۔!''

''کیا پوزیشن ہے اس کی۔؟''عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''جیت تو نہیں سکتا۔یہ تو جی بس خادم حسین کے ووٹ ہی کاٹ سکے گا۔جیتنا تو جی آپ نے ہی ہے۔!''بالے نے جواب دیا۔

''اچھا۔۔!''اتنی دیر میں پہلی مرتبہ عبداللہ شاہ گیلانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔؟''

''جی گیلانی خاندان کو کون شکست دے سکتا ہے۔؟نسلوں سے آپ ہی لوگوں کی حکومت ہے۔اب تو سرکار کی عادت سی ہو گئی ہے۔عادت بھلا بدلتی ہے۔اور پھر الیکشن خالی خولی باتوں سے کہاں۔؟جی بندوں سے،ہتھیاروں سے۔اور اس کے پیچھے پیسے کے پیٹرول سے جیتے جاتے ہیں۔ان کے پاس اتنا کچھ کہاں۔؟''بالے نے ماضی کی روشنی میں طاقت،رعب اور دبدبے کا تجزیہ کیا اور اپنا فیصلہ صادر کیا۔

''لیکن کیا نئے خون،نئے عزم کو سامنے نہیں آنا چاہیے۔؟''

''جی آپ ہی تو نیا خون،نیا عزم ہو۔!''بالے نے منطقی جواز دیا۔''آپ ہی تبدیلی ہو جی بڑی۔!''

''نہیں بالے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہری سانس لی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں تبدیلی کا نقیب نہیں، میں اس سارے نظام کو نہیں شکست دے سکتا۔ میں تو اسی بوسیدہ نظام کا نیا ستون ہوں۔ جو سہارا دینے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ میں تو پرانے سلسلے کا اگلا تسلسل ہوں۔ کچھ بھی نہیں بدل سکتا۔!'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں سرکار۔!'' بالے کو اس کی بے بسی اچھی نا لگی۔ وفاداری کا ایک عنصر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اپنے مخدوموں کی بے بسی کو تسلیم ہی نا کیا جائے، ان کی خستگی کو محسوس کر کے بھی ان کو پہاڑ سمجھا جائے۔ وہ پہاڑ جس کو اڑانے کے لئے بارودی سرنگوں کو ان کے سینوں میں چھید کرا تار دیا گیا ہو، اور ضرورت صرف ایک چنگاری کی ہو۔ ایسی ہی وفاداری، ایسی ہی چاہت ایسا یقین جو حقائق سے نگاہیں چرا کر مجتمع کیا گیا ہو۔ وہ بالا آخر ایک دن گرا دیتا ہے۔ ''آپ ہی تو جی ہمار مستقبل ہو، آپ ہی اس نظام کو بدلو گے۔!''

''اچھا۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کو دفعتاً بالے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ''تم نے جو نظام بدلنے کی بات کی، سمجھتے ہو کہ نظام بدلنا کیا ہوتا ہے۔؟''

''جی ہمیں تو نہیں پتا۔'' بالے نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ جب سے سمجھ دار ہوئے ہیں۔ آپ ہی ہمارا مستقبل ہو۔ بادشاہ کا بیٹا ہی بادشاہ بنتا ہے جی۔ وہ دیکھیں نا ہمارے اوپر مغلوں نے حکومت کی، تو وہی سب باری باری۔ باپ کے بعد بیٹا، بیٹے کے بعد پوتا بادشاہ بنتا رہا۔ پھر انگریز آئے تو جی ان کا نظام بھی دیکھیں کہ جی ملکہ کے بعد اس کی بیٹی ہی ملکہ بنتی ہے۔ باہر سے کوئی باشادہ تو نہیں بنتا۔ جی بادشاہوں کا کام حکومت کرنا ہوتا ہے۔ انہیں ہی سمجھ ہوتی ہے حکومت کی۔ یہ کمی کمار بیچنے والے، بکریاں چرانے والے، گوالے، بھٹیارے یہ کیا کر سکتے ہیں جی۔ سب اپنے اپنے پرکھوں کے کاموں سے لگے ہیں۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی کچھ نہ بولا۔ بس ایک پھانس سی اس کے دل میں چبھ گئی۔

بالا بولتا رہا۔ ''ہم تو جی بس آپ کے غلام ہیں۔ آپ کے حکم سے سوچتے ہیں۔ آپ نے پیار دے دیا تو خوش، اپنی قسمت پر نازاں۔ آپ ناراض ہو گئے۔ سزا دیدی تو ہماری غلطی۔ ہماری تقدیر۔ جو سوہنا رب چاہے۔ جان دیدی یا جان لے لی۔ سب آپ ہی کے لئے۔ فرشتے نمک حرام تو نہ لکھیں گے جی اپنی کتاب میں۔ نمک کا حق تو جی ادا کرنا واجب ہے۔!''

''کبھی کسی کی جان لیتے ہوئے، مارتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ تم قتل کر رہے ہو۔ ظلم کر رہے ہو۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے گہرے دکھ سے پوچھا۔ ''کبھی کوئی احساس ہوا۔؟''

''احساس کاہے کا جی۔؟'' بالے نے جواب دیا۔ ''ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں، ہم تو خالی لوگ، اتنے خالی کہ ہمارے اندر دشمنی کا، پیار کا کوئی خانہ ہی نہیں ہوتا۔ ہم تو بس جی ہر کام میں آپ کی خوشنودی کو سامنے رکھتے ہیں۔ گولی کو بھلا کسی کے بدن میں گھستے ہوئے، گوشت کو پھاڑتے ہوئے، ہڈی کو توڑتے ہوئے کیا دکھ ہوگا؟ ہم تو جی آپ کے تیر ہیں۔ زہر میں بجھے ہوئے۔ جس پر آپ چلائیں گے جا پڑیں گے۔ عذاب، ثواب، گناہ، اجر یہ سب تو جی آپ لوگوں کی، سوچنے والوں کی مصیبتیں ہیں۔ ہمیں کیا۔؟'' بالے نے کندھے اچکائے۔

عبداللہ شاہ گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گیا ہو۔ جیسے اس کو چاروں طرف سے اندھیرے نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ وہ اندھیرا جس میں اُجالے کی کوئی رمق نہ ہو۔ جس میں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔

دفعتاً گاڑی نے بڑے زور سے جھٹکا لیا۔ عبداللہ شاہ چونک گیا۔ سڑک کے درمیان میں سے بکریوں کا ریوڑ گزر رہا تھا۔ شائد بالے نے اسی کو دیکھ کر جھٹکے سے بریک لگایا تھا۔

''تو گویا نجات کی۔ ہماری نجات کی اُس بارگاہ میں کوئی صورت نہیں!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے سر کو نشست کی پشت سے لگا لیا۔ پتا نہیں کیوں دو آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل کر نیچے آ گئے۔

''نجات تو ہے۔!'' اس نے سنا۔ جانی پہچانی آواز۔ جس کو وہ لاکھوں آوازوں کے ہجوم میں شناخت کر سکتا تھا۔

''ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔ تم ان میں سے ہو کر بھی، ان میں نہیں ہو۔؟'' قادری سرکار نے کہا۔

''آپ یہاں۔۔؟''

''ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''کیا کفارے کی صورت نہیں۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے شکستگی سے پوچھا۔

''ہے۔۔ بالکل ہے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔ ''اپنی انا کو تج کر کے، اپنے نقصان کو سرمایہ بنا کے سب بدل سکتے ہو۔ یہی ہے اصل کفارہ۔!'' انہوں نے کہا۔ ''تمہارے پاس طاقت ہے۔ اس کو بے سہاروں کے لئے استعمال کرو۔ تمہارے پاس وسائل ہیں اس کو ضرورت مندوں کے لئے وقف کرو۔ اور۔۔!'' انہوں نے ذرا ٹھہر کے کہا۔ ''اور وہ سچائی ہے کہ جس کے ذریعے تم انہیں اپنا بنا سکتے ہو۔ ضرورت صرف ہمت کی ہے۔ ان زخموں کا تریاق تمہارے پاس ہے۔ جن کی وجہ سے یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ بھیڑوں کے رکھوالے۔ بھیڑوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔؟''

''صحیح فرمایا آپ نے سرکار۔ ہم اس کے ذمے دار ہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''کیا ذمہ داری دے رہے ہیں چھوٹے سرکار۔!'' بالے نے پوچھا۔

عبداللہ شاہ گیلانی جیسے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور بالا سڑک کے ایک طرف گاڑی لگائے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے سرکار۔؟'' بالے نے تشویش آمیز انداز میں پوچھا۔ ''شائد آپ سو گئے تھے۔ خواب دیکھ رہے، کچھ بول رہے تھے۔ کیا ذمہ داری دے رہے ہیں سرکار۔؟''

اچانک ہی عبداللہ شاہ گیلانی ہنس پڑا۔ ''تم ہی تو کہتے ہو کہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ ہم سوچ رہے تھے۔ تو پھر تم کاہے کو پریشان ہو رہے ہو۔؟''

بالا کچھ نہ سمجھا بس اس کو دیکھتا رہا۔

''نہیں سمجھے۔۔۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔؟'' بالے نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر چلو۔۔۔راستہ تو طے کرنا ہی ہے۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ بالے نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ عبداللہ شاہ چند لمحے ونڈ اسکرین کو گھورتا رہا۔ پھر سی ڈی پلیئر کا بٹن دبا دیا۔ فضا میں مُغنی کی آواز ایک ردھم سے پھیلنے لگی۔

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج ِ دریا ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نواساں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محوِحیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ شاعر بھی الہامی ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات، افکار، تصورات ان سے برسوں آگے چلتے ہیں۔ جو ان کا وجدان انہیں دکھا، سنا، سمجھا رہا ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے بونوں میں عقل وشعور کے حوالے سے ان سے ان کا قد وقامت اس قدر بڑا ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ان پست قامت عقلوں میں نکو بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر پھر وقت کا بہتا ہوا دریا ان کے افکار کی ضو فشانیوں سے انہیں ایسا اعتبار عطا کرتا ہے کہ شعور ان کے افکار کے حضور بے ساختہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے سوچا۔ پھر اچانک ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر بالا نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں نہ جانے کیا تاثر تھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی ایک دم چپ ہو گیا۔

''نہیں۔۔۔پاگل نہیں ہوا ہوں میں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو۔!''

''نہیں۔۔۔نہیں میں ایسا نہیں سمجھ رہا۔'' بالے نے گڑبڑا کے کہا۔ ''میں تو بس ایسے ہی۔!''

''تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جب اچانک کوئی بیٹھے بیٹھے ہنسنا شروع کردے۔ رونا شروع کردے یا پھر بے وجہ چیخنا چلانا شروع کردے۔؟''

''جی ہم تو ایسے لوگوں کو آسیبی سمجھتے ہیں۔ جسے کوئی شرشرار چمڑ گیا ہے۔ پھر اس کے لئے کسی سیانے کے پاس جا کر جھاڑ پھونک کرواتے ہیں۔ مرچوں کی دھونی، کیلوں والا ڈنڈا، یا پھر گیلی مونجھ کی رسی سے باندھ دیتے ہیں۔ جوں جوں رسی سوکھتی ہے بندھن سخت ہوتا جاتا ہے۔ پھر شرشرار تنگ آ کر چھوڑ بھاگتا ہے یعنی مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔!'' بالے نے تفصیل سے بتایا۔

نجانے کیوں یہ سب سن کر عبداللہ شاہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ گاڑی حویلی پہنچی تو سب اس کے منتظر تھے۔

☆.....☆.....☆

درگاہ حضرت میاں کے ٹھیکے کا نوٹیفیکیشن اپنے ہاتھوں میں لیکر پیر ستارہ شناس کی عجیب سی حالت ہوگئی۔ بعض کامیابیاں بار بار یقین کی محتاج ہوتی ہیں۔ وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو بار بار چھو کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک اور آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ستارہ۔۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی آواز اس کو دوبارہ حواسوں کی دنیا میں لے آئی۔

''یہ۔۔یہ۔۔۔!'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔ اور اس سے زیادہ کہا بھی نہیں گیا۔

''دیکھ لو ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بڑے مربیانہ لہجے میں کہا۔ ''پیر اپنا وعدہ ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بندوں کو خدا سے کیسے ملائیں۔؟'' ان کے لہجے میں دنیا جہاں کا اعتماد اور بلا کا طنطنہ تھا۔

''جی۔۔۔جی۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے صرف اتنا ہی کہا اور چپ ہو گیا۔

''یہ لیجئے شربت لے لیجئے ذرا دل ٹھہر جائے گا۔!'' سہیل نے ایک گلاس اس کی جانب بڑھایا۔ پیر ستارہ شناس نے سہیل کے ہاتھ سے گلاس لیکر غٹا غٹ چڑھا لیا۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سہیل نے اس کی کیفیت دیکھ کر دوسرا گلاس بھرا اور اس کو پکڑایا۔ اس مرتبہ پیر ستارہ شناس نے ٹھہر ٹھہر کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنا شروع کیے۔ شربت صندل کا تھا۔ خوش ذائقہ، رنگت اور خوشبو سے بھرپور۔ پہلی بار تو اس کو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ اس نے کیا پیا ہے؟۔ لیکن اب گھونٹ گھونٹ، تری اور ٹھنڈک اس کے اندر اتر رہی تھی۔ اس کے حواس جو مختل ہو گئے تھے۔ دوبارہ بحال ہو رہے تھے۔

جب اس نے پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو بتایا کہ اس نے ساٹھ لاکھ کا بندوبست کر لیا ہے۔ تو اول تو پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو یقین ہی نہ آیا مگر جب اس نے کہا کہ اس میں کیا جرأت کہ وہ شاہ ہمدانی سے اس قسم کا مذاق کرے تو انہوں نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ پیسے لیکر آ جائے۔ مگر پیر ستارہ شناس جانتا تھا کہ اگر یہ پیسہ بغیر کسی ضمانت کے اس نے تھما دیا تو پھر کام نہیں ہونے کا۔ اس کی اتنی حیثیت تو تھی نہیں کہ وہ پیسہ واپس شاہ ہمدانی سے لے سکتا۔ لہٰذا اس نے کہا کہ یہ پیسہ زینت کا آبائی گھر بیچ کر لیا ہے۔ اب زینت ہی سے آپ بات کر لیں۔ زینت نے صاف صاف کہا کہ پیر جی میں تو اپنے میاں کے سارے ہتھکنڈے جانتی ہوں۔ آج تک اس نے پیسہ ڈبویا ہے کمایا نہیں۔ اب میں اپنی ساری جمع پونجی بغیر کسی ضمانت کے کیسے اس کو تھما دوں۔؟ مجھے تو ٹھیکے کا نوٹیفیکیشن چاہئے۔ پیسہ حاضر ہے۔ اِس ہاتھ لے، اُس ہاتھ دے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی دنیا میں اگر کوئی کمزوری تھی تو وہ پیسہ تھی۔ اور پھر نقد نارائن پر تو ان کی جان جاتی تھی۔ اور ویسے بھی ان کا خرچہ کیا تھا؟۔ انہوں نے مقصود حمیدی سے کہہ کر بنک چالان بنوا کر پیر ستارہ شناس کو دیا۔ اس نے بنک میں چالان جمع کرایا۔ دو گھنٹے کے بعد ہی مقصود حمیدی نے ٹھیکے کی منظوری کا نوٹیفیکیشن بھجوا دیا۔ اور اب وہی نوٹیفیکیشن پیر ستارہ شناس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کیے ہوئے تھا۔

کامیابی یوں بھی ملتی ہے۔ قسمت اس طرح بھی مہربان ہوتی ہے۔ قدرت کے کھیل کتنے نیارے ہیں۔ آگ لینے جائیں پیغمبری مل جائے۔ یہ تو سنا تھا۔ ایمان کا حصہ تھا۔ مگر جو بھی تھا جگ بیتی تھا۔ آپ بیتی تو اب بنا۔

واہ مولا۔۔کمال ہے تو۔کیسے کیسے نوازتا ہے۔اس کو یاد آیا۔ایک مرتبہ اکبر نے ملا دوپیازہ سے پوچھا۔

''یہ بتاؤ کہ خدا ہر وقت کیا کرتا رہتا ہے۔؟''

ملا نے کہا۔''عالم پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟''

بادشاہ۔جہاں پناہ عالم پناہ۔اپنے مزاج، اپنی تمناؤں، اپنی ذات کے اسیر ہوتے ہیں۔ضدی، ہٹ دھرم، انا پرست۔اپنی آرزؤں کو پورا کرنے والے۔انہیں تو جواب دہ چاہیے ہوتا ہے جو انہیں مطمئن کرے۔کہا۔''ملا تمہیں جان کی امان دی۔مگر شرط یہ ہے کہ ہماری تسلی ہو۔''

ملا آگے بڑھا۔کورنش بجالایا۔قدم بوسی کی اور بولا۔''حضور! تا قیامت بلند رہے اقبال، نہ ہو آپ کی سلطنت کو زوال، دنیا ازل سے جانتی ہے۔سرکار والا تبار کے ذہن رسا سے کب یہ امر پوشیدہ ہے کہ سوال کرنے والے کا رتبہ جواب دینے والے سے ادنیٰ ہوتا ہے۔اگر سرکار کے مزاج کو گراں نہ گزرے تو جواب شافی و کافی اسی وقت ممکن ہے کہ حضور والا اس ادنیٰ کی جگہ آئیں اور میں آپ کی جگہ آؤں۔آپ سوال کریں اور میں جواب دوں۔!''

مزاج شاہی کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔خبطی اگر بادشاہ نہ ہوں تو دنیا کی تاریخ کیسے بدلے۔لوگ خبطی کو برا سمجھتے ہیں۔مگر خبطی ہی تو کسی چیز کے پیچھے پڑ کر خواہشوں کے سمندر سے گوہر مراد کو لاتے ہیں۔اگر عشق خلل نہ ہوتا دماغ کا، تو کاہے کو مقبرہ تاج محل کا روپ لیتا۔بڑے بڑے کام خبط سے سرانجام پائے۔پاگل اور سڑی پن تو مقصد کے تعین سے ظاہر ہوتا ہے۔عشق بلا خیز نہ ہو، تو معشوق کے شوہر کا قتل بھی محبوب کو مرغوب ہوتا ہے۔اور دنیا کے پردے پر نور جہاں ملکۂ جہاں کے روپ میں رونق افروز ہوتی ہے۔اگر یہی عشق کسی معمولی فرد کا ہو تو جذبات چاہے جس قدر بھی عالی قدر ہوں، انجام بدتر ہی ہوتا ہے۔

حکم صادر ہوا۔''بسر و چشم۔'' بادشاہ اٹھے۔اپنی جبہ اور دستار اتاری۔ملا دوپیازہ کو عطا کی، عصائے شاہی تھمایا۔اور خود ملا کی جگہ جا کھڑے ہوئے اور بڑے عجز و انکسار سے پوچھا۔''یہ بتاؤ کہ خدا ہر وقت کیا کرتا رہتا ہے۔؟''

ملا دوپیازہ نے کہا۔''اے بادشاہ۔اے عالی پناہ۔خدا علیم و خبیر، عادل و غفار، جبار و قہار۔خدا۔اکبر کو سوالی بنا کر غلاموں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔اور ملا کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھاتا ہے۔وہ عالی مرتبت ہے۔مؤخر ہے۔مُبدی ہے۔اوّل ہے۔دنوں کے الٹ پھیر اور دلوں کے الٹ پھیر دونوں پر قادر ہے۔شاہ کو گدا بنانا، اور گدا کو شاہ بنانا اس کی قدرت کاملہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔'' وہ اٹھا اور جھک کر بادشاہ کی قدم بوسی کی۔

بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔زندگی کا۔مرتبے کا، عہدے کا بھروسہ کیا؟۔یہ سارے تام جھام خدا کی رضا سے مشروط ہیں۔اس کی رضا سے، اس کے اشارے پر دلوں میں محبت، رعب اور دبدبہ پڑتا ہے۔لوگ نگاہوں کو، دل کو فرش راہ کرتے ہیں۔اور جب عطا قضا میں بدلتی ہے۔تو یہی بوریہ نشین، عزلت نشین، خاک نشین جو دلوں کو، نگاہوں کو فرش راہ کرتے ہیں۔پھر ان ہی فرشوں پر شاہوں

کے بدن گھسیٹتے ہیں۔ احترام کا رشتہ، انتقام میں ڈھل جاتا ہے۔ عالم پناہ۔ ظلِ الٰہی، اقبال مند، بخت جہاں، بد بخت ہو جاتا ہے۔ گردن اڑ کر لڑھکتی ہوئی قدموں میں جا پڑتی ہے۔ اور بدن پیروں تلے روندا جاتا ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور وہ رونے لگا۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی اسے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ رو کر چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی آستینوں سے آنسو پونچھے۔ اردگرد دیکھا۔ سہیل اس کو شربت دیکر چلا گیا تھا۔ صرف جہانگیر شاہ ہمدانی ہی موجود تھے۔ ''معاف کیجئے گا شاہ جی مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔!'' پیر ستارہ شناس نے سادگی اور صاف گوئی سے کہا۔ ''آپ کی یہ عنایت میری اوقات سے بڑی تھی۔ اس لئے جلدی سنبھالی نہ گئی۔ سننا، دیکھنا اور خواہش کرنا ایک علیحدہ امر ہے، اور اس کو پورا ہوتے دیکھنا دوسرا۔''

''مسئلہ اوقات کا نہیں، ظرف کا ہے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''آہستہ آہستہ سنبھل جاؤ گے۔!''

''مگر میری ایک شرط ہے استدعا کے روپ میں!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''کہو۔۔۔!''

''میری راہ نمائی کرتے رہئے گا۔ یہ درگاہ بہت بڑی ہے۔ اور میں بہت چھوٹا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ ذمہ داری کا۔'' پیر ستارہ شناس نے بڑی آہستگی سے کہا۔

''بس ایک بات یاد رکھنا۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اسے جواب دیا۔ ''اس درگاہ پر اہل غرض، فقیر بھی آتے ہیں۔ اور صاحبِ اقبال، ثروت مند، ظفر مند بھی۔ ہر آدمی ضرورت رکھتا ہے۔ مگر کہنے اور برتنے کی غائیت مختلف۔ اگر کسی سے کسی کام کے لئے پیسے لئے ہیں تو ہر صورت وہ کام کرنا ورنہ پیسے واپس کرنا۔ اس سے ساکھ بنتی ہے۔''

''برا نہ مانئے گا۔ لیکن آپ کے متعلق تو مشہور ہے کہ آپ کسی کا پیسہ واپس نہیں کرتے۔!'' پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔ اور ان کی طرف دیکھا۔ مبادا وہ برا تو نہیں مان گئے۔

مگر وہ برا مانے بغیر ایک قہقہہ لگا کے بولے۔ ''ہاں سچ تو یہی ہے کہ ستارہ ہم سے پیسے لئے جاتے ہیں۔ دیئے نہیں جاتے۔ تم ہی بتاؤ کہ تم نے کبھی کسی سائل کے پیسے واپس کئے۔؟ نہیں نا۔ تو پھر ہم کیسے واپس کر دیں؟ مگر اس کے لئے بھی کچھ طریقہ کار ہوتا ہے۔ معدہ، نیت اور شخصیت یہ تینوں ہی تکون بناتے ہیں ایک ایسی مثلث کا جس کا ابھی تم ایک ضلع بھی نہیں بنے۔'' وہ ہنسے اور بولے۔ ''سچ سچ کے کھانا۔ ورنہ بدہضمی ہو جائے گی۔ بدنام ہو گئے تو ٹکے کے نہ رہو گے۔''

''سچ کہتے ہیں آپ۔؟'' پیر ستارہ شناس نے انتہائی عقیدت سے کہا۔ اور ذہن میں اس مثلث کو بٹھا لیا۔ ''بس ایک کرم اور کیجئے گا۔''

''بولو بھئی! آج تو ہمارا دریائے کرم اپنی روانی پر ہے۔'' وہ ہنسے۔

''وہ جو میں نے آپ سے شجرے کا کہا تھا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''تم اپنا شجرہ تو لاؤ پھر دیکھ لیتے ہیں۔!'' وہ بولے۔ ''ہم کب اپنی بات سے پھرتے ہیں۔؟''

''ہم کیا۔ ہمارا شجرہ کیا۔'' پیر ستارہ شناس نے عاجزی سے کہا۔ ''قلم آپ کے ہاتھ میں، مہر آپ کی، نسبت آپ کی، تصدیق آپ کی۔ ہم کیا اور ہمارا حسب نسب کیا۔؟''

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''چلو یہ بھی ہوا۔ تم درگاہ حضرت میاں کے سجادہ نشین بھی، اور بولو۔؟''

پیر ستارہ شناس اٹھا۔ اور ان کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ''اب جب اپنا بنا ہی لیا ہے تو کبھی جدا نہ کیجئے گا۔!''

''ہم تو جدا نہیں کرتے۔ لوگ جدا ہو جاتے ہیں۔ ستارہ۔۔! یہ دنیا غرض کی ہے۔ ہم سے لوگ ملتے ہیں۔ اپنا کام نکلواتے ہیں۔ ہم اپنے بچپن سے یہی دیکھتے آرہے ہیں۔ جب تک کسی کی گوٹ کہیں نہیں پھنستی۔ کوئی قابو میں نہیں آتا۔ سانپ سارے دنیا میں ٹیڑھا میڑھا چلتا ہے۔ مگر اپنے بل پر آکر سیدھا ہو جاتا ہے۔ مگر انسان وہ چیز ہے جو اپنے بل پہ بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ دنیا ہم سے غرض کا رشتہ رکھتی ہے۔ ہم بھی غرض کا رشتہ نبھاتے ہیں۔ اپنے تعلقات، اپنے رتبے اور حیثیت کے مطابق قیمت وصولتے ہیں۔ تم بھی ایک دن معتبر ہو جاؤ گے تو ہم میں سو کیڑے نکالو گے۔!''

''اللہ نہ کرے۔!'' بے ساختہ پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''اللہ کرے۔۔ نا کرے۔۔ بندہ ضرور کرتا ہے۔!'' انہوں نے اس بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''ہر آدمی اپنے ظہور سے ڈرتا ہے، اپنی کمزوری اور خامی کو سامنے لانے سے ڈرتا ہے۔ ہم لوگوں کی کمزوری اور خامیوں کو جانتے ہیں۔ اسی لئے لوگ ایک وقت کے بعد ہم سے آہستہ آہستہ دور ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ پیری، مریدی کی دنیا ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر شخص خود اپنی سلطنت کا خدا بنا بیٹھا ہوتا ہے۔''

پیر ستارہ شناس نے کچھ نہ کہا۔ کہنے کو تھا بھی کیا؟۔ جب تک وہ ایک مرتبے پر فائز نہیں ہوا تھا۔ تب تک بات اور تھی۔ مگر اب اس کو ان کی بات میں سچائی کا عنصر مل گیا تھا۔ جب ہم اپنی ذات سے سمجھوتے اور اپنے آپ سے پہلا جھوٹ بولتے ہیں تو سیاہی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خال خال ہی کوئی اس سیاہی سے بچ سکا ہے۔ جس کو دل کی سیاہی کہتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

''کاہے کی مٹھائی اٹھائے چلے آرہے ہو۔؟'' زینت نے پیر ستارہ شناس کو مٹھائی کے ڈبے اٹھائے اندر لاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''ارے نیک بخت بھول جاتی ہو کیا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''آج بتاؤ تو بھلا کیا ہوا؟''

''اُسی منحس صورت نے کچھ گل کھلایا ہوگا۔؟'' زینت نے صبح کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کون۔۔؟'' پیر ستارہ شناس کے ذہن سے بات نکل گئی تھی۔ ''کس کے پیچھے پڑ گئی ہو اب؟''

''وہی حکیم منڈی بہاؤالدین والے کی، صبح اس نے تمہیں نہیں بلایا تھا کیا۔؟'' زینت نے اسے یاد دلایا۔ ''جب صبح پانچ بجے ہی اس نے گھنٹی بجادی تھی، خطرے کی۔''

''اچھا۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس ہنسا، یاد کر کے صبح کی بات۔ ''وہ تو میں نے تمہیں ٹالنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ ورنہ تم اس وقت ہی میرے کان کھانے لگتیں۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟'' زینت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دراصل میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا وہ فون پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا تھا۔ انہوں نے بلایا تھا۔ میں نے سوچا نجانے کیا بات ہو اور تم چراغ پا ہو جاؤ۔ اس لئے ٹالا تھا۔ یہ دیکھو ہمیں درگاہ حضرت میاں کا نوٹیفیکیشن مل گیا ہے۔ اب ہم وہاں کے قانونی ٹھیکے دار ہیں۔'' پیر ستارہ شناس نے مٹھائی کے ڈبے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے۔ اور جیب سے سرکاری مہر والا لفافہ نکال کر زینت کو دیا۔ ''لو یہ دیکھو اور پڑھو۔''

''مجھے نہیں پڑھنا۔!'' زینت مسکرائی۔ ''مجھے تمہاری زبان سے سننا ہی کافی ہے۔!''

''کیوں۔۔۔ ثبوت نہیں۔؟'' پیر ستارہ شناس ہنسا۔

''جب تمہاری زبان کے آگے ہار مان کر نکاح کے فارم پر دستخط کر دیئے تو ان کاغذی ٹکڑوں کا ثبوت کیا؟۔ میرا تو ثبوت تم ہو۔!''

پیر ستارہ شناس نے بڑی محبت سے اس عورت کو دیکھا۔ جس نے اپنے دولت مند باپ کی دولت، کروڑ پتی منگیتر کو صرف اس کے لئے، اس کی محبت میں ٹھکرا دیا تھا۔ اور ہر اچھے برے، تنگی، ترشی میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اور منہ سے اُف تک نہ کیا تھا۔ اتنے بھروسے، اتنے مان کے قابل تو میں نہ تھا۔ پیر ستارہ شناس نے سوچا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' وہ بولی۔ پیر ستارہ شناس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ آج تک ویسی ہی تھی، کسی ہوئی، شوخ، چنچل، آگ صفت، شبنم، کبھی کبھی ٹھنڈ بھی تو آگ لگا دیتی ہے۔

''اپنی قسمت پر ناز کر رہا ہوں۔!'' وہ ہنسا۔ ''شکر کرتا ہوں کہ تم جیسی بیوی ملی۔!''

''ہاں ناز کرنا بھی چاہیے۔ ستارہ جی! ویسے پیر تو تم ہو مگر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ ہم دونوں ہی جنتی ہیں۔!''

''اچھا۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''یہ انکشاف کیونکر ہوا۔ کس کیفیت میں، مراقبے میں، یا حالت جنون میں۔؟''

''عالم حواس میں۔۔۔!'' اس نے ترنت جواب دیا۔ ''تم مجھے دیکھ کر شکر کرتے ہو۔ اور میں تمہیں دیکھ کر صبر کرتی ہوں۔ اور میاں جی صابر اور شاکر دونوں ہی جنتی ہیں۔ چاہو تو پوچھ لو کسی عالم دانا و بینا سے۔!''

پیر ستارہ شناس ہنسنے لگا۔ زینت نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ اس میں سے ایک گلاب جامن نکالا اور پیر ستارہ شناس کو دیا۔ اس نے آدھا کھایا اور آدھا زینت کو کھلایا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میری اصل خوش قسمتی کیا ہے۔؟'' پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔

''تم ہی بتاؤ۔۔۔!'' وہ مسکرائی۔ اس کے سفید ہموار دانت، بھرے بھرے گلابی ہونٹوں کے پس منظر میں جھلملائے۔

''تم۔۔تمہارا پیار، تمہاری محبت، تم سے اللہ نے مجھے بچے دیئے، مجھے مکمل کیا۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے ورنہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ کس قدر گھریلو مسائل، ازدواجی جھگڑوں، شک اور وہم کے باعث اپنی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں۔اس اعتبار سے میں بہت قسمت والا ہوں۔''

زینت کچھ نہ بولی۔بس پیار سے اس کو دیکھتی رہی۔بعض اوقات خاموشی بھی جذبات کی تفسیر بن جاتی ہے۔

''پھر کب سے درگاہ سنبھال رہے ہو۔؟'' زینت نے پوچھا۔

''پہلی نومبر سے سنبھالوں گا۔آج دیکھ آؤں گا۔''

''کیا مطلب؟۔۔زینت نے پوچھا۔''کیا اس سے پہلے نہیں دیکھا ہے درگاہ کو۔؟''

''پگلی۔۔اب تو اس کو سجادہ نشین کی نگاہ سے، ٹھیکے دار کی نگاہ سے دیکھوں گا۔!''اس نے وضاحت کی۔

''میں بھی چلوں۔؟'' زینت نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔اس کے لہجے، آنکھوں، پور پور سے شوق چھاجوں برس رہا تھا۔

بعض مختصر جملے بھی آدمی اور جذبے کے درمیاں کیسی کیسی مناسبت پیدا کر دیتے ہیں۔سارا اندر باہر جھانکنے لگتا ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے چلو تم بھی، آج شام کو چلتے ہیں۔'' پیر ستار شناس نے کہا۔

''اسی وقت پیر ستارہ شناس کے فون پر بیل ہوئی۔''ہیلو۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''کیا حال ہے پیر جی۔؟'' دوسری طرف سے رائما کی مترنم آواز سنائی دی۔''میں نے سوچا پیر جی کو سلام کرلوں۔؟''

''کہاں ہو۔؟'' پیر ستارہ شناس نے خوش دلی سے پوچھا۔''جنیوا میں، جنوبی وزیرستان میں یا پھر اپنے وزیر آباد میں۔؟''

''پیر جی واقعی تم پہنچے ہوئے ہو۔!'' رائما ہنسی۔

''ارے ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔وہی ہماری بیگم ہیں کئی برس پرانی، تم سناؤ جس کے دن عید، رات شب برأت کہو کس جنت میں ہو۔؟''

''ہم جنت میں کہاں۔جنت میں ہوتے تو ملک ریاض یہاں ہوتے۔؟''۔اس نے قہقہہ لگایا۔

اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔''ارے اس کے ساتھ تو جہنم بھی قبول ہے۔!'' ملک ریاض کی کھلکھلاتی ہوئی آواز آئی۔

''یہ تو آپ کے دم قدم کی برکت ہے۔جہاں گئے انگارے بچھا دیئے۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''مگر اس موقع پر اس پیر کو نہ بھول جایئے گا کہ جس نے آپ کے دل کی کلی کھلا دی۔''

''پیر جی تم سے تو بہت کام ہیں۔!''اب تو رابطہ رہے گا۔'' ملک ریاض نے کھلکھلا کے کہا۔اور فون بند کر دیا۔

''لگتا ہے بہت خوش ہے۔!'' زینت نے تبصرہ کیا۔

''ہاں۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے جواب دیا۔ ''جب بے تحاشہ پیسہ ہو، اور پیسہ لٹانے کے لئے معقول وجہ، خرافات، تو پھر آدمی خوش ہی ہوتا ہے۔''

''اب تمہارے پاس بھی بہت پیسہ ہوگا۔ کہیں تم بھی ان خرافات میں تو نہ الجھ جاؤ گے؟۔'' زینت نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے سچائی سے جواب دیا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے شراب نہیں پی۔ رشوت نہیں لی، گناہ نہیں کیا، جوا نہیں کھیلا۔ مگر اصل بات تو یہ ہے کہ موقع کتنا ملا؟۔ اور جب موقع ملا تو باز رہے؟۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ بس تم ضمیر کے احتساب کی صورت میرے ساتھ رہنا۔''

''پیر جی! ضمیر انسان کے اندر ہوتا ہے باہر نہیں۔'' زینت نے کہا۔ ''کردار دباؤ، دھونس، زبردستی سے نہیں سنورتے، اپنے آپ سے سنورتے ہیں۔ سنبھلنا تو صرف تم ہی کو ہوگا۔ ورنہ جو دوسروں کا اثاثہ تباہ کرتے ہیں۔ ان کا اپنا اثاثہ آگ کی نذر ہو جاتا ہے۔''

''کونسا اثاثہ۔۔۔؟'' پیر ستارہ شناس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ اثاثہ جس کو عزت، شرم، حیا کہتے ہیں۔ بیوی، بہو، بیٹی۔!'' زینت نے پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

پیر ستارہ شناس نے زینت کی طرف دیکھا۔ زینت کی نگاہوں میں نجانے کیا تھا کہ پیر ستارہ شناس کی آنکھیں جھک گئیں۔

☆.....☆.....☆

''زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی کا فیصلہ ہمارے خیالات کرتے ہیں۔ اگر خیالات مثبت ہیں۔ تو پھر ایک ایسی دنیا تعمیر کرتے ہیں جہاں سکون ہوتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا کہ خیالات سکون بھی دیتے ہیں۔ اور خیالات سکون چھین بھی لیتے ہیں۔ ذرا اپنے آپ پر غور کیجئے۔ کتنے خیالات ایسے تھے کہ جن کی وجہ سے ہماری نیندیں اڑ گئیں۔ اور کتنے خیالات ایسے تھے کہ جن کے ذریعے ہم نے دوسروں کا سکون برباد کر دیا۔ خیالات کیسے ظاہر ہوتے ہیں۔؟'' قادری سرکار کا درس جاری تھا۔ ان کے عقیدت مند، مداح، مریدین نہایت ادب سے سر جھکائے ان کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔

وہ ذرا ٹھہرے اور ان لوگوں کی طرف دیکھا کر دوبارہ بولے۔ ''خیالات، لفظ کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور لفظ حرف سے، اور لفظوں کو جوڑ کر جملے اور جملوں پر عبارت قائم ہوتی ہے۔ غور کیا آپ نے؟ ہر شے ایک تسلسل سے چلتی ہے۔ خیالات کا اظہار، گفتگو سے، باہمی مکالمے سے ہوتا ہے۔ خیالات اور لفظوں کے پیچھے احساسات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ احساسات، جذبات خیالات پر منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور آدمی کا رخ متعین ہو جاتا ہے۔ خیالات، احساسات، جذبات ہمارے تجربات کے منطقی تجزیئے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ہر فرد یہ تجزیہ اپنی ذات کے داخلی مسائل کے پس منظر میں کرتا ہے۔!''

وہ کہہ رہے تھے اور لوگ بڑے احترام سے ان کو سن رہے تھے۔ یہ قادری سرکار کا ایک خاص وصف تھا، کہ لوگوں کو اپنی باتوں کے سحر میں ایسا جکڑ لیتے تھے کہ جب تک وہ نہ چاہتے کوئی اٹھ کر نہ جا سکتا تھا۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں۔ جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا سارا معاملہ ہمارے تجربات سے عبارت ہوتا ہے۔ اور تجربات، ذاتیات اور مشاہدات کے دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اب ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔ اچھے اور برے کا۔ ہمارے تجربات اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ برے ماحول کا عطیہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور بری چیزی بری ہی ہوتی ہے۔ لیکن۔۔!'' وہ ذرا ٹھہرے اور اپنے سامعین کی طرف دیکھا جو پوری شدتوں سے ان کے طرف متوجہ تھے۔ وہ دوبارہ بولے۔

''لیکن یہاں ہمارا کائناتی شعور ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ ازلی شعور جو کائناتی سچ ہے۔ اچھائی۔ لاغرضی۔ بے طمع تعلق۔ دوسروں کی مدد کا جذبہ۔ شعور سچ کا ساتھ دینے پر اکساتا ہے۔ اس کی مثال وہ تاریخی حقائق ہیں کہ جب اسلام تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ چین کی تاریخی مثالیں۔ والدین کی عزت، استاد کا احترام، یونان کی شہری حکومت، سقراط کا زہر پینا۔ نوشیرواں کا عدل، قبل از اسلام عربوں کی بہادری، سخاوت، ساتھ دینے کی خصوصیات۔ یہ سب اس ازلی اور ابدی سچائی کی علامات ہیں کہ جو بے توحید معاشرے میں بھی حق اور سچائی کی شمعیں روشن کرتی تھیں۔

تو صاحبو! وہ ذرا ٹھہرے اور مسکرا کے کہنے لگے۔ ''تو صاحبو! آج تو ہمارے پاس واضح اور حقیقی پیغام توحید، تحریری ضابطۂ حیات، ریاست کا نقشہ اور ریاستی قوانین، افراد کی ذمہ داریاں اور مملکت کے فرائض۔ یہ سب قرآن مجید، سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ مدینے کی ریاست، اور خلفائے راشدینؓ کی عملی صورت میں موجود ہے۔ اس لئے دوستو! ہمارے پاس فرار کی، پہلو تہی کی، لاعلمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بہانہ۔ نہ افراد کے لئے۔ معاشرے کے لئے، ریاست کے لئے، مملکت کے لئے موجود نہیں ہے۔ ہمیں یا تو ذمہ داری پورا کرنا پڑے گی یا پھر حساب دینا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا اور خاموش ہو گئے۔

تمام حاضرین ان کے درس کی کیفیت میں گم تھے۔ اچانک خادم خاص ندیم آیا۔ اس نے جھک کر بڑے ادب سے ان سے کچھ کہا۔ قادری سرکار کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

میں تجھ سے التجا کرتا ہوں۔۔۔تو اپنا عدل دِکھا

''یہ کیا لکھ گیا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے رف پیڈ اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر ہارون گیلانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ذرا اس کو پڑھو، میری قریب کی عینک نہیں ہے۔!''

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں حکومت چلانے کے قابل نہیں ہوں تو پھر میں اسمبلی تحلیل کر دیتا ہوں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے تحریر پڑھی۔

''یہ کیا کر رہا ہے یہ۔؟'' پارٹی سربراہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''ذرا اس کو بلاؤ، سمجھاؤ۔!''

''کچھ نہیں ہوگا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے نہایت سکون سے کہا۔ ''یہ محض گیدڑ بھبھکیاں ہیں۔ ذرا ان کو کہیں کہ اس معاملے پر اپنی کابینہ سے بھی مشورہ لیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔!''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ اگر اس نے پہلے ہی کوئی قدم اٹھا لیا تو۔؟'' پارٹی سربراہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

''[illegible] نہیں معلوم کہ آپ نے کس مخصوص [illegible] کی وجہ پر ان کو وزیراعظم کے لئے نامزد کیا تھا۔ سوائے وفاداری کے ان کے [illegible]''

''[illegible] نے ناگواری سے کہا۔ ''سارا کچھ تو وہی کرتا ہے جو تم سب اس سے کہتے [illegible]''

''[illegible] کوئی کام، کوئی دوست ان کی نظر کرم کا محتاج نہیں رہا۔ میں اپنی دنیا [illegible]''

''[illegible] ''تمہارا ایپروکریسی میں جو اثر و رسوخ ہے جس طرح لوگ تمہارا دم بھرتے [illegible]''

[illegible] کہا۔ ''تم وزیراعظم کی دوڑ میں کیوں نہیں شامل ہوئے؟''

[illegible] سے کہا۔ ''میں وزیراعظم بن کر کیا کروں گا۔؟ مجھے بے بس، بے [illegible]''

''[illegible] ''میں ذرا بات کر لوں۔ دیکھوں کدھر ہے۔؟''

[illegible]

''الیکشن کی تیاری کیسی چل رہی ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔آپ مطمئن رہیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''ارے یہ کیا۔؟'' اچانک شاہ ہارون گیلانی کی نظر ٹی وی اسکرین پر پڑی۔

''کیا ہوا۔؟'' پارٹی سربراہ نے ٹی وی اسکرین پر نگاہیں جمائیں۔ بریکنگ نیوز فلیش ہورہی تھی۔ ''حکمران پارٹی میں اختلافات۔وزیراعظم کا عالم برہمی میں کابینہ تحلیل کرنے کا امکان۔!''

''اوہ میرے خدایا۔!'' پارٹی سربراہ نے سر پکڑ لیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پھر اس کے بعد فون کی گھنٹیوں کا تانتا بندھ گیا۔شاہ ہارون گیلانی باہر نکل آئے۔ان کے باہر نکلتے ہی مختلف نیوز چینلز کے نمائندوں نے ان پر یلغار کردی۔طرح طرح کے سوالات کی بھرمار ہوگئی۔مگر ہارون گیلانی نے ان کے ہر سوال کے جواب میں سوائے نو کمنٹس کے کچھ نہ کہا۔وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھے۔ہر چیز ان کے اندازے کے مطابق ہورہی تھی۔ان کے اسکرپٹ میں کہیں کوئی جھول نہیں تھا۔ان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر تھا۔جب پارٹی سربراہ نے سر پکڑ کے کہا تھا یہ خبر میڈیا تک کیسے پہنچ گئی۔کس نے بتایا۔؟

حالانکہ صرف اتنا ہوا تھا کہ رف پیڈ پر لکھے کو پڑھنے سے قبل انہوں نے احمد اورنگ زیب کو لائن پر لے لیا تھا۔جو خبر انہوں نے پارٹی سربراہ کو پڑھ کر سنائی تھی وہ احمد اورنگ زیب تک بھی پہنچ گئی تھی۔ذہین اور فطین احمد اورنگ زیب ہر خبر کو صحیح جگہ پہنچانے کا کامل ہنر رکھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

علی مراد کی غصے سے بھرپور آواز سب سن رہے تھے۔ ''یہ کھلا دھوکا ہے۔میں نے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔لیکن اس کو ٹی وی پر نشر کر کے میری بے عزتی کیوں کی۔کیا میری زبان پر بھروسہ نہیں تھا۔میرے سارے حلقے والے کیا کہیں گے۔؟''

''تمہاری بات مکمل ہوگئی۔؟'' قدیر نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔تم بولو۔۔۔!''

''جب تم دست بردار ہوگئے تو تمہیں اس سے کیا کہ خبر کہاں کہاں چلتی ہے۔اور جو کچھ کہا ہے تم نے کہا۔ہم سے کوئی مشورہ کیا تھا، بندہ تم نے بھیجا، فون پر بات تم نے کی۔اب کیوں شور مچا رہے ہو۔؟'' قدیر نے سوالات کے تابڑ توڑ حملے کئے۔''تم ہم سے جھوٹ بول رہے تھے کیا مقصد تھا اس کا۔کس کے کہنے پر یہ سازش کی، کتنے پیسے لئے بتاؤ۔؟''

''نہیں۔۔نہیں کوئی سازش نہیں۔!'' علی مراد نے گھبرا کے کہا۔''میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ٹی وی پر خبر بھی چلائی، میری تصویر بھی دکھائی بس سیدھے سیدھے کہہ دیتے کہ میں الیکشن میں حصہ نہیں لے رہا ہوں۔!''

''یہ ٹی وی والوں کا مسئلہ ہے ہمارا نہیں۔!'' قدیر نے خشک لہجہ اختیار کیا۔''آئندہ فون کرنا تو ذرا آرام سے بات کرنا۔ہم

تمہارے مزارعے یا کمدار نہیں ہیں۔تم ہمیں جانتے نہیں ہو۔!''

''لو جی آپ تو ناراض ہو گئے۔!'' علی مراد نے دفعتاً لہجہ بدل لیا۔''اچھا جی چھوڑو۔ہمارے ڈیرے پر آؤ کھانا شانا کھاؤ جی۔ خلیفہ جی کی قدموں کی برکتیں ہوں گی۔!''

''ضرور آئیں گے۔!'' قدیر کا لہجہ بھی خوشگوار ہو گیا۔''بس ذرا الیکشن کی مصروفیات ختم ہونے دو۔!''

''چھوڑیں جی الیکشن کی کیا مصروفیات۔میں اپنے آدمیوں کو کہتا ہوں کہ جی اب اسی وقت سے اپنے خادم حسین کی الیکشن مہم چلاؤ۔!''

''اس مہربانی کا بھی شکریہ۔!'' قدیر نے رسانیت سے کہا۔''ہماری ساری تیاریاں مکمل ہیں بس ووٹ پر مہر لگانا باقی ہے خادم حسین کے لئے۔!'' قدیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون بند ہوتے ہی کمرے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علی مراد کیوں الیکشن سے دست بردار ہوا۔پھر اس کے اچانک غصے اور پینترا بدلنے کی وجہ کیا تھی۔؟

بندہ سوچتا ہے۔اس کے تمام رجحانات سوچنے کے عمل میں شریک ہوتے ہیں۔منفی اور مثبت۔نفسیات اس پر بڑی بحث کرتی ہے۔لیکن روحانیت کے حوالے سے یہ منفی اور مثبت رخ ہی رحمٰن اور شیطان کی کشش کے دو نام ہیں۔جو بندہ رحمانی صفات سے قریب تر ہوتا ہے۔وہ مثبت ہو جاتا ہے۔اور جو اِن صفات سے دُور، دنیا کے جھمیلوں میں رہتا ہے۔نفع اور نقصان کے بہی کھاتے بکھیرے بیٹھا ہوتا ہے۔وہ نفع کی طرف لڑھک جاتا ہے۔یہ خدا کا ہی کمال ہے کہ وہ شر میں سے خیر کے اسباب مہیا کر دیتا ہے اور خیر کو الٹ بھی دیتا ہے۔ واقعہ سامنے ہوتا ہے۔کردار سامنے ہوتا ہے، مگر اسکرپٹ اور سین تقدیر کا ڈائریکٹر تخلیق کرتا ہے۔تمام کردار خود بخود اسکرپٹ کے مطابق سین میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔کوئی اس کے پیچھے کی بُنت کو نہیں جانتا۔مگر وہ جس کو اللہ چاہے نظر دے۔اور نظر ان کو ملتی ہے جو روشنی کے خالق سے جڑے ہوتے ہیں۔جب تبدیلی مقدر ہو جاتی ہے تو پھر ہر فرد اپنے کردار، افعال، اعمال، اشغال کو غیر محسوس طریقے سے بدلنا شروع کر دیتا ہے۔کیا فرد۔کیا معاشرہ۔کیا عام۔کیا عامی، کیا خاص۔لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوا۔؟ علی مراد نے کیوں یہ قدم اٹھایا۔سوچ تو لی تھیں ہم نے تمام ممکنہ وجوہات تو پھر تلملانے کی وجہ کیا تھی علی مراد کی۔؟ کیا اس نے غلطی کر دی تھی۔کیا اب وہ پچھتا رہا تھا۔؟

''آپ کا کیا خیال ہے خلیفہ جی۔؟'' حنیف صحرائی نے پوچھا۔''کیوں دست بردار ہوا وہ۔؟''

''میں اس سلسلے میں ابھی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔!'' میں نے جواب دیا۔''جو کچھ بھی ہے۔انشاء اللہ جلد ہی پردۂ غیب سے ظہور میں آ جائے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں خلیفہ جی۔!'' شریف حلوائی نے کہا۔''بلاوجہ سوچنے کیا فائدہ۔؟ ہم نے کونسے اس کو پیسے دیئے ہیں۔کب اس سے اپنے حق میں بیان دلوانے ہیں۔!''

''چلو ٹھیک ہے۔!'' حافظ سلمان نے کہا۔''ہم پولنگ اسٹیشنوں کے معاملات دیکھ لیتے ہیں۔تمام امام صاحبان کو ان کے

پولنگ اسٹیشن اور پھر وہاں قائم پولنگ بوتھ کی تمام تفصیلات سمجھا دی گئی ہیں۔اس لئے اس طرف سے تو اطمینان ہے۔"

"چلیں یہ تو سب ٹھیک ہو گیا۔لیکن یہ بھی دیکھ لیں کہ ووٹرز کو پرچیاں صحیح طریقے سے تقسیم ہو گئی ہیں یا نہیں۔اور ایک بار سب کو اچھی طرح یاد دھانی کروا دیں کہ اپنے شناختی کارڈ ضرور ساتھ لائیں۔!" میں نے تاکیداً کہا۔

سب نے ہی اس پر صاد کیا اور محفل برخواست ہو گئی۔

"یار ایک بات پوچھوں۔؟" قدیر نے لوگوں کے جانے کے بعد پوچھا۔

"کہو کیا بات ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"قادری سرکار نے پولنگ اسٹیشن پر پولنگ ایجنٹس کے لئے امام صاحبان پر کیوں زور دیا؟ اور بھی لوگ ہو سکتے تھے۔کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔؟"

"بالکل ہے۔۔!" میں نے اطمینان سے کہا۔"بالکل سیدھی سی، آسان سی، انتخابات کے نتائج پر اثر انداز، اور سو فیصد اثر انداز ہونے کی حکمت عملی ہے۔!"

"یار پہیلیاں نہ بجھاؤ۔مجھے ذرا صاف، صاف سمجھاؤ۔!" قدیر الجھ گیا۔"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔؟"

"شروع، شروع میں میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔لیکن جیسے ہی میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔"

قدیر میری طرف کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتا رہا۔

میں نے کہنا شروع کیا۔"ہم امام صاحبان کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں۔وہ ہمیں ہر جمعے کے دن خطبہ دیتے ہیں۔اچھائی برائی سمجھاتے ہیں۔سچ اور جھوٹ کی اہمیت بتاتے ہیں۔ذمہ داریوں اور فرائض کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ہم مسجد میں بیٹھ کر یا کسی جگہ حلقۂ درس میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ یہ ساری باتیں تو ہماری اچھائی کے لئے ہیں۔ہمیں ماننا چاہئیں۔مگر وہاں سے اٹھتے ہی ہم بدل جاتے ہیں۔لیکن اگر کوئی وعدہ ہم ان سے کر لیں۔اور وقتِ وفا وہ ہمارے سامنے ہوں تو کیا ہم انکار کر سکیں گے۔؟" میں نے اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کمال ہے خدا کی قسم کمال۔۔!" قدیر بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔اور لپک کر میرا منہ چوم لیا۔"واقعی یہ کتنی سادہ اور زُود اثر ترکیب ہے کہ مولانا صاحبان جس امیدوار کی تعریف کر رہے ہوں۔لوگوں سے اس کو ووٹ دینے کے لئے کہہ رہے ہوں۔لوگ وعدے کر رہے ہوں تو پھر جب وہاں وہ پولنگ اسٹیشن پر جا کر ان ہی امام صاحبان کو دیکھیں گے، تو چاہے شرما شرمی ووٹ دیں۔یا امیدوار کے پروگرام سے متفق ہو کر، دونوں صورتوں میں ووٹ تو مطلوبہ امیدوار کو ہی پڑیں گے۔!" وہ اچانک چپ ہو گیا۔پھر آہستہ سے بولا۔"یار یہ قادری سرکار کیا ہیں۔؟"

"معلوم نہیں۔۔۔!" میں نے پوری سچائی سے جواب دیا۔"وہ سب میں رہ کر، سب سے مختلف ہیں۔شائد خدا نے انہیں کسی خاص کام کے لئے بھیجا ہے۔" میں نے کہا۔

''ایسے ہی مخلص، بے ریا افراد ملک وملت کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ کتنی خاموشی سے دوسروں کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔!'' قدیر نے انتہائی عقیدت سے کہا۔

میں کچھ نہ بولا۔ اچانک غلام حسین نے ہمیں مخاطب کیا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں آپ دونوں جی۔؟''

''علی مراد کے متعلق۔!'' قدیر نے کہا۔

''اس کے متعلق کیا سوچنا جی۔؟'' غلام حسین نے کہا۔ ''رب کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ وہ تو جی انسان اپنی سوچ رہا ہوتا ہے۔ لیکن رب کی اپنی ہی مرضی ہوتی ہے۔ آپ دیکھنا ہر شئے میں، ہر حرکت میں کوئی نا کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ بس کبھی کبھی ہم سمجھتے نہیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے سارا کچھ واضح نہیں ہوتا۔ غیب کے پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔!''

''غلام حسین چاچا۔۔!'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''بہت ساری باتیں پردہ غیب میں کیوں ہوتی ہیں۔ سامنے ہوں تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔؟''

''نہ خلیفہ جی، سُوہنے پتر۔۔!'' غلام حسین نے بڑے ہی پیار سے کہا۔ ''سب کچھ سامنے ہو تو پھر بازی کھیلنے کا مزہ کیا۔ کبڈی کے پہلوان کو پالا مارنے کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر اس کو پہلے سے ہی معلوم ہو کہ وہ پالا مار لے گا تو پھر کھیل کا سارا مزہ، سارا جذبہ ہی جاتا رہے گا۔ ہر چیز اپنی ہی ہونے کا چلن ہو جائے گا۔ سب اپنے اپنے فائدے سوچیں گے۔ تو پھر ہار جیت کی، کامیابی، ناکامی کی جو کھد بد دل کو تلملائے رکھتی ہے۔ وہ ہی ختم ہو جائے گی۔ زندگی تو جی بالکل سادی ہو جائے گی۔ اس لئے جی ساری رونق ہونے نا ہونے کے خوف سے ہے۔ یہی خوف بندے کو، زندگی کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ حوصلہ دیتا ہے۔ لڑنے کا، بیقرار رہنے کا۔ ورنہ پھر تو ساری حیاتی بے زار ہی رہنا پڑتا۔!''

''خلیفہ جی۔۔۔!'' دفعتاً غلام حسین نے مجھے مخاطب کیا۔ ''جی یہ علم شلم کچھ نہیں ہوتا۔ بس رب کا کرم، مرشد کا فیضان ہوتا ہے۔ اُس علیم وخبیر کے آگے مَیں ترک کر دو، انکساری اور عاجزی کی چادر اُوڑھ لو تو سارے انجان راستے ہاتھوں کی لکیر بن جاتے ہیں۔ علیم اور خبیر بتاتا رہتا ہے۔ خبر دیتا رہتا ہے۔ سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔ جن پر کرم ہوتا ہے وہ تو سرکار ہوتے ہیں۔ آپ کے ہمارے مرشد قادری سرکار۔!'' غلام حسین کے انداز میں، بات میں، ادا میں پیار تھا۔ شرارت تھی۔ چلبلاہٹ تھی۔ بچے کو بہلانے والی پچکار تھی۔ استاد والی جھڑک اور ماں والی لاڈیاں تھیں۔ کتنا رنگین، پرت در پرت تھا۔ غلام حسین۔

''تم میں کچھ خاص ہے۔'' میرے وجدان نے کہا۔

''یہی خاص ہے کہ ہم عام ہیں۔ پوشیدہ ہیں۔ اب اور کیا جانو گے خلیفہ جی۔؟'' کسی نے کہا۔ میں چونک گیا۔ غلام حسین مسکرا رہا تھا۔ سب خاموش تھے۔ مگر خاموشی بول رہی تھی۔ یہ میں جانتا تھا یا غلام حسین۔

☆.....☆.....☆

ہم لوگ کھانا وغیرہ کھا کے لیٹے ہوئے تھے۔ قدیر اور ہم باتیں کرتے کرتے عالم غنودگی میں ہی تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ آہٹ سے میں اور قدیر دونوں چونک کے اٹھے، مگر اس سے پہلے کہ کوئی آواز نکالتے یا ان کا مقابلہ کرتے، کسی نے ہمارے اوپر چادر ڈال کر ہمیں گردنوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ان کے ہاتھوں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ اس عجیب تلخ بو نے ہمیں چند ہی لمحوں میں بے حواس کر دیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اور میں فرش پر پڑی ایک موٹی سی چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔ میرا منہ حلق تک کڑوا ہو رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ تھوڑے فاصلے پر کوئی عجیب آڑھا ٹیڑھا وجود پڑا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ جیسے خادم حسین ہے۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔ ''خادم حسین۔۔ خادم حسین۔۔!''

''تنزیل۔۔۔!'' اچانک ایک اور آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں پہچان گیا۔ یہ قدیر کی آواز تھی جو میرے دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ میں دائیں جانب مڑ گیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سب کچھ دُھندلا دُھندلا دکھائی دے رہا تھا۔

''میں ادھر ہوں۔۔!'' قدیر نے کہا۔

میں آہستہ آہستہ زمین پر ہی کھسکتا ہوا اس کی طرف پہنچا۔ مجھ میں سیدھا کھڑا ہونے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ ''کیسے ہو۔۔۔؟'' میں نے قدیر کو چھوا۔ وہ بندھا ہوا تھا۔ ہاتھ پیروں سے، سیدھا پڑا ہوا۔ میں نے اسکے ہاتھوں کو ٹٹولا، وہ کسی مضبوط رسی سے بندھے ہوئے تھے۔

''میری جیب میں چھوٹا چاقو ہے۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ نکالو۔۔!''

'میں نے بڑی مشکل سے اس کی پچھلی جیب سے چاقو نکالا۔ بظاہر یہ لائٹر تھا مگر اس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی تھا۔ میں نے اس کے ایک ابھرے ہوئے حصے کو دبایا تو چاقو ایک دم باہر نکل آیا۔ میں نے چاقو آہستہ آہستہ سے اس کے ہاتھ کی رسیوں پر رگڑنا شروع کیا۔ تھوڑی سی کوششوں سے قدیر کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔

''ہم کہاں ہیں۔؟'' قدیر نے اپنے دونوں ہاتھوں کو تیزی سے ملتے ہوئے پوچھا۔ اور پیروں کی طرف جھک گیا۔

''معلوم نہیں۔۔۔!'' میں نے اس کے پیروں کی رسیوں کو بھی کاٹ دی اس کے پیر بھی آزاد ہو گئے۔

''یہ کس کی کاروائی ہو سکتی ہے۔!'' قدیر کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''تیسرا یقیناً خادم حسین ہی ہوگا۔'' میں نے تیسرے وجود کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ خادم حسین ہی تھا بے سدھ پڑا ہوا۔ میں نے اور قدیر نے مل کر اس کی رسیاں کھولیں، اس کے ہاتھ پیروں کی مالش کی جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ دس پندرہ منٹوں میں اس کو ہوش آ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

ہم تینوں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک قدیر کی نگاہ ایک کونے میں رکھے ہوئے گھڑے پر پڑی، وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے مٹکا چھوا اور ہلایا ''اس میں پانی ہے۔!'' اس کی ہیجان آمیز آواز سنائی دی۔ اس وقت یہ خبر ہمارے لئے بے حد اہم تھی۔ پانی کی اطلاع کے ساتھ ہی جیسے ہمارے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ اس نے مٹی کے آب خورے میں پانی بھرا اور میری طرف بڑھایا۔

''پہلے تم پی لو۔۔!'' میں نے کہا۔

''قدیر نے میرا جواب سنتے ہی پانی کا آب خورہ منہ سے لگالیا۔ اور چند ہی گھونٹ میں آب خورہ خالی کر دیا۔ پھر وہ مٹکا ہی اٹھالایا اور ہمارے درمیان رکھ دیا۔ اس میں سے پانی نکال کر اس نے باری باری ہمیں پلایا۔ پانی پینے کے بعد حلق کی کڑواہٹ کم ہوگئی۔ اعصاب قدرے ڈھیلے ہوگئے۔

''ہم کسی کی قید میں ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔

''یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ ہم کسی کی قید میں ہیں، مہمانوں کو تو یوں نہیں رکھا جاتا۔!'' میں نے کہا۔

قدیر جھینپ گیا۔ ''میرا یہ مقصد نہیں تھا۔''

''بات یہ تو طے ہے کہ ہم کو ڈاکو تو اٹھا نہیں سکتے، ڈاکو تو ایسی واردات کرنے سے پہلے اپنے شکار کا خاصا ہوم ورک کرتے ہیں۔ مال کا حساب لگاتے ہیں تاکہ ڈیمانڈ بھی کر سکیں۔!'' میں نے کہا۔

''میری پوچھیں جی تو یہ سیدھی کاروائی علی مراد کی ہے۔!'' خادم حسین نے کہا۔ ''وہ کافی غصے میں تھا۔!''

''شائد مگر مجھے نہیں لگتا۔۔!'' میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''علی مراد کی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ قادری سرکار کے خلاف کوئی حرکت کرے۔۔۔!''

''پھر۔۔۔ پھر تو یہ حرکت ایک ہی شخص کر سکتا ہے۔'' قدیر نے دفعتاً جیسے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم تین یک لخت چپ ہوگئے۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تھال تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو بندوق بردار بھی اندر آگئے۔ وہ بے حد محتاط اور چوکنا تھے۔

''ارے یہ تو کھل گئے۔۔!'' ایک بندوق بردار نے حیرت سے کہا۔

اس کی بات سنتے ہی دوسرے نے اپنی رائفل سیدھی کر لی اور پوری طرح مستعد ہوگیا۔

سب سے پہلے اندر آنے والے نے آگے بڑھ کر تھال ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس میں کھانا تھا۔ وہ دونوں محفوظ فاصلے پر کھڑے رہے، مبادا ہم کوئی حرکت کریں اور ان کو ممکنہ جوابی کاروائی کرنا پڑے۔

اچانک جیسے میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ لمحوں میں کچھ خیالات میرے اندر ابھرے اور مجھے متفق کر گئے۔ اپنے اندر لمحوں میں فیصلہ کر لینا۔ یہ میں نے پہلی بار کیا تھا۔

''سنو۔۔۔!'' میں نے کھانے کا تھال رکھنے والے سے کہا۔ ''ایک تو مٹکے کا پانی ختم ہوگیا ہے۔ دوسرے کھانے کے بعد ہمیں چائے کی عادت ہے۔ ذرا تیز پتی کے ساتھ چائے لانا۔ چینی علیحدہ۔۔!''

میری اس فرمائش پر تھال والے نے مجھے ایسے دیکھا کہ جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ میرے دونوں ساتھی خادم حسین

اور قدیر نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔ اور جیسے برقی سرعت سے تمام ماجرا ان کے ذہن میں منتقل ہو گیا۔ ''ذہنی ہم آہنگی خیالات کی تیزی سے منتقلی کا سبب بنتی ہے۔'' مجھے قادری سرکار کے خطاب کا ایک جملہ یاد آیا۔

''بڑی بات ہے بھئی۔!'' رائفل بردار میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں قید میں ڈر نہیں لگتا۔؟''

''کوئی بھی قید ہمیشہ کی نہیں ہوتی۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''تم شاہ کی قید نہیں جانتے، یہاں سے تو بچے بھی بوڑھے ہو کر رہائی نہیں پا سکتے۔!'' دوسرے نے کہا۔

ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ہماری ذرا سی لاپرواہی کے مظاہرے نے ہمارے پہلے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

''ہر چیز خدا کی مرضی سے ہے۔!'' میں نے انہیں جواب دیا۔ ''خدا ظالموں کی رسی ضرور دراز کرتا ہے۔ مگر ہمیشہ کے لئے انہیں معاف نہیں کرتا۔ تم شاہ جی کے ظلم کا آلۂ کار ہو۔ ان کے گناہوں کی پاداش میں تم بھی مارے جاؤ گے۔ گیہوں کے ساتھ گھن نے لازمی پسنا تو ہے۔''

''لو جی کیا مثال دی خلیفہ جی۔۔!'' رائفل بردار میں سے ایک ہنسا۔ ''یہ کیسا انصاف ہے کہ جی گیہوں کے ساتھ روزی حاصل کرنے والا ننھا گھن بھی پیسا جائے۔ یہ اللہ والے بھی کیا مثال دیتے ہیں۔۔!''

''مثال کی سچائی تو تم نے خود ہی جان لی۔!'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تم ہی کہہ رہے ہو نا کہ روزی کا چکر تھا۔ تو جہاں سے روزی حاصل کی جائے گی۔ جس سے روزی حاصل کی جائے گی۔ اس کے حشر میں تمہیں بھی ساتھ لپیٹا جائے گا۔ کیونکہ تم ظالم کے ظلم کا سبب بنتے ہو۔ ظلم کی چکی سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہو، دوسری وجہ گھن کی پسنے کی یہ ہے کہ گندم کھانے کے بعد بھی اس کی نیت نہیں بھرتی۔ مزید کھانے کا لالچ اس کو گندم کی دنیا سے نکلنے ہی نہیں دیتا۔ پھر جب بورے کے بورے گندم چکی پر الٹائی جاتی ہے تو پھر گیہوں کو طوہاً و کرہاً پسنا ہی پڑتا ہے۔ تم بھی ایک دن پیسے جاؤ گے۔!''

''چل اوئے فیتے یہ تو ہمیں باغی کر دیں گے۔!'' دوسرے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے ساتھ قدیر اور خادم حسین بھی ہنسنے لگا۔ لمحے بھر کیلئے ہمیں یوں لگنے لگا کہ جیسے ہم کسی قید میں نہیں پکنک پر آئے ہوں۔ جب کسی چیز کا سبب معلوم ہو جائے تو بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تینوں کھانا رکھ کے چلے گئے۔ ہم لوگ کھانا کھانے لگے۔ گوشت اور چاول ملا کر طاہری نما کوئی چیز بنائی گئی تھی۔ ہلدی کا ذائقہ سب سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

''یار تنزیل تم نے بڑی تیزی سے حکمت عملی مرتب کر لی۔!'' قدیر نے توصیفی لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں قدیر بھائی۔۔!'' خادم حسین نے بھی اس کی تائید کی۔ ''خلیفہ جی کا ذہن تو گویا بجلی ہے، کمپیوٹر ہے۔ فوراً ہی نتیجہ اخذ کر لیا۔!''

''اگر ہم سیدھے سبھاؤ ان سے پوچھتے تو وہ ہم پر رعب ڈالنے کے چکر میں کچھ نہ بتاتے۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم

لوگ فوراً ہی میرا اندازِ فکر سمجھ گئے۔!'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''لیکن اب ہوگا کیا۔؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ دیر ہمیں اپنی قید میں نہ رکھ سکیں گے۔!'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''شاہ ہارون گیلانی نے اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو اس کو یہ فیصلہ واپس لینا ہوگا۔ وہ کسی بھی صورت قادری سرکار کی مخالفت مول نہیں لے گا۔!'' میرے ذہن میں قادری سرکار کی خانقاہ میں شاہ ہارون گیلانی کا انداز واضح ہو گیا تھا۔

''مگر کیسے۔۔۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

جواباً میں نے انہیں خانقاہ میں شاہ ہارون گیلانی کی آمد والا واقعہ سنا دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے سارا واقعہ سنتے رہے۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس مرتبہ شاہ ہارون گیلانی نے قادری سرکار سے کھلی مخالفت مول لے لی۔!'' قدیر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''کیا اس کو اندازہ ہے کہ اس حرکت کا نتیجہ کیا نکلے گا اس کے حق میں۔؟''

''اگر عاقبت اندیش ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔!'' خادم حسین نے کہا۔ ''اب تک سرکار کو ان کی اس حرکت کی اطلاع مل چکی ہو گی اور سرکار نے ضرور کوئی نہ کوئی قدم اٹھایا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قادری سرکار کی بددعا سے بچائے۔!''

''کیا مطلب۔۔؟'' اس مرتبہ ہم دونوں نے حیرت سے کہا۔ سرکار کی شخصیت کے اس پہلو سے ہمیں کبھی واقفیت ہی نہیں تھی۔ ہم نے تو اب تک انہیں سراپا محبت اور پیار ہی دیکھا تھا۔ ان کے جمال کا رُخ ہم پر اس شدت سے روشن تھا کہ جلال کی متعلق ہمیں کچھ علم ہی نہ تھا۔

''یہ میں آپ کو لکھ کے دینے کو تیار ہوں کہ شاہ ہارون گیلانی کا بُرا وقت شروع ہو چکا ہے۔!'' خادم حسین نے کہنا شروع کیا۔

''آپ لوگ شائد خلوت یا جلوت میں سرکار کے ساتھ مسلسل نہیں رہے۔ نا ہی آپ کو کبھی سرکار کی خدمت میں دن رات بتانے کا موقع ملا۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوتی رہی ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے ان کے کسی مرید کو نقصان پہنچایا، یا غلط کام کئے اور پھر ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے ان پر ڈٹے رہے۔ ان کے بڑے عبرت ناک انجام ہوئے۔ یا پھر جنہوں نے قادری سرکار کو دکھ پہنچانے کی یا ان کو نقصان پہچانے کی کوشش کی۔ ان کے بھی بڑے خوفناک انجام ہوئے۔ میں اور ندیم سرکار کا خادم خاص ان میں سے کئی معاملات کے عینی شاہد ہیں۔ ایک مرتبہ ایک بہت مشہور سیاست دان نے سرکار کو ایک خاتون کے معاملے میں بدنام کرنے کی کوشش کی۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ سرکار کے کئی عقیدت مند بھی ڈانوڈول ہو گئے۔ سرکار نے سب کو بلا لیا۔ ڈی آئی جی جو سرکار کے عقیدت مند تھے۔ ان کو بھی سرکار نے حکم دیا کہ وہ بھی آجائیں، وہ خاتون خود بھی بہت معروف تھیں۔ بہت خوبصورت تھیں۔ خانقاہ میں یہ سارا معاملہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ان خاتون کے گاڈ فادر سیاست دان نے بڑی باتیں بنائیں۔ سرکار سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔

''میں اس تمام معاملے کو اپنے اللہ کریم عادل و رحمٰن حفیظ و مقتدر کے سپرد کرتا ہوں۔ خاتون خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیں کہ میں نے ان کے ساتھ کیا گستاخی کی۔؟''

خاتون کو جی موقع مل گیا۔ اس نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا، اس کو زبان پر لانا ہی باعث شرم ہے۔ اس نے جو کہا کم از کم کوئی

شریف زادی اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔

اُدھر سرکار کمال ضبط سے سنتے رہے۔ ہم سب دم بخود تھے۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ ٹوکے سے اس عورت کا قیمہ کردوں۔ جس کی زبان اس قدر فحش ہوگی۔ اس کے کردار کا کیا کہنا۔ کیا سننا۔؟ مگر سوہنے رب کو تو جی اپنے بندوں کی عزت پیاری ہوتی ہے۔ وہ اندھوں کو آنکھیں، اور تاریک دلوں کو روشنی ایسے ہی واقعات سے عطا فرماتا ہے۔ جب عورت بک جھک کر خاموش ہوگئی، تو قادری سرکار نے دو رکعت نماز نفل پڑھی اور بلند آواز سے دُعا کی۔

''اے اللہ اے۔ میرے معبود۔ اے ستار العیوب۔ اے مقلب القلوب۔ تو میرا سچا رب ہے۔ ہم سب کے دلوں کا حال، میری بے گناہی اور گناہ ہر شئے کو حقیقی طور پر جانتا ہے۔ اے میرے معبود اس خاتون نے جو الزامات لگائے۔ اگر یہ سچ ہیں تو میرے بدن کا وہ حصہ سڑ جائے، کوڑھ زدہ ہو جائے۔ جسکے ذریعے میں نے اس خاتون کی بے حرمتی کی ہو۔ یا عادل یا غفار یا قہار میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو اپنا عدل دکھا۔''

قادری سرکار دُعا کے بعد آنکھیں بند کر کے وہیں جاء نماز پر بیٹھے رہے۔ قادری سرکار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ خاتون بدن کے مختلف حصوں کو کھجانے لگی۔ پھر اچانک وہ چیخنے لگی۔ اس کے ناخون، خون اور گوشت کے ریزوں سے بھر گئے۔ یوں لگا کہ جیسے ان تمام حصوں سے خون اور گوشت گل کر گر رہا ہو۔ پھر اچانک ہی اس عورت کے ساتھ آئے ہوئے سیاست دان بھی چیخنے لگے۔ ''مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ مجھے آگ لگ رہی ہے۔'' ذرا دیر میں انہوں نے اپنا تھری پیس اُتار پھینکا اور تقریباً برہنہ ہو کر چیخنے لگا۔

قادری سرکار رب کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ ہم سب حیران تھے۔ اچانک ڈی آئی جی صاحب اٹھے اور انہوں نے سرکار کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''حضور بس کردیں۔ سرکار معاف کردیں۔ معاف کردیں۔!'' خود وہ بھی کپکپا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اللہ رب العزت نے اپنے ولی، اپنے پیار کرنے والے کا معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ چاروں طرف جلال کی تابانیاں عروج پہ تھیں۔ ہم سب بری طرح کپکپا رہے تھے۔ ہمارے گھٹنے کانپنے لگے اور ہم سب جہاں تھے اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑے۔ بس ڈی آئی جی تھے جو سرکار سے مسلسل التجائیں کر رہے تھے۔ آخر کار سرکار کو رحم آ گیا۔ انہوں نے درود تاج کی بڑی خوش الحانی سے تین مرتبہ تلاوت کی۔ جوں جوں درود شریف کی تلاوت ہو رہی تھی، خاتون اور ان سیاست دان کو قرار آتا جا رہا تھا۔ خانقاہ کی فضاؤں سے جلال کے اثرات کم ہونے لگے۔

سرکار نے فرمایا۔ ''بی بی ہم فقیروں کو تنگ نہ کیا کرو۔ جاؤ اللہ حفاظت فرمائے۔!'' وہ دونوں بڑی ہی مشکل سے وہاں سے توبہ کرتے اور گھسٹتے ہوئے اپنے وجود لے گئے۔ ایسے نجانے کتنے ہی واقعات ہیں۔!'' خادم حسین خاموش ہو گیا۔

''اللہ والوں سے محبت رکھنی چاہیے ان پر الزامات توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔!'' قدیر نے بے ساختہ توبہ توبہ کی۔

آج پہلی بار قادری سرکار کا یہ روپ ہمارے سامنے آیا تھا۔ اور ساتھ ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ لوگ سرکار سے پیار، اتنی محبت، اتنی عقیدت کیوں رکھتے ہیں۔ واقعی جن کی عزتوں اور نیکیوں کا اللہ پاک محافظ ہو۔ ان کے مقامات کا کیا کہنا۔ مجھے قادری سرکار کا درس یاد آیا۔ ''لوگ پوچھتے ہیں سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات کیا ہیں۔ ارے پہلے ان کے غلاموں کے مقامات تو جان

لو۔ پھر غلاموں کے آقا کے مقامات سمجھ لینا، تو وہ تو اُس مقام پر ہیں جہاں عقل سجدہ کرتی اور شعور جلا پاتے ہیں۔ جن کی آنکھوں نے رب کو دیکھا۔ جن کے دل نے عرشیں معلیٰ پر تجلیات کا مشاہدہ کیا ہو۔ اپنے ان مقامات کی تعبیر و تشریح خود سرکار مدینہ ہی کر سکتے ہیں۔ نہ ہماری تاب نہ مجال کہ ہم اپنے سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات بتا سکیں۔ نااہل دنیا کے دل، سوال کرنے والوں کے ذہنوں میں اتنی وسعت ہے۔ اگر ان مقامات کو جاننا سمجھنا چاہتے ہو تو پھر پیار کا، محبت کا، عشق کا کاسہ پھیلا دو۔ دیکھو مقام والے تمہیں کیا مقام عطا کرتے ہیں۔"

"کیا شاہ ہارون گیلانی کے علم میں سرکار کے درجات نہیں۔؟"

"یہ اہل سیاست، دنیاوی علم رکھنے والے ان باتوں کو عقیدت مندوں کی داستان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ سارے معاملات عقیدت مندی کی ہرزہ سرائی کے سوا کچھ نہیں۔" خادم حسین نے کہا۔

"لیکن سرکار کی ایک پیش گوئی تو ہر جگہ گردش کر رہی ہے کہ ضمنی انتخابات سے ایسا اپ سیٹ ہوگا کہ حکمران اتحاد کے لئے مشکلات ہوں گی اور ان میں پھوٹ پڑنا شروع ہو جائے گی۔" قدیر نے بتایا۔ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اچھا۔۔۔!" خادم حسین نے حیرت سے کہا۔ "مجھے اس پیش گوئی کا نہیں پتا۔ لیکن سرکار کا کہنا غلط نہیں ہو سکتا۔!" اس کے لہجے میں حد درجہ یقین تھا۔

ہم لوگوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ اور پانچ سات افراد اندر آ گئے۔ وہ جدید رائفلوں سے مسلح تھے۔

"چلو اٹھو۔۔۔!" ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں کہا۔

ہم تینوں کھڑے ہوئے، وہ پھٹ کر دو قطاروں میں بٹ گئے۔ ہم تینوں ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ باہر اچھی خاصی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اندر کمرہ تو نیم تاریک تھا۔ وہ ہمیں رائفلوں سے ہنکاتے ہوئے ایک وسیع و عریض تہہ خانے میں لے آئے جہاں ایک طرف سے وسیع اور اونچا سا دیوان تھا۔ جس پر ہارون گیلانی اپنے پورے کروفر کے ساتھ براجمان تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر ایک خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا۔

وہ لوگ ہمیں تقریباً دھکیلتے ہوئے دیوان کے قریب لے آئے۔ شاہ ہارون کے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کو میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ وہ عبداللہ شاہ گیلانی تھا۔ اس کی تصاویر سے تو سارا علاقہ ہی بھرا ہوا تھا۔

"بہت خوب۔۔۔!" شاہ ہارون گیلانی نے ہم پر نظر پڑتے ہی کہا۔ "کافی لوگ مذاکرات کے لئے آئے ہیں۔!"

ہم تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "شاہ جی یہ سفید کرتے پاجامے والے تنزیل میاں ہیں، خلیفہ جی قادری سرکار کے۔" میں نے دیکھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی اس تعارف پر اپنی کرسی پر بری طرح کسمسایا۔

"اور یہ ان کے ساتھ خانقاہ سے آئے ہوئے قدیر۔ ان کے دوست۔ اور یہ اپنے کھوجی غلاموکا پتر، خادم حسین۔ خیر سے اب سیاست میں آ گیا ہے۔ وزیر اعظم بننے کے لئے۔!" تعارف کروانے والے کے انداز میں بے پناہ حقارت اور بے پناہ تضحیک تھی۔

''چل بھئی کاغذ دے ان کو۔!'' کسی نے کہا۔اس کے ساتھ ہی ایک آدمی ایک کاغذ،قلم اور انک پیڈ لے آیا۔

''بھئی خادم حسین ان پر سائن کردو۔!'' دو آدمیوں نے آکر خادم حسین کو دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا ہے۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔اس کی آواز میں کسی گھبراہٹ کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں تھا۔

''وہی جو علی مراد نے تیرے لئے کیا۔تیرے حق میں دست برداری کا اعلان۔جس کو تو نے لمحوں میں میڈیا تک پہنچا دیا۔''

اچھا تو یہ کھیل ہارون گیلانی کے شاطر ذہن نے رچایا تھا۔

''میں کوئی دستخط نہیں کرونگا۔!'' خادم حسین نے صاف،ہموار لہجے میں کہا۔''اور علی مراد کو میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ میرے حق میں دست بردار ہو۔وہ اپنی مرضی سے دست بردار ہوا۔!''

''اوے خادمے۔!'' کسی نے کہا۔''شاہوں کے حضور گستاخی نہ کر،اِدھر پورے علاقے میں کسی کی مرضی ہوتی ہے کبھی۔جو چاہتے ہیں۔وہ ہوتا ہے اور وہ سب شاہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔بھلا کسی کمی کمار کی جرأت کہ وہ اپنی سوئی برابر بھی مرضی کر سکے۔!''

''تو چپ رہ طارق میں ذرا اس کی زبان کے کس بل نکالتا ہوں۔!'' اچانک کسی نے عقب سے مداخلت کی۔

''ہاں بھئی شیدے یہ تیرا ہی کام ہے۔!'' طارق ہمارے سامنے سے ہٹ گیا۔چند ہی لمحوں میں ایک سیاہ رُو چھ فٹ سے زائد لحیم شحیم آدمی ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔اس نے خادم حسین کو گردن سے اٹھا کر تقریباً دو تین فٹ بلند کیا۔دُبلا،پتلا چھریرے بدن کا خادم حسین ہوا میں بلند ہو گیا۔اس نے خادم حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔پھر اچانک خادم حسین کو چھوڑ دیا۔خادم حسین پنجوں کے بل گرا۔اس نے بڑی خوبی سے اپنا توازن برقرار رکھا۔

شیدے کو غالباً اس بات کی توقع نہیں تھی۔اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔اس سے پہلے کہ اس کا زناٹے دار تھپڑ خادم حسین کے منہ پر پڑتا۔فضا میں ایک نئی آواز گونجی۔

''ٹھہرو۔۔!'' شیدے کا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

''ٹھہرو۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔''مار پیٹ کی ضرورت نہیں۔انہیں کون لایا ہے۔؟''

''عبداللہ۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری آواز گونجی۔''اسی لئے ہم آپ کو یہاں آنے سے منع کر رہے تھے۔ان معاملات کو ابھی آپ نہیں سمجھتے۔جس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔اُسی طرح سے بات کی جاتی ہے۔!''

''لیکن یہاں کوئی تشدد نہیں ہوگا۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔''پھر انہیں الیکشن سے دست برداری پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔میں تو ایسا بالکل نہیں چاہتا۔۔؟''

''بات آپ کے چاہنے یا نا چاہنے کی نہیں ہے عبداللہ۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔''ہمارے علاقے میں کوئی شخص ہماری مرضی کے بغیر سانس نہیں لے سکتا۔ان کے جسم و جان صرف ہمارے اشارے پر حرکت کرتے ہیں۔ان کی جرأت کیسے ہوئی شاہ ہارون

گیلانی کی رعایا ہوتے ہوئے ہمارے مقابلے پر آنے کی۔!"

"یہ سب گئے وقتوں کی باتیں ہیں۔!" عبداللہ شاہ گیلانی نے جواب دیا۔ "آج کی دنیا بدل گئی ہے ہر شخص اپنی ذات کی سطح پر احترام کا مستحق ہے۔ اور ہمیں اس کی ذات کی عزت کرنا ہوگی۔ کیونکہ یہ سب، اور ہم سب خدا کے بندے ہیں، ہر جسم و جان اُسی کی ملکیت ہے۔!"

"عبداللہ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔!" شاہ ہارون گیلانی کی پیشانی پر پسینے کے قطرات چمکنے لگے۔ "آپ حویلی میں جائیں۔ آرام کریں۔!"

"نہیں۔ چچا جان۔!" عبداللہ شاہ گیلانی نے بہت مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "پہلے انہیں چھوڑیئے پھر ہم جائیں گے۔!"

صورت حال اچانک ہی پلٹ گئی تھی۔ چچا بھتیجے میں اختلاف نمودار ہونے لگا تھا۔

"چھوٹے سرکار آپ اوپر چلیں۔۔!" طارق نامی آدمی نے جھک کر عبداللہ شاہ گیلانی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ "یہ سارے معاملات تو شاہ جی کے روزانہ کے معمولات ہیں۔" اس کا انداز بڑا عاجزانہ تھا۔

"ہوگا یہ معمول کا حصہ۔!" عبداللہ شاہ گیلانی نے بدستور اُسی لہجے میں کہا۔ "مگر آج یہ معاملہ ہم سے جڑا ہے۔ اگر ان کو نہیں چھوڑا گیا تو ہم خود خادم حسین کے حق میں دست برداری کا اعلان کر دیں گے۔!"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟" شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ مارے حیرت کے تبدیل ہو گیا۔ عبداللہ شاہ گیلانی کے الفاظ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ خود شاہ ہارون گیلانی کے لئے بھی بے حد حیران کن تھے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم۔۔۔!" عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ "جن کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہو۔ ہم ان کو کیسے غلام بنا سکتے ہیں۔؟ ان کے بدن ضرور ہمارے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔ مگر ان کی روحیں آزاد ہیں۔ اور یہ آزادی خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی ہے۔ ہم کون ہیں ان کی آزادی کو قید کرنے والے۔ چلو چھوڑو۔۔ انہیں۔!" عبداللہ شاہ گیلانی کے لہجے میں ایسی گرج، ایسی چمک تھی کہ ہمیں پکڑے ہوئے لوگ اچانک پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

اچانک سیڑھیوں سے بیک وقت کئی لوگوں کے اترنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں کچھ عورتیں اور لڑکیاں پھولی سانسوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے حواس باختہ انداز میں کہا۔ "شاہ جی جلدی اوپر چلیں۔ سیدانی یاد فرما رہی ہیں۔ قادری سرکار حویلی میں پہلی بار تشریف لائے ہیں۔!"

"قادری سرکار۔۔۔!" عبداللہ شاہ گیلانی یوں چونکا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ "سرکار آئے ہیں۔۔۔!" وہ اچانک دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سب ہی حیران تھے۔ شاہ ہارون گیلانی دیوان پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جیسے سب کچھ ہار گئے ہوں۔

☆.....☆.....☆

جو پردہ ہے نگاہوں سے نگاہوں کے درمیان

عبداللہ شاہ گیلانی کی وارفتگی یہ دیوانگی ہم سب کی سمجھ سے بالاتر تھی۔اس کا رویہ،اس کا انداز کچھ بھی شاہ ہارون گیلانی سے میل نہیں کھاتا تھا۔کیا کمال دکھایا تھا قادری سرکار کے اسم نے، ہماری محدود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

لیکن کوئی ایسا ان دیکھا، غیر مرئی رشتہ، ناطہ عبداللہ شاہ گیلانی اور قادری سرکار کے درمیان موجود تھا۔جس کا ہمیں ادراک نہیں تھا۔سب دم بخود بیٹھے تھے۔ساکت وصامت۔گوشت پوست کے مجسموں کی طرح۔

البتہ ہم تینوں بہت ہی مطمئن تھے۔ہمارا خیال صحیح تھا کہ قادری سرکار تک ہمارے اس طرح اٹھا لئے جانے کی اطلاع پہنچ گئی ہو گی اور وہ اس معاملے میں خاموش نہیں رہیں گے۔مگر وہ سیدھے یہاں آجائیں گے۔کون ہے ایسا کہ جس کے پاس وہ سیدھے آگئے۔اور اس تمکنت کے ساتھ کہ لوگ ان کی آمد کی اطلاع وفورِ مسرت سے سرشار ہو کر دے رہے ہیں۔

شاہ ہارون گیلانی جو دیوان پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔اچانک اٹھے اور باہر کی طرف بڑھ گئے۔

قادری سرکار حویلی کے مرکزی ہال میں اس شہہ نشین پہ بیٹھے تھے۔جہاں صرف شاہ ہارون گیلانی بیٹھتے تھے۔ان کے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا تھا۔حویلی کے ملازمین بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔''قادری سرکار آگئے، قادری سرکار آئے ہیں۔'' ملازمین کے عجیب حالات تھے۔چند دنوں قبل جہاں شاہ سکندر گیلانی کے سوگ نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔وہاں خوشی اور مسرت رقص کر رہی تھی۔شاہ ہارون گیلانی کو جیسے کوئی دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ورنہ جہاں جہاں سے وہ گزرتے تھے۔انسان تو کجا، عالم سارا مودب ہو جاتا تھا۔قدم ٹھہر جاتے اور نگاہیں سرنگوں ہو جاتیں۔گردنیں جھک کے قدموں کے بوسے لینے لگتی تھیں۔مگر آج وہ گزر رہے تھے۔اور کوئی ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ملازمین، خادمین، گھر والے ان کے اردگرد سے گزر رہے تھے اور شاہ ہارون گیلانی سے بے خبر تھے۔

''الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کو قیامت کا غصہ آرہا تھا۔ان کا جلال اپنے عروج پہ پہنچ رہا تھا۔اچانک ان کے سامنے سے ریاضے کمدار کا گذر ہوا۔انہوں نے کہا۔''ریاضے ادھر آ۔۔۔!''

مگر وہ ان کی بات سنے بغیر ان کے سامنے سے یوں گزر گیا کہ جیسے شاہ ہارون گیلانی نے اسے پکارا ہی نہیں، فیقے نے اُسے آواز ماری ہو۔وہ چلتے ہوئے حویلی کے مرکزی ہال میں پہنچے۔شاہ ہارون گیلانی کی مسند پر قادری سرکار بیٹھے تھے۔نہایت آب وتاب سے، ان کے ہونٹوں پر مخصوص محبت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔نرم اور بھاری قطعی آواز حویلی کے مرکزی ہال میں بلند ہو رہی تھی۔

انہیں شدید غصہ آیا۔کیوں آیا ہے یہ شخص۔؟ اور کیوں ان کی جگہ پر بیٹھا ہے۔؟ اور کس نے اس کو بیٹھنے دیا۔؟ اس پر تو ان کا بیٹا

نعمان شاہ گیلانی بھی نہیں بیٹھتا۔ان کی بیگم کبھی اس کرسی پر نہیں بیٹھیں پھر یہ کیوں ہے۔؟ کیا ہے۔؟ کیا یہ میرے غیض وغضب سے نہیں ڈرتا۔؟ کسی نے بھی اس کو نہیں سمجھایا۔؟ بے شمار سوالات ان کے ذہن میں چکرانے لگے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے عین اپنی کرسی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔قادری سرکار نے انہیں دیکھا اور مسکرا دیئے۔ایک معنی خیز مسکراہٹ۔

انہیں پھر شدید غصہ آیا۔''تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم حویلی میں آ کر اس مقام پر، میری کرسی پر بیٹھو۔؟''ان کی گرجدار آواز بلند ہوئی۔انہوں نے خود اپنے کانوں سے اپنی آواز سنی۔

مگر قادری سرکار پر کوئی اثر نہ ہوا۔انہیں بے حد حیرت ہوئی۔''اٹھاؤ اس کو۔۔!''انہوں نے قادری سرکار کے سامنے ہاتھ باندھے ریاضے کمدار کو حکم دیا۔مگر ریاضے کمدار نے ان کے حکم کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی۔وہ بدستور قادری سرکار میں متوجہ رہا۔تب اچانک انہیں ایک عجیب احساس ہوا۔وہ سب کو دیکھ رہے ہیں۔آوازیں سن رہے ہیں۔مگر کوئی ان کو نہ دیکھ رہا ہے۔نہ سن رہا ہے۔یہ کیا ہو رہا ہے؟۔شاہ ہارون گیلانی زندگی میں پہلی بار خوف زدہ ہوئے۔

''کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا۔؟''دفعتاً ایک احساس ان کے اندر چمکا۔انہوں نے اپنے بازوؤں میں بڑی زور سے چٹکی لی۔تکلیف کی شدت سے ان کی کراہ نکل گئی۔ان کے بدن میں تکلیف کو محسوس کرنے کی حس موجود تھی۔گویا وہ زندہ تھے۔مگر پھر کیا ہو رہا ہے یہ۔؟ کوئی ان کی موجودگی ان کی آواز کو سن کیوں نہیں رہا۔؟

قادری سرکار کی انہیں آواز سنائی دی۔وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

''صاحبو!۔۔قرآن مجید کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس میں موجود بعض قصے ایسے ہیں، جو کہ نا صرف یہ کہ تاریخی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں۔بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا ان کی مثال کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پر منطبق فرما دیتا ہے۔اور ہمیں اس کے ذریعے اپنی اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ایسی ایک مثال اصحاب کہف کی ہے۔جنہیں اللہ تعالیٰ نے ظالم بادشاہ سے بچا کر ایک غار میں گہری نیند میں سلا دیا تھا۔اور پھر کئی سو برس کے بعد انہیں بیدار کیا تو انہیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ دو چار گھڑی ہی سوئے ہیں۔جب ان میں سے ایک کھانا لینے باہر نکلا تو انہیں ان کے سکوں کے ذریعے پہچانا گیا۔اور ان بھائیوں پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ کئی سو برس سوتے رہے ہیں۔دوستو!اس قصے میں عبرت کے کئی پہلو ہیں۔ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں موت کے بعد جی اٹھانے پر قادر ہے۔دوسرے یہ کہ جو اللہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ظلم کے خلاف ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرتے ہیں۔تیسرے یہ کہ یہ فانی زندگی کتنی طویل کیوں نا ہو جائے بالآخر اس کو ختم ہو جانا ہے۔چوتھے یہ کہ اللہ چاہے تو انسان کے بدن کو مٹی نہیں کھا سکتی۔پانچویں یہ کہ خدا جب چاہے کسی کو بھی، کسی بھی نگاہ سے پوشیدہ کر دے۔چھٹے یہ کہ زندگی جو بھی بے خبری میں گذاری جائیگی اس کی جواب طلبی لازمی ہوگی۔ساتویں یہ کہ خدا مظلوم کو ظالم کے مقابلے میں ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے۔!''وہ کہہ کر ذرا رکے اور بولے۔

''صاحبو!۔اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ہے''اللطیف جل جلالہٗ'' دوسرا اسم مبارک ہے''السلام جل جلالہٗ''اللطیف کو یا لطیف'' کے اسم ندا سے پڑھتے ہیں۔اور اس کا مطلب ہے انتہائی درجے کا باریک بین، چیزوں کی کیفیات اور حقیقتوں کو سمجھنے اور تخلیق کرنے والا، کہ ہمیں جن میں سے بعض کی جہت کا علم بھی نہیں ہوتا۔مگر وہ ہوتی ہیں۔دوسرے معنوں میں اسم اللطیف ایک ایسا پردہ ہے۔جس کے پار غیب کی دنیا ہے۔ وہ غیب جس کی حقیقت صرف اللہ کے علم میں ہے۔جیسے عالم برزخ، جو پردہ ہے دنیا اور آخرت کے درمیان۔جو پردہ ہے دوزخ اور جنت کے درمیان۔جو پردہ ہے یوم حساب اور یوم مرگ کے درمیان۔جو پردہ ہے عذاب قبر اور دنیا کے درمیان۔اور جو پردہ ہے نگاہوں سے نگاہوں کے درمیان۔تو جب چاہے اللہ اپنی صفتِ لطیف سے کثیف اجسام کو اتنا شفاف کر دے کہ وہ نظر ہی نہ آئیں۔اپنے وجود کے باوصف، ان کے ہونے کے احساس کو ہی سلب کر لیا جائے۔!'' آخری جملہ کہتے ہوئے قادری سرکار کی نگاہوں نے اُن کی نگاہوں کو جکڑ لیا۔

شاہ ہارون گیلانی کو محسوس ہوا کہ قادری سرکار انہیں دیکھ بھی رہے ہیں اور ان سے مخاطب بھی ہیں۔

ان کی آواز [illegible] ''اللطیف [illegible] باطن [illegible] کا تخلیقی کار [illegible] ہے اپنی صفتِ سلام کے ذریعے انہیں پھر سے مکمل کر دیتا ہے۔ان کے وجود کو لطیف کر دیتا ہے۔اور ظاہراً انھوں کی کیفیت اور ذہن کی صلاحیت کے مطابق انہیں ڈھال دیتا ہے۔اور یوں زندگی کی اتھل پتھل کو ہموار کر دیتا ہے۔تو کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی اصلاح کر لیں۔ دوستو۔!ہمیں اپنے آج کی قدر کرنی چاہیے۔وہ پل غنیمت ہیں کہ جن میں ہم ہیں۔اس پل کی بہ نسبت کہ ہم جس میں نہیں ہونگے۔فقط ایک یاد کی صورت باقی رہ جائیں گے۔کیا وقت نہیں آیا کہ ہم توبہ کر لیں۔اور عقل مند ہیں وہ نفوس جو کہ اپنے آپ کو بدل لیتے ہیں۔اپنے آپ کو سنوار لیتے ہیں۔قبل اس کے کہ ہر چیز وجود سے عدم کا رخ کر لے، اور ہم پائیدار سے ناپید ہو جائیں۔ہمیں اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔''ان کے لہجے میں بے پناہ نرمی حلاوت گداز تھا۔ایک مشفق رہنما۔ایک صلاح کار، ایک مخلص راہبر کا خلوص۔

شاہ ہارون گیلانی کو لگا کہ صرف اور صرف وہ قادری سرکار کے مخاطب ہیں۔سب ہی کچھ تو ان سے کہا جا رہا تھا۔تمثیل کے پیرائے میں، کسی اور کی صورت حال ان پہ کلی طور پر منطبق ہو رہی تھی۔

ان کا جی چاہا کہ وہ بیٹھ جائیں قادری سرکار کے پاس اور ان سے کہیں کہ بتائیں کہ وہ ان سب سے کیسے نکلیں۔؟ان کی ذات کی چار دیواری اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود پھلانگ نہیں سکتے تھے۔

''کوشش کرنا چاہئے ہمیں۔۔۔!'' قادری سرکار کی آواز انہیں سنائی دی۔''خدا کی طرف سے اصلاح کا جو بھی لمحہ مل جائے تو اس کے لئے پوری کوشش کرنا چاہیے۔آیئے شاہ ہارون گیلانی۔!''اچانک قادری سرکار ان سے مخاطب ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی جیسے دنیا بدل گئی۔ان پر نظر پڑتے ہی سب لوگ بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔بھلا کس میں جرأت تھی کہ وہ شاہ ہارون گیلانی کے سامنے بغیر اجازت بیٹھ سکے۔سب ہڑبڑا کے اٹھے۔

قادری سرکار مسکرانے لگے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں۔ کیا کریں۔ کیا بولیں۔ جیسے سماعت، آواز، ہر چیز بے بس ہوگئی ہو۔ لمحے بھر میں ہونے اور نا ہونے کا سفر انہوں نے طے کرلیا تھا۔

انہوں نے دیکھا۔ سیدانی ان کی عزیز ترین بیگم بڑے احترام سے چائے بنا کر اپنے ہاتھوں سے قادری سرکار کو پیش کر رہی ہیں۔ نازاں سیب کاٹ کر ان کی قاشیں ان کو پیش کر رہی ہیں۔ اور عبداللہ شاہ گیلانی ان کے قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔

''عزیز جہاں بہن ہمارے تین بچے آپ کی پرانی حویلی میں موجود ہیں۔ ذرا ان کو بلوایئے۔ ہم ان کے ساتھ ہی چائے پینا چاہتے ہیں۔!''

''جی سرکار۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے ادب سے سر جھکایا اور ریاضے کمدار سے کہا۔ ''جاؤ انہیں لیکر آؤ۔!''

ریاضے کمدار نے احترام سے گردن خم کی اور تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

شاہ ہارون گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے ان کا سارا وجود بے مصرف ہوگیا ہو۔

''آپ کے لئے چائے بناؤں۔؟'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے انہیں مخاطب کیا۔ ''آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔؟''

شاہ ہارون گیلانی کچھ نہ بولے۔ نازاں نے اپنے ہاتھوں تراشے ہوئے سیب کی قاشیں شاہ ہارون گیلانی کے سامنے رکھیں۔

انہوں نے بڑی حیرت سے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔ جن کی خدمت کے لئے سیدانی اور بنتِ سیدانی خود دیدہ و دل فرشِ راہ کئے تھیں۔

چند ہی لمحوں میں ریاضے کمدار کے ساتھ ہم تینوں بھی حویلی کے مرکزی ہال میں پہنچ گئے۔ جہاں سرکار موجود تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائے۔ ''آؤ میرے بچو۔۔!''

ہم تینوں دوڑتے ہوئے ان سے جا لپٹے۔ اس وقت اگر ہمیں سلیمانی خزانہ بھی مل جاتا تو شائد ہم اتنے خوش نہ ہوتے، جتنے ان کے پیار بھرے لہجے سے ہوئے تھے۔ ''آؤ میرے بچو!۔''

ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔

''شاہ ہارون گیلانی۔۔۔!'' قادری سرکار نے بڑی ملائمت سے کہا۔ ''جب ہمیں پتا چلا کہ بچے آپ کے مہمان ہیں۔ تو ہم نے بھی سوچا ہم بھی آپ کے مہمان بن جائیں۔!''

''یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے سرکار۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے بہت ادب سے کہا۔ ''آج تو حویلی کی نہیں، ہماری قسمت سنور گئی۔ اس حویلی پر تو آپ کے احسانات اس قدر ہیں کہ ہم مرنے کے بعد نہیں بھول سکتے۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

''نہیں بہن، بھائی اپنی بہنوں کے لئے دُعا کرتے ہیں احسان نہیں۔۔!'' وہ نرم لہجے میں بولے۔

''میں تو سچ مچ بھاگوں والی ہوگئی۔ آج اپنی ساری عبادتوں کا صلہ مل گیا کہ آپ کی بہن کے درجے پر فائز ہوگئی۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے سوالیہ نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا۔

وہ بولیں۔ ''نجانے کتنے احسانات ہیں میری ذات پر، اس حویلی پر سرکار کے۔ مگر سرکار نے کبھی پلکوں کے معمولی سے اشارے سے بھی اپنے احسانات کو نہیں جتلایا۔ یہ آج میں آپ کو بتاتی ہوں۔ مرحومہ بھابھی جان یعنی عبداللہ کی والدہ کے ہاں شادی کے آٹھ برس تک جب کچھ نہیں ہوا تو شاہ سکندر گیلانی اللہ ان کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے۔ اماں بیگم کے اصرار کے آگے مجبور ہو گئے تھے، دوسری شادی کے لئے، یہ آج سے اٹھائیس برس پہلے کا قصہ ہے۔!'' وہ سانس لینے کو رکیں اور پھر شوہر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''ہم نے قادری سرکار کے متعلق کسی سے سنا تھا۔ غرض مند تو دیوانہ ہوتا ہے۔ سرکار کے در پر جا پہنچے۔ اور ان سے دُعا کی درخواست کی۔ سرکار نے کمالِ شفقت سے ہماری درخواست قبول فرمائی اور دُعا دی۔ اسم الٰہی کی تلقین کی اور اسی وقت فرمایا۔

'' بیٹے کا نام عبداللہ رکھنا۔ یہ ہمارا بچہ ہوگا۔ ہماری دُعا سے، ہمیں اپنے رب سے سو فیصد اُمید ہے کہ وہ ہماری دعا اور تمہاری آرزو کو رد نہیں کرے گا۔''

اس دُعا کے ٹھیک نو مہینے کے بعد عبداللہ شاہ پیدا ہوئے۔ سکندر شاہ گیلانی کے گھر وارث کیا پیدا ہوا پھر دور حمتیں اور بھی آ گئیں۔ مگر عبداللہ شاہ تو قادری سرکار کی دُعا ہے۔ پھر جب آپ شادی کے لئے راضی نہیں تھے۔ اور انگلینڈ میں کیتھرائن کے معاملات میں الجھ گئے تھے۔ تب سرکار ہی کی دُعا تھی جو آپ اس کے چکر سے نکل آئے۔ پھر ہماری شادی ہوئی۔ پھر آج سے پندرہ سال پہلے جب مخالفوں نے ہمارے اوپر سخت قسم کے وار کئے تھے۔ ہماری عزت داؤ پر لگ گئی تھی۔ تب بھی سرکار کی دعاؤں نے ہمیں بچا لیا تھا۔ آپ کے لئے ہم نے ہمیشہ قادری سرکار سے پوچھ کر دعائیں مانگیں۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم طویل گفتگو کے بعد چپ سی ہو گئیں۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ پھر سیدانی عزیز جہاں نے دوبارہ کہا۔ ''یہ بات تو ہم جانتے ہیں کہ آج سرکار کی آمد بے وجہ نہیں ہے۔ سرکار نے ہمیں دیا ہے لیا نہیں، آج پہلی بار اس حویلی کی دھول نے سرکار کے قدموں کا بوسہ لیا ہے۔ سرکار کا جو حکم ہوگا۔ اس پر سر آنکھوں عمل ہوگا۔!''

شاہ ہارون گیلانی جو انکشافات کے پے در پے بوجھ تلے دبے تھے۔ کچھ بھی نہ بول سکے۔

''حکم کیجئے سرکار۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے قادری سرکار کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔

''میرے بچے۔۔!'' قادری سرکار نے اس کے سر کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کے بلند کیا۔ ''بچے یہاں نہیں ہوتے۔۔!''

''بچے یہیں تو ہوتے ہیں۔ اپنے بڑے، اپنے بزرگوں کے قدموں میں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کو اب سمجھ آیا کہ قادری سرکار کیوں اس کو اپنے سے لگے تھے۔ دُعا اور قبولیتِ دُعا کا رشتہ جو تھا۔

''میرے بچے تم ہماری دُعا ہو اور وہ ہماری تربیت۔!'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ''تم دونوں ہی ہمیں عزیز ہو، پیارے ہو، ہم تم دونوں کی بیکی نہیں چاہتے۔ ہمارے کہنے سے پہلے ہی تم تہہ خانے میں اپنا فیصلہ سنا چکے ہو۔!''

کتنا سچ ہے کہ جو ہونے والا ہوتا ہے۔قدرت اس کے متعلق ہمیں پہلے ہی سے تیار کر دیتی ہے۔ ہمارے منہ سے نکلنے والے لفظ آنے والے معاملات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

''یہ تو ایک معمولی سا کام ہے سرکار۔۔!''عبداللہ شاہ گیلانی نے وفورِ مسرت سے کہا۔''کاش آپ مجھ سے اپنی جان کا نذرانہ مانگتے۔!''

''جان صرف خدا کی امانت ہے میرے بچے۔!''قادری سرکار نے کہا۔''اور صرف اسی کے لئے قربان ہو سکتی ہے۔!''

شاہ ہارون گیلانی خاموش رہے۔قادری سرکار نے کہا۔''جو ہو رہا ہے۔اس کے بہت سے فائدے ہیں۔اللہ کی مصلحتیں بعض اوقات ہماری سمجھ میں اس لئے نہیں آتی ہیں کہ وہ قبل از وقت ہماری محدود عقل کے دائرے میں سما نہیں سکتیں۔لہٰذا ہم ان میں الجھنے لگتے ہیں۔جبکہ خدا کی رضا میں جھک جانا عافیت کا باعث ہوتا ہے۔پردے رہ جاتے ہیں۔کچھ حقیقتوں پر گرد پڑ جاتی ہے۔سفر آگے بڑھ جاتا ہے۔کدورتیں آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔''قادری سرکار کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ہم میں سے کوئی نہیں سمجھا کہ قادری سرکار کی اس گفتگو کی غرض و غایت کیا ہے۔؟لیکن ان جملوں کا اثر میں نے شاہ ہارون گیلانی کے چہرے کی بدلتی رنگت میں دیکھ لیا تھا۔

''آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔!''عبداللہ شاہ گیلانی قادری سرکار کے قدموں سے اٹھا اور ہمیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ہم نے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔انہوں نے اشارے سے ہمیں جانے کی اجازت دیدی۔ ہم کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ریاضے کمدار نے بڑے ادب سے روک کر ہمارے موبائل فون ہمیں پکڑا دیئے۔ہمیں تو ان فونوں کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔انہوں نے ہمیں اغوا کرتے ہوئے ہمارے موبائل اپنے پاس رکھ لئے تھے۔مگر اب بدلتی فضا میں وہ ہمیں دوبارہ دیدیئے گئے تھے۔

عبداللہ شاہ ہمیں لئے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔یہ کمرہ بھی مہمانوں کے لئے آراستہ تھا۔مگر اس میں دیواروں کے ساتھ تین چار بیڈ بھی لگے ہوئے تھے۔غالباً مہمان خانہ تھا۔ہم وہاں جا کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے گفتگو کا آغاز کیا۔''آپ لوگ میرے متعلق تو جان ہی چکے ہونگے۔آپ لوگوں کے متعلق میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔مگر میں تمام معاملات میں سرکار کے حکم کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔میری سچے دل سے خواہش ہے کہ میں الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں۔یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ میری فطرت کے خلاف ہے۔شائد اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جس نیک ولی کی دُعا کا ثمر ہوں اُسی کا اثر مجھے غلط ہونے سے روکتا ہے۔ظلم،خوف،جبر،زیادتی،میں ان سب سے نالاں ہوں۔اس لئے میں واقعتاً الیکشن سے دست برداری کا اعلان کر رہا ہوں۔آپ اس کو جس طرح چاہیں میڈیا پر لے آئیں،میں تیار ہوں۔''

''ہمیں تو سرکار کی مرضی مقدم ہے۔!''قدیر نے جواب دیا۔اور خادم حسین کی جانب دیکھا۔اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جب فیصلہ ہو ہی گیا تو پھر لیت ولعل کا ہے کا۔؟''

قدیر مسکرایا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ ہارون گیلانی ابھی تک ایک خاص کیفیت میں تھے۔ اور اس سے پہلے کہ یہ کیفیت ٹوٹ جائے، معاملات کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا ضروری تھا۔

قدیر نے نمبر پش کیے۔ چند ہی لمحوں میں احمد عبدالحئی سے رابطہ قائم ہو گیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد قدیر نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک بریکنگ نیوز دینا چاہتا ہوں۔''

''اچھا وہ کیا ہے۔؟'' احمد عبدالحئی نے پوچھا۔ ''کیا علی مراد اپنی دستبرداری سے پھر گیا۔؟''

''ارے نہیں۔۔۔!'' قدیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ذرا آپ ان سے بات کیجئے۔!'' قدیر نے فون عبداللہ شاہ گیلانی کو تھما دیا۔

ان دونوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد عبداللہ شاہ گیلانی نے فون خدا حافظ کہتے ہوئے قدیر کو پکڑایا۔

قدیر نے پوچھا۔ ''آپ مطمئن ہو گئے۔؟''

''یار یہ خادم حسین کیا قسمت لے کر آیا ہے۔ اس کے راستے تو ایسے صاف ہو رہے ہیں کہ گویا معجزات ہو رہے ہیں۔ کمال ہے بھئی۔!''

''یہ سب قادری سرکار کی دعا ہے۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو۔ اب تو مجھے بھی ان کے پاس حاضر ہونا پڑے گا۔!'' احمد عبدالحئی نے کہا۔ ہمیں پہلی مرتبہ احمد عبدالحئی کے لہجے میں عقیدت کا تاثر محسوس ہوا۔

''چند ہی منٹوں کے بعد بریکنگ نیوز دیکھ لینا۔ سمجھو کہ خادم حسین الیکشن جیت گیا۔!'' احمد عبدالحئی نے ہمیں اطلاع دی اور خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے مہمان خانے میں پڑا ہوا ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور نیوز چینل ٹیون کرنے لگا۔ نیوز چینل ٹیون ہوا تو ہم سب سکرین پر نظریں گاڑے بیٹھ گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد بریکنگ نیوز کی مخصوص موسیقی شروع ہو گئی اور چند لمحوں کے بعد نیوز کاسٹر نے کہنا شروع کر دیا۔ ''ضمنی انتخاب کے حوالے سے بریکنگ نیوز سب سے پہلے ہم پیش کر رہے ہیں۔ سب سے مضبوط اور باثر امیدوار عبداللہ شاہ گیلانی نے خادم حسین کے حق میں دست برداری کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک کے نوے فیصد افراد کی نمائندگی وہی لوگ کریں جو کہ نوے فیصد کا حقیقی حصہ ہیں تاکہ مسائل صحیح طور سے حل ہو سکیں۔ اس طرح الیکشن کے غیر حتمی اور غیر مصدقہ نتیجے کے تحت خادم حسین عملاً الیکشن جیت چکے ہیں۔ وہ بہت مضبوط امیدواروں کی دستبرداری کے باعث اس ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ منتخب ہو چکے ہیں۔ ناظرین ہم ایک بار پھر آپ کو بتا دیں کہ خادم حسین ضمنی الیکشن۔۔۔!''

اچانک سسکیوں کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ خادم حسین ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اور ان کے منہ سے بار بار ایک ہی لفظ نکل رہا

تھا۔بس اللہ میاں جی۔۔۔!بس اللہ میاں جی۔۔۔!''

نجانے اس کی ان سسکیوں،ان لفظوں میں کیا تھا کہ بے ساختہ ہم سب کے آنسو نکل آئے۔قدیر،خادم حسین،اور میں تینوں ملکر رونے لگے۔آنسوؤں کی برسات تھی کہ رک ہی نہیں رہی تھی۔اللہ میاں کے کرم نے ہمیں بارش کی طرح بھگو دیا تھا۔

بس اللہ میاں جی۔۔۔بس اللہ میاں جی۔۔۔!

اچانک دروازہ کھلا۔ہم نے چونک کر دیکھا۔قادری سرکار اندر داخل ہو رہے تھے۔ان کے ہونٹوں پر وہی پیار بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔جو ہمیں حوصلہ دیتی تھی۔''مبارک ہو میرے بچو۔۔!''انہوں نے کہا۔

خادم حسین لپک کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔''سرکار مبارکاں آپ کو۔سرکار سب مبارکاں آپ کو۔!''بس یہی تکرار تھی جو اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔پھر باری باری ہم دونوں کو گلے سے لگایا۔

''میرے بچو اللہ تمہیں ہر جگہ کامیاب فرمائے۔!''

اتنی دیر میں عبداللہ شاہ گیلانی کے اشارے پر مٹھائی آ گئی۔قادری سرکار نے ایک گلاب جامن اٹھا کر عبداللہ شاہ گیلانی کو کھلایا،پھر خادم حسین کو،پھر ہم کو ایک ایک گلاب جامن اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

''اچھا عبداللہ بیٹے اب ہمیں اجازت دو۔۔!''انہوں نے کہا۔

''سرکار رات کا کھانا کھا کے جائیں۔!''عبداللہ شاہ نے درخواست کی۔

''رات کا کھانا تو ہم خادم حسین کے گھر کھائیں گے۔ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے۔آپ بھی چلیں بیٹے۔!''قادری سرکار نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔

''بسر و چشم۔۔!''عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

ہم لوگ باہر آ گئے۔عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔سب سے پہلے قادری سرکار بیٹھے پھر ہم تینوں پیچھے بیٹھ گئے۔عبداللہ شاہ ڈرائیورنگ سیٹ پر آ بیٹھا۔قادری سرکار کے ڈرائیور نے گاڑی ہمارے پیچھے لگا لی۔ہمارا رخ خادم حسین کے گھر کی طرف تھا۔

راستے میں کئی لوگوں نے قادری سرکار کو پہچان لیا۔قادری سرکار کے نعرے لگنے لگے۔پھر کئی لوگوں نے گاڑی میں جھانکا تو انہیں خادم حسین اور میں نظر آیا۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر گاڑی کے آس پاس جمع ہو گیا۔اور نعرے لگنے لگے۔اچانک خادم حسین کے ساتھ ساتھ ایک اور نعرہ فضا میں گونجا۔''عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔عبداللہ شاہ گیلانی زندہ باد۔''ہمیں لوگوں کے چھوٹے بڑے ہجوموں سے گزر کر خادم حسین کے گھر تک پہنچنے میں اچھی خاصی دیر لگ گئی۔وہاں پہنچے تو سینکڑوں لوگ جمع تھے۔برق رفتار میڈیا نے خبر کو لمحوں میں دنیا بھر میں پہنچا دیا تھا۔

ہم لوگ گاڑی سے باہر نکلے تو لوگوں نے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔قادری سرکار کو،خادم حسین کو،مجھ کو اور عبداللہ شاہ گیلانی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔بالآخر غلام حسین،خادم حسین اور حافظ سلیمان صاحب کی بار بار کی التجاؤں سے ہجوم پر سکون

ہوا۔اور لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے مگر ہر شخص جانے سے پہلے قادری سرکار کے، پھر میرے اور پھر عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ ضرور چومتا تھا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔کشور اور تاج ور جلدی سے آئیں اور انہوں نے سب سے پہلے قادری سرکار کے پاؤں دھلائے۔انہیں چادر لگی گاؤ تکیے والی بڑی چارپائی پر بٹھایا۔جب ہم سب بیٹھ گئے۔تو قادری سرکار مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے۔

''تنزیل میاں۔۔۔!''

''جی سرکار۔۔۔!''میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''کچھ دیکھا، کچھ محسوس کیا آپ نے۔؟''۔انہوں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''سرکار بہتر جانتے ہیں۔!''میں نے جواب دیا۔

''یہ ترک کا صلہ ہے۔''انہوں نے فرمایا۔''جب ترک کو پا لیتے ہیں تو دلوں تک رسائی مل جاتی ہے۔اور دلوں میں اللہ رہتا ہے۔!''

سبحان اللہ۔۔سبحان اللہ۔۔۔!بے ساختہ کئی آوازیں گونجیں۔

مجھے لگا کہ جیسے کوئی چیز چٹاخ کر کے میرے اندر ٹوٹی ہو۔میں نے اپنے اندر جھانکا۔رغبتِ دنیا کا، کاسۂ سر ایک چھناکے سے ٹوٹ کے کرچی کرچی پڑا تھا۔

اچانک میرے دل سے ایک سیلاب پھوٹا، اور میرے بدن کو ڈبوتا ہوا آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

کسی نے پوچھا۔''کیا ہوا خلیفہ جی کو۔؟''

''خلیفہ جی، خلیفہ جی کے منصب پر فائز ہو رہے ہیں۔!''مجھے بہت دور سے آتی ہوئی غلام حسین کی آواز سنائی دی۔اور اس کے ساتھ ہی میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''میں واپس جا رہا ہوں۔۔۔!''عبداللہ شاہ گیلانی نے نازاں سے کہا۔

نازاں کچھ نہ بولی۔چپ چاپ عبداللہ شاہ گیلانی کو دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''کیوں رو رہی ہو؟''عبداللہ شاہ نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

''آپ بہت بدل گئے ہیں۔!''وہ دھیمے سے بولی۔''جو بھی ہوا مجھے صرف یہ بتایئے کہ اس میں میرا قصور کیا تھا۔؟''

''کیا ہوا۔؟''عبداللہ شاہ گیلانی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں انجان نہیں ہوں۔دکھی ہوں۔آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اختلافات یا ناراضگی جو بھی ہے، آپ کی پاپا سے ہے۔میرا کیا قصور

ہے۔؟ میں پہلے بھی انتظار کرتی رہی۔اب بھی انتظار کرتی رہونگی۔!'' وہ مرتعش لہجے میں بولی۔شدت جذبات سے اس کا بدن لرزنے لگا۔

''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔تم میری آرزو، میری زندگی ہو۔امریکا میں، ہر تنہائی میں صرف تمہارا خیال ہی تھا کہ جس نے مجھے تمہارے لئے وقف رکھا۔وہ سچ مچ تھی بھی بہت پیاری۔اس کی پیازی رنگت جو رونے اور شدتِ جذبات کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔ گلابی پیازی رنگت۔وہ بہت عزیز تھی، عبداللہ شاہ گیلانی کو۔

''پھر بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔؟'' نازاں نے دھیمے سے پوچھا۔

''ہاں میں ڈر گیا ہوں۔میرا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔''مجھے کاش پاپا کا بلیک بیری موبائل نہ ملتا۔کاش میں وہ آخری ریکارڈنگ نہ سنتا جو نجانے کس طرح محفوظ ہو گئی۔!''

''کیا تھا اس میں۔؟'' نازاں نے پوچھا۔

مگر عبداللہ شاہ گیلانی اپنی ہی دُھن میں بولتا رہا۔''ہمارے سوئٹزرلینڈ میں چھپن کروڑ ڈالر جمع ہیں۔اور وہ بھی کسی اور کے بنک میں نہیں، ہمارے اپنے بنک میں ہیں۔وہ بنک جو چچا جان نے قائم کیا ہے۔اور ان ہی پیسوں کے لئے میرے باپ کی جان گئی۔سچ ہے کہ دولت اور اقتدار کے سامنے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔وہ شخص جس نے مجھے پیار دیا۔اعتبار دیا۔جس کی ذات میرے لئے مثال تھی۔جن کی سیاست نے مجھے ہمیشہ ہی متاثر کیا۔میرے آئیڈیل میرے باپ نہیں، میرے چچا تھے۔مگر مجھے اس کا کیا صلا ملا۔؟ میں باپ سے محروم تو ہوا ہی تھا۔چچا سے بھی محروم ہو گیا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔''میں یہاں کیسے رہوں۔؟ میرا دم گھٹتا ہے۔!''

نازاں چپ رہی۔چند دن قبل اس نے سنا تھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی اور شاہ ہارون گیلانی کے درمیان کسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مگر وہ یہی سمجھی تھی کہ الیکشن کے حوالے سے کوئی بات ہو رہی ہے۔مگر یہ تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں نازاں۔؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔اور نازاں کی طرف دیکھا۔وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔وہ کہنے لگا۔''چچا جان میرا آئیڈیل ہیں۔وہ بت جس کو میں ہر حوالے سے پوجتا رہا۔میرا مان، میرا آدرش، میں اپنے اس آئیڈیل کے ساتھ نہیں رہ سکتا جو اب ٹوٹ گیا ہے۔بکھر گیا ہے۔!'' عبداللہ گیلانی کی آواز بھاری ہو گئی۔حلق تو نازاں کا بھی نمکین تھا۔

''مجھے جانے دو۔۔!''

''اور میں۔۔۔؟'' نازاں نے پوچھا۔

''تم پر کوئی جبر نہیں۔میں خود کو ترک کر رہا ہوں۔تمہیں تو نہیں کہہ رہا۔لیکن فیصلے کا اختیار تمہیں سونپ رہا ہوں۔''

''میرا فیصلہ، میرا حاصل تو آپ ہیں۔!'' وہ دھیمے سے، سر جھکا کے بولی۔''روپیہ پیسہ نہیں آپ کا ساتھ چاہیے۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی مسکرا دیا۔بہت دنوں کے بعد اسے لگا کہ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے بعد سورج کی پہلی کرن نکلی ہو۔محبت اور بھروسے کی۔

بعض لوگ محبت سے سب کچھ کما لیتے ہیں۔اور بعض لوگ بڑی محنت سے اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔انسان کے نفع ونقصان کا کیا کہنا۔وقت کی ہی گواہی ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔مگر وہ لوگ جو اپنے وقت کو قابل قدر جانتے ہیں۔اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے اعمال صالحہ بجالاتے ہیں۔وہی فلاح پانے والے ہیں۔مصیبتوں، دکھوں، پریشانیوں، ناامیدیوں اور ناخوشی میں اپنے رب سے امید قائم رکھتے ہیں۔خالق کے کنبے کی خیر وفلاح کے لئے مصروف عمل رہتے ہیں اور صرف اپنے رب سے مدد مانگتے ہیں۔اسی کی تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہیں۔اس کے بجز جو ہیں۔وہ خسارے میں ہیں۔ایسا خسارہ جس میں رتی برابر بہتری کی گنجائش نہیں ہوتی۔

''چلئے میں آپ کو چائے پلاؤں۔!'' نازاں اٹھی۔اس کے انداز میں بلا کا اعتماد، اور ٹھہراؤ تھا۔جب انسان کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو پھر جیسے سارے معاملات آسان ہو جاتے ہیں۔

وہ دونوں پائیں باغ سے اندر آ گئے۔مرکزی ڈرائنگ روم میں تنہا شاہ ہارون گیلانی بیٹھے ہوئے تھے۔کیوبن سگار ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔جس سے دھوئیں کی ایک باریک لکیر بل کھاتی ہوئی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ان کے چہرے پر سوچ کے گہرے دائرے پھیلے ہوئے تھے۔

پتا نہیں کیوں عبداللہ شاہ کو ان پر بہت ترس آیا۔وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔مگر وہ نجانے بے خودی کے کس عالم میں تھے کہ انہیں اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

ریاضے کمدار آیا اور خاموشی سے ان کے قریب کھڑا ہوا۔عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔''کیا بات ہے۔؟''

''جی وہ خادم حسین آیا ہے سلام کرنے۔۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔

آواز سن کر شاہ ہارون گیلانی نے نظر اٹھا کر اسکو دیکھا۔پھر عبداللہ شاہ گیلانی کی طرف دیکھا۔ان کی نگاہیں خالی خالی سی تھیں۔

''جاؤ بلا لو۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اجازت دے دی۔ریاضے کمدار نے سر کو خم دیا اور چلا گیا۔

چند ہی منٹوں کے بعد خادم حسین اندر آ گیا۔اس نے بڑے ادب سے اپنے جوتے قالین سے پرے اتارے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے شاہ ہارون گیلانی کے پاس آیا اور ان کے گھٹنے چھو کر انہیں سلام کیا۔پھر بڑے ادب سے پیچھے ہٹا۔اور عبداللہ شاہ کے گھٹنے چھونے لگا۔

''ارے یہ۔۔۔یہ کیا کر رہے ہو۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔''چلو اطمینان سے بیٹھو۔!''

خادم حسین وہیں قالین پر بیٹھ گیا۔

''خادم حسین اوپر بیٹھو۔۔!'' عبداللہ شاہ نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

''سرکار ہم اپنی جگہ پہچانتے ہیں۔دنیاوی رتبے سے آدمی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہے۔بڑائی تو ادب سے حاصل ہوتی ہے۔'' خادم حسین نے کہا اور نظریں جھکا کے خاموش ہو گیا۔

''خادم حسین میں واپس جا رہا ہوں۔!'' عبداللہ شاہ نے بتایا۔ ''امریکا۔۔۔!''

''اور یہاں۔۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔ ''یہاں کیا ہوگا۔؟ امریکا میں تو سب منظم ہے۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ وہاں جا کر کیا کریں گے آپ۔؟'' خادم کا لہجہ بہت سادہ تھا۔ مگر سوال نہایت ذہانت آمیز۔

''کیا کہا تم نے۔ ذرا پھر سے کہنا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''اتنی گہری بات۔؟''

''میں کیا جی میری اوقات کیا۔؟ کام کرنے کی ضرورت تو یہاں ہے۔ ہم لوگوں کو سیاست کا، ملکی اُمور کا کیا پتا۔ وہ تو جی آپ لوگ جانتے ہیں۔ ہم تو جی ندیاں، نالے ہیں۔ دریا رسمندر تو آپ ہو، اگر سوتا ہی خشک ہو جائے تو پھر ندی نالے کیا کریں گے جی۔ مٹی پر آنسو کی لکیر بن کر رہ جائیں گے۔!''

شاہ ہارون گیلانی اٹھے اور اس صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ جس کے پاس خادم حسین بیٹھا ہوا تھا۔ خادم حسین نے اپنا سر شاہ ہارون گیلانی کے گھٹنوں سے لگا دیا۔

''آپ ہی تو ہمارا پیار ہو۔!'' خادم حسین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''ہم آپ سے باغی نہیں۔ آپ کو احساس دلاتے ہیں جی کہ آپ جھک کر ہمیں تھام لو، قادری سرکار ہمارے مرشد کی تو ساری تعلیم ہی پیار و محبت ہے جی۔ محبت اگر خوف سے کی جائے تو وہ ریاکاری ہوتی ہے۔ اطاعت اگر اُمید سے کی جائے تو عبادت ہوتی ہے۔ اور اگر محبت اور اطاعت بغیر خوف، بغیر لالچ، بغیر طمع کے ہو تو جی وہ طاقت بن جاتی ہے۔ شاہ جی ہم تو آپ کی طاقت بننا چاہتے ہیں اور بس۔!''

''سچ کہتے ہیں سرکار کہ یہ ہماری تربیت ہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ ''ہم دنیا کے جس ملک میں بھی جائیں، جس قدر بھی پیسہ لے جائیں۔ رہتے تو ہم وہاں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ اور پھر جن لفظوں میں ان ممالک میں شہریت کے لئے حلف لیا جاتا ہے وہ کسی بھی آزاد وطن کے باسی کے لئے جو غیرت مند ہو، اس کے لئے مر جانے کا مقام ہوتا ہے۔''

''جی جو اپنی مٹی کی قدر نہیں کرتے دوسرے کی مٹی انہیں کیا عزیز رکھے گی۔؟'' خادم حسین نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''دیکھ لیں جی ہماری دنیا میں صرف مسلمان ہی دہشت گرد، قدامت پسند ہیں۔ حالانکہ ساری دنیا، پورا یورپ، امریکا بچیوں کو ضبط تولید کی تعلیم دے رہا ہے اور ہم کتنے بے فکرے ہوتے ہیں۔ ہمارے قدامت پسند معاشرے میں پورے سال میں خواتین کی بے حرمتی کے اتنے واقعات نہیں ہوتے ہیں جتنے ایک ماہ میں صرف امریکا میں ہوتے ہیں۔ پہلے یہ مسلمان اور جہاد کا نعرہ لگاتے ہیں، پھر جنت کا لالچ، ملوکیت کی برائی، موروثی بادشاہت کے خاتمے کے لئے دوسروں کو کافر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کمیونزم کا اثر توڑنے کے لئے مسلمان کے جذبے کو لادینیت سے حفاظت کے لئے استعمال کیا۔ اس کے بعد ان ہی لوگوں کو دہشت پسند بنا کر ڈرون حملوں میں مارنا شروع کیا۔ ہمارے ناعاقبت اندیش بچے اس کا شکار ہوتے چلے گئے۔''

خادم حسین کے پردے میں قادری سرکار کے لفظ بول رہے تھے۔ ''اگر آپ ہمیں، ہمارے نوجوانوں کو پیار دیتے، اعتبار دیتے،

اپنے ساتھ ملا لیتے تو بھوک کے باعث غیروں کے ہاتھوں وہ اس طرح استعمال نہ ہوتے۔!" خادم حسین کے لہجے میں دکھ تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا اور بولے۔ "مگر اب تم اکیلے نہیں ہو۔ ہمارے ہو۔ ہمارے گناہ تو شائد اتنے زیادہ ہیں کہ سرکار ہم سے ملنا بھی پسند نہ کریں۔ اور شائد عبداللہ بھی ہمیں معاف نہ کریں۔" شاہ ہارون گیلانی کی آواز بھاری ہوگئی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار۔۔۔؟" خادم حسین نے مچل کے ان پاؤں پکڑ لئے۔ "مرشد سرکار جی پیار کا سمندر ہیں۔ وہاں تو نرمی ہی نرمی گداز ہی گداز ہے۔ آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں۔ روشنی بھلا کہیں بھی اندھیرا رہنے دیتی ہے۔ محبت تو جی روشنی ہے۔ ہر شئے کو، ہر دل کو اجال دیتی ہے۔ اور آپ تو ہمارے بڑے ہیں۔ گستاخی اگر ہم سے ہوئی ہے تو سو مرتبہ معافی کی طلبی ہے۔!"

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے، ایک نم آلود مسکراہٹ، عبداللہ شاہ گیلانی اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اور ان کے ہاتھ تھام کے بولا۔ "چچا جان جو ہو جائے اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ بیتا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا۔ مگر ہم آنے والا وقت تو بدل سکتے ہیں۔ اپنی ہمت، اپنے حوصلے اور اپنی طاقت سے۔!"

وہ مسکرائے۔ "اور تم جو یہاں سے جا رہے ہو۔؟" انہوں نے پوچھا۔

خادم حسین نے کہا۔ "کہ امریکا میں کیا ہے۔ وہاں تو ہر شئے منظم ہے۔ اپنی اپنی جگہ، سسٹم میں لوگ آتے ہیں اور ڈیوٹیاں نبھاتے ہیں۔ جبکہ یہاں تو سب کچھ ہونا ہے۔ سسٹم بنانا ہے۔ کام تو سچ مچ سارے یہاں ہیں۔!"

"یہ اپنا خادم حسین بڑا سمجھ دار ہو گیا ہے۔!" شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ "بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔!"

"جی یہ تو قادری سرکار کا کرم ہے ان کی تربیت ہے۔ وہ جی بہت پیار کرتے ہیں سب سے، پتا نہیں ان کے پاس اتنا پیار کہاں سے آتا ہے۔ کڑوے سے کڑوا بندہ شہد کر دیتے ہیں۔!" خادم حسین کے لہجے میں مرجانیوالی عقیدت تھی۔

اسی وقت احمد اورنگ زیب اندر آیا۔ شاہ ہارون گیلانی نے اس کو دیکھ کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے کیا بات ہے۔؟"

"سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ ملک ریاض کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن کا فون آیا ہے کہ وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔!" شاہ ہارون گیلانی نے حیرت سے کہا۔ "سردار حیات اللہ نے ملک ریاض کی پارٹی جوائن کر لی۔؟"

اسی وقت شاہ ہارون گیلانی کا موبائل فون بج اٹھا۔ "ہیلو۔۔۔!" انہوں نے کہا۔

"فوراً دارلحکومت آؤ بہت ضروری میٹنگ ہے۔ سردار حیات اللہ نے پارٹی چھوڑ دی ہے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی پارٹی چھوڑ رہے ہیں اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔"

"لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔!" شاہ ہارون گیلانی نے کہا "اور۔۔۔!"

عین اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی کے فون پر بیل ہوئی۔ عبداللہ شاہ کے فون اسکرین پر جانا پہچانا نام جگمگا رہا تھا۔

''اسلام علیکم!۔۔'' دوسری طرف سے قادری سرکار کی پرسکون نرم آواز سنائی دی۔

''جی سرکار۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔شاہ ہارون گیلانی اپنی بات مکمل کرتے کرتے رُک گئے۔

قادری سرکار کہہ رہے تھے۔''توبہ اور سچی توبہ مقامات کو بلند کرتی ہے۔جو بندہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے۔خدا اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ان سے کہو کہ پارٹی نہ چھوڑیں۔اللہ بزرگ و برتر کے لئے دلی آرزوؤں کو پورا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔''

مارے حیرت کے فون شاہ ہارون گیلانی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆.....☆.....☆

http://kitaabghar.com

جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں؟

ہم لوگ خانقاہ میں حاضر تھے۔ قادری سرکار کا درس جاری تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ سراپا سماعت تھے۔

''محبت، تعلق، ایثار، قربانی یہ تمام رُخ، تمام جہتیں کسی ایک فرد کی ذات سے شروع ہوتی ہیں۔ فرد تنہا ہوتے ہوئے بھی تائیدِ ایزدی سے تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔ پھر قربانیاں دیتے دوستوں، ساتھیوں، اہل محبت کو جنہوں نے تحریک کے لئے اپنا تن، من، دھن قربان کر دیا، ان کو سراہنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کسی کو خطاب ملتا ہے۔ کسی کو اعتبار ملتا ہے۔ کسی کو اپنے ذاتی خاندان میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانیاں دینے والے صاحبِ تحریک کو کس حد تک پیارے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔ آپ نے اپنے دوستو کو جنہیں ہم صحابہ اجمینؓ کہتے ہیں۔ ان کو دیکھئے۔۔۔! آپ نے اپنے عزیز ترین صحابہ کرام کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار کے احترام کے لئے ان سے رشتے داریاں قائم فرمائیں۔ دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے دینا، رشتے لینا بھی ہوتا ہے۔ لیکن صاحبو۔۔!'' قادری سرکار نے اپنے مخاطبین کو دیکھا۔ سب ان ہی کی جانب متوجہ تھے۔ اپنے مرشد کریم کی طرف، جو انہیں ہمیشہ پیار کا درس دیتے تھے۔

''لیکن صاحبو۔۔! ہم کیا کرتے ہیں۔؟ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم ناراض ہوتے ہیں کہ ہمارے دوست نے جو ہمارے گھر آتا جاتا ہے۔ اس نے رشتے کی درخواست کرنے کی خواہش کیسے کی؟ حالانکہ ہم ہر چیز کی خریداری میں مضبوطی، پائیداری، تعلق کی شدت، اور نوعیت کو سامنے رکھتے ہیں۔ مگر دیکھے بھالے شخص کو محض اس لئے طلب گاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا دوست، ہمارا محلے دار تھا۔ جانتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے؟'' انہوں نے حاضرین کی جانب دیکھا جو بہت دھیان سے ان کا درس سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

''صاحبو۔۔! اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے تو محروم ہوتے ہی ہیں۔ نادانستگی میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ پھر ہماری بہن، ہماری بیٹی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہوتی رہتی ہیں۔ اور ہم مناسب رشتوں کی تگ و دو میں دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ دوسرا ایک اہم معاملہ یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں کہ پہلے اپنی بہن کی شادی کریں گے۔ پھر اپنی شادی کریں گے۔ اگر ہم اس چلن پر قائم رہتے ہیں اور صرف اسی شہر کے نوجوان یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم جب تک شادی نہیں کریں گے کہ جب تک ہماری بہن کی شادی نہیں ہوگی تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ تمام لڑکیاں بیٹھی رہ جائیں گی۔ ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ ہر بیوی کسی کی بہن ہے۔ اسلام نے اس کا بہت سادہ سا، فطری حل رکھا ہے۔ جو لڑکا یا لڑکی بالغ ہو جائے۔ مناسب ذریعہ روزگار میسر ہو تو اس کی شادی

کردی جائے۔اس سے نا صرف معاشرتی مسائل کم ہوجائیں گے۔ بلکہ جذباتی ہیجان کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بھی ختم ہوجائیں گی۔یادرکھئے۔۔!اسلامی احکامات ہمارے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔اے اللہ ہمیں ان احکامات، معاملات کی سمجھ عطا فرما۔سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی پیروی نصیب فرما۔!''

''آمین۔۔۔آمین۔۔۔سبحان اللہ۔۔۔'' کا ایک شور، مریدین، مداحین، عقیدت مندوں کی زبانوں سے بے ساختہ بلند ہوا۔ قادری سرکار خاموش ہوگئے تھے۔لوگ دھیرے دھیرے ان کے اردگرد جمع ہورہے تھے۔کچھ ان سے اپنے مسائل پر مشورہ چاہتے تھے۔ کچھ دینی مسائل پر ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھے۔ ہر شخص ان سے اپنی صوابدید کے مطابق، اپنے ظرف کے مطابق پیاس بجھا سکتا تھا۔

''چلو سرکار کو کارڈ دیں۔۔!'' قدیر نے مجھ سے کہا۔

''تم دیدو۔۔!'' میں نے کہا۔''مجھے شرم آتی ہے۔۔۔میں نے کون سی کوئی تصوف پر کتاب لکھی ہے۔!''

''محبت ہی تو اصل راستہ ہے تصوف تک جانے کا۔عشقِ مجازی ہی تو سیڑھی ہے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کی۔!'' قدیر نے مجھے سمجھایا۔میری کتاب ''سندیسے جو کھو گئے'' کی تقریب رونمائی قدیر نے آرٹس کونسل میں رکھی تھی۔جس میں اچھے خاصے ادیب آرہے تھے۔کئی کالم نگار مدعو تھے۔لیکن قدیر کا فیصلہ تھا کہ اس تقریب کی صدارت قادری سرکار کریں گے۔اس نے بغیر ان سے پوچھے ان کا نام کارڈ پر چھاپ دیا تھا۔اب پہلا کارڈ ان کو دینے آیا تھا۔

میں نے پوچھا۔''تم نے سرکار سے بغیر پوچھے ان کا نام چھاپ دیا ہے کارڈ پر، کہیں وہ ناراض نہ ہوجائیں۔!''

''نہیں وہ ناراض نہیں ہونگے۔۔۔!'' قدیر نے بڑے بھروسے، بڑی عقیدت سے کہا۔''وہ تو ہم سے پیار کرتے ہیں۔تم سے پیار کرتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور تشریف لائیں گے۔!''

''اچھا۔۔چلو۔!'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔کافی لوگ آجارہے تھے۔قادری سرکار کے درس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی آتی تھیں اور ان سے راہ نمائی لیتی تھیں۔درس کے بعد لوگ واپس جارہے تھے۔اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ہم لوگ اس بھیڑ میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔اچانک ایک خاتون قدیر سے ٹکرا گئیں۔خاتون کے ہاتھ سے لنگر شریف والا لفافہ نیچے گر گیا۔قدیر اور خاتون دونوں ہی بے اختیار لنگر شریف کا لفافہ اٹھانے کے لئے تیزی سے جھکے تو انکے سر آپس میں ٹکرا گئے۔

''اُف۔۔!'' خاتون کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ان کا نقاب سرک گیا۔

''آپ۔۔۔؟'' قدیر نے انہیں لنگر شریف کا لفافہ اٹھا کر دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔''آپ یہاں کیسے۔۔۔؟''

''میں۔۔۔میں وہ درس سننے کے لئے آئی تھی۔'' ان خاتون نے گھبراہٹ سے کہا۔وہ بیحد خوبصورت تھیں۔مجھے ان کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگے۔ان کی آواز بھی ان کے چہرہ کی طرح خوبصورت و نغمگی سے بھرپور تھی۔

نرمی تھی۔سردیوں کی صبح کی دھوپ جیسی، زندگی آمیز حرارت لئے۔

اتنی دیر میں خادم چائے لے آئے۔ وہی مخصوص خوشبو، جو اس خانقاہ کا خاصا تھی۔ ہم نے چائے پی۔ پھر قادری سرکار سے اجازت لیکر باہر نکل آئے۔

''دیکھا تم نے۔۔۔!'' قدیر نے کمرے سے باہر نکلتے ہی کہا۔''قادری سرکار نے ہماری دعوت قبول فرمالی۔ مجھے ان پر یقین تھا۔!''

میں نے قدیر کو غور سے دیکھا۔اس کا گندمی چہرہ یقین کی آگ سے دمک رہا تھا۔سادہ اور سچے لوگ اپنے معاملات میں کس قدر پر یقین ہوتے ہیں۔ان کا یقین ہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' قدیر نے چابی اگنیشن ہول میں گھمائی۔گاڑی کا انجن ایک جھرجھراہٹ لیکر بیدار ہوگیا۔

''کچھ نہیں۔۔!'' میں نے کہا۔''سوچنے کو رکھا کیا ہے۔؟''

''ہاں اب کیا سوچنا۔۔۔!'' قدیر ہنسا۔''خلیفہ کے منصب پر فائز ہوگئے۔قادری سرکار کی نگاہوں میں آگئے۔کتاب کے مصنف بن گئے۔گویا راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔۔!''

''یار مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔یوں لگتا ہے کہ جیسے خالی ہوں۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''خالی پن کو بھرنے کے لئے ہی تو دنیا کا سارا جھمیلا ہے۔۔!'' قدیر ہنسا۔

باتوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔گھر آگیا۔میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔''تم اندر نہیں آؤ گے کیا۔؟'' میں نے اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''یار یہ کارڈ اماں کو دیدینا۔!'' اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔''مجھے ذرا اور بھی کارڈ بانٹنے ہیں۔!''

''خود دو اماں کو کارڈ میاں پبلشر۔۔!'' میں نے کارڈ پکڑنے سے صاف انکار کردیا۔

''اچھا۔۔۔!'' وہ کارڈ لیکر باہر نکل آیا۔اس نے گاڑی لاک کی۔اتنی دیر میں، میں اطلاعی گھنٹی بجا چکا تھا۔دروازہ کھولنے والی مومی تھی۔

''اچھا ہوا آپ آگئے۔اتنی زور کی بھوک لگ رہی تھی کہ بس۔۔!'' وہ بلا تکان بولنا شروع ہوئی تھی کہ اس کی نظر میرے عقب میں کھڑے ہوئے قدیر پر پڑی وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔میں اور قدیر گھر میں داخل ہوئے۔اماں حسب معمول دالان میں تھیں۔اور اپنے وظیفے میں مشغول تھیں۔

''اسلام علیکم'' میں نے اور قدیر نے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام۔'' انہوں نے تسبیح ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔''چلو جلدی سے ہاتھ دھولو، مومی کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔اب

نرمی تھی۔سردیوں کی صبح کی دھوپ جیسی، زندگی آمیز حرارت لئے۔

اتنی دیر میں خادم چائے لے آئے۔ وہی مخصوص خوشبو، جو اس خانقاہ کا خاصا تھی۔ ہم نے چائے پی۔ پھر قادری سرکار سے اجازت لیکر باہر نکل آئے۔

''دیکھا تم نے۔۔۔!'' قدیر نے کمرے سے باہر نکلتے ہی کہا۔''قادری سرکار نے ہماری دعوت قبول فرمالی۔ مجھے ان پر یقین تھا۔!''

میں نے قدیر کو غور سے دیکھا۔اس کا گندمی چہرہ یقین کی آگ سے دمک رہا تھا۔سادہ اور سچے لوگ اپنے معاملات میں کس قدر پر یقین ہوتے ہیں۔ان کا یقین ہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' قدیر نے چابی اگنیشن ہول میں گھمائی۔گاڑی کا انجن ایک جھرجھراہٹ لیکر بیدار ہوگیا۔

''کچھ نہیں۔۔!'' میں نے کہا۔''سوچنے کو رکھا کیا ہے۔؟''

''ہاں اب کیا سوچنا۔۔۔!'' قدیر ہنسا۔''خلیفہ کے منصب پر فائز ہوگئے۔قادری سرکار کی نگاہوں میں آگئے۔کتاب کے مصنف بن گئے۔گویا راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔۔!''

''یار مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔یوں لگتا ہے کہ جیسے خالی ہوں۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''خالی پن کو بھرنے کے لئے ہی تو دنیا کا سارا جھمیلا ہے۔۔!'' قدیر ہنسا۔

باتوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔گھر آگیا۔میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔''تم اندر نہیں آؤ گے کیا۔؟'' میں نے اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''یار یہ کارڈ اماں کو دیدینا۔!'' اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھایا۔''مجھے ذرا اور بھی کارڈ بانٹنے ہیں۔!''

''خود دو اماں کو کارڈ میاں پبلشر۔۔!'' میں نے کارڈ پکڑنے سے صاف انکار کردیا۔

''اچھا۔۔۔!'' وہ کارڈ لیکر باہر نکل آیا۔اس نے گاڑی لاک کی۔اتنی دیر میں، میں اطلاعی گھنٹی بجا چکا تھا۔دروازہ کھولنے والی مومی تھی۔

''اچھا ہوا آپ آگئے۔اتنی زور کی بھوک لگ رہی تھی کہ بس۔۔!'' وہ بلا تکان بولنا شروع ہوئی تھی کہ اس کی نظر میرے عقب میں کھڑے ہوئے قدیر پر پڑی وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔اور دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔میں اور قدیر گھر میں داخل ہوئے۔اماں حسب معمول دالان میں تھیں۔اور اپنے وظیفے میں مشغول تھیں۔

''اسلام علیکم'' میں نے اور قدیر نے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام۔'' انہوں نے تسبیح ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔''چلو جلدی سے ہاتھ دھولو، مومی کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔اب

تک تمہارے انتظار میں دروازے کے پچاسیوں چکر لگا چکی ہے اور تم حسب معمول اپنا موبائل گھر پر چھوڑ گئے تھے۔'' اماں کے انداز میں پیار بھری ڈانٹ تھی۔

ہم لوگ ہاتھ دھو کر آئے تو کھانا چنا ہوا تھا۔ ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ہمیں خادم حسین کے گاؤں سے واپسی کو ابھی تیسرا دن تھا۔ مومی بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آتے ہی کتاب کی تقریب رونمائی کے کاموں میں لگ گئے۔ یوں گھر پر زیادہ وقت دینے کا موقع ہی نہ ملا۔

کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ پھر قدیر اماں کو کارڈ دے کر رخصت ہونے لگا۔

میں نے اس کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔ ''یار کارڈ خادم حسین، تاج ور اور کشور کو بھی بھیج دینا۔!''

''فکر نہ کرو عبداللہ شاہ گیلانی سمیت تمام لوگ ہی میری فہرست میں شامل ہیں۔۔!'' قدیر نے مجھے تسلی دی۔ اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

میں قدیر کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ باورچی خانے سے آتی ہوئی نرگس کی آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''دیکھا آج بھی انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں مخاطب نہیں کیا۔!'' میرا تجسس بڑھ گیا۔ کسی کی بات چھپ کر سننا معیوب ہونے کے باوجود میں وہیں کھڑا رہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کونسا ہم نے کبھی باتیں کی ہیں۔!'' مومی کی آواز سنائی دی۔ ''اماں اور بھائی ہی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں تو کبھی بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی کبھی نہیں کہیں گے۔ وہ اماں اور بھائی کے احترام میں کچھ نہیں بولیں گے۔ کچھ محبتیں مومی شمعوں کی طرح ہوتی ہیں، جو شب بھر جل کر ختم ہو جاتی ہیں۔''

دونوں چپ ہو گئیں۔ صرف برتنوں کے دھونے اور رکھنے کی آوازیں آتی رہیں۔ میں آہستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

''مومی کتنی بڑی ہو گئی۔ سمجھدار ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی کہ جذبے اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگے، اور سمجھ دار اتنی کہ اپنے جذبوں پر ضبط کی قدرت رکھے ہوئے ہے۔ میں اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ تب ہی جیسے اچانک میرے ذہن میں قادری سرکار کے درس کے جملے گونجنے لگے۔

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عزیز ترین صحابہ اجمعینؓ کی دلجوئی، ان کی محبت، ان کے پیار، احترام کے لئے ان سے رشتے داریاں قائم فرمائیں۔ دلی تعلق کا ایک مظہر رشتے لینا، رشتے دینا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں سے رشتہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ دیکھے بھالے شخص کو اس لئے طلبگاروں کی فہرست سے نکال دیتے ہیں کہ وہ ہمارا دوست، ہمارا محلے دار تھا۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اچھے، دیکھے بھالے رشتے سے محروم تو ہوتے ہی ہیں۔ نادانستگی میں دل آزاری کا سبب بھی بنتے ہیں۔''

میں ایک دم پسینے پسینے ہو گیا اور بیڈ سے اٹھ بیٹھا۔ قادری سرکار نے آج جو درس دیا تھا۔ شائد میرے لئے ہی تھا۔ تب ہی تو انہوں نے کہا تھا۔ ''کامل اثر پزیری کے لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ زبانی طور پر سراہنے کے بجائے عملی طور پر اس کو حقیقت بنایا جائے۔!''

میرے سامنے کی باتیں مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آتی ہیں۔ مجھے معلوم ہوجانا چاہیے کہ قادری سرکار براہ راست کچھ نہیں کہتے۔ دلجوئی کے لئے ہمیشہ تمثیل کی صورت میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں کتنا نااہل ہوں۔ احساسِ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی۔ ''تنزیل بیٹے۔۔!''

''جی اماں۔۔۔!'' میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اماں تسبیح پکڑے باہر کھڑی تھیں۔ میں ان کا ہاتھ تھام کے انہیں اندر لے آیا۔ وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ''کیا نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تمہارے کمرے کی بتی جلتی دیکھی تو ادھر آ گئی۔!''

''جی اماں نیند نہیں آ رہی تھی۔!'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم رو رہے تھے۔؟'' اماں نے مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔؟''

اماں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں ان کے گھٹنے سے سر ٹیک کے خوب رویا۔ وہ کچھ نہ بولیں۔ بس مجھے تسلی دیتی رہیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد میری طبیعت بحال ہوئی۔ میں نے انہیں آج کے درس کے بارے میں بتایا پھر میں نے کہا۔ ''اماں مومی کے لئے آپ نے کیا سوچا۔؟''

''دو ایک لوگوں نے کہا تو ہے رشتے کے لئے۔'' اماں نے کہا۔ ''وہ آئندہ اتوار کو آئیں گے۔ وہ تو پچھلی اتوار کو آنا چاہ رہے تھے۔ مگر تمہاری عدم موجودگی میں، میں نے انہیں نہیں بلایا۔''

''اماں۔۔!'' میں نے کہا۔ ''اتنے رشتے آ رہے ہیں۔ کیا قدیر کے گھر والوں نے آپ سے کبھی کچھ کہا۔؟''

''نہیں۔۔!'' اماں نے نفی میں جواب دیا۔

''اگر قدیر کا رشتہ آ جائے تو کیا بہتر نہیں رہے گا۔؟'' میں نے کہا۔ ''نئے رشتے میں اگر کوئی پسند بھی آ گیا تو اس کی دیکھ بھال، پوچھ پرتیت میں کتنا وقت لگے، پھر کسی کے کردار کا کیا بھروسہ، جو ظاہر ہوتا ہے بعض اوقات بہتر نہیں ہوتا۔!''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو بیٹا۔ لیکن جب تک کوئی خود سے نہ کہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔!'' اماں نے جواب دیا۔

یعنی اگر قدیر کے گھر والے آئیں تو آپ انہیں منع نہیں کریں گی۔؟'' میں نے پوچھا۔

''قدیر دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ اچھا کھاتا کماتا ہے۔ گھر والے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لئے اگر وہ رشتہ مانگیں گے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔!'' اماں نے جواب دیا۔ ''لیکن آج تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو۔؟''

''ایسے ہی۔۔۔!'' پتا نہیں کیوں میں ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اماں مسکرائیں اور مجھے ایک پیار بھری چپت رسید کر کے اٹھ گئیں۔ میں بے حد سرشار تھا۔ آج میں نے مومی کو وہ خوشی دیدی کہ جس کا اس کے گمان میں شائبہ بھی نہ ہوگا۔ میری اکلوتی نازوں پلی بہن، جس نے ہمیشہ ہمیں پیار دیا۔ مان دیا۔ آج میں نے اس کی محبت کو، اس کے اعتبار کو بچا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح میری آنکھ فون کی بیل ہی سے کھلی۔ ''اسلام علیکم!'' میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔

''کیا بات ہے ابھی تک سوئے جا رہے ہو معلوم نہیں کتنا کام ہے نواب صاحب۔!'' دوسری طرف سے قدیر کی آواز سنائی دی۔ ''سارے شہر کو کارڈ بانٹنے ہیں۔!''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو رہا ہوں۔ آ جاؤ مجھے لینے۔!'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں بڑی تیزی سے نہا کر تیار ہو کر چائے پی رہا تھا کہ قدیر کی کار کا ہارن سنائی دیا۔

''بھائی وہ قدیر آئے ہیں۔!'' مومی نے مجھے مطلع کیا۔

''اِدھر آؤ۔۔!'' میں نے اسے بلایا۔

''جی بھائی۔۔۔؟''

''بس ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارا بھائی تمہارے لئے ہر خوشی لائے گا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی۔!''

''جی ای ی۔۔!'' مومی کی حیرت دیدنی تھی۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟''

''جلدی سمجھ جاؤ گی۔۔!'' میں نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔ اور گھر سے باہر نکل آیا۔

قدیر مسلسل ہارن بجائے جا رہا تھا۔ ''بس بھی کرو۔!'' میں نے کہا۔ ''کیا بیٹری ڈاؤن کرو گے۔؟''

''یار دیر ہو رہی ہے۔ جمالی، غزالی آشفتہ سب ہی کو کارڈ دینے ہیں۔'' قدیر نے کہا۔ اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''ایک کارڈ اور چھاپ لو۔!'' میں نے کہا۔

''کون سا کارڈ۔!'' اس نے سی ڈی پلیئر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی شادی کا۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''کیا بک بک کر رہا ہے۔۔۔ پٹھے۔!'' قدیر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

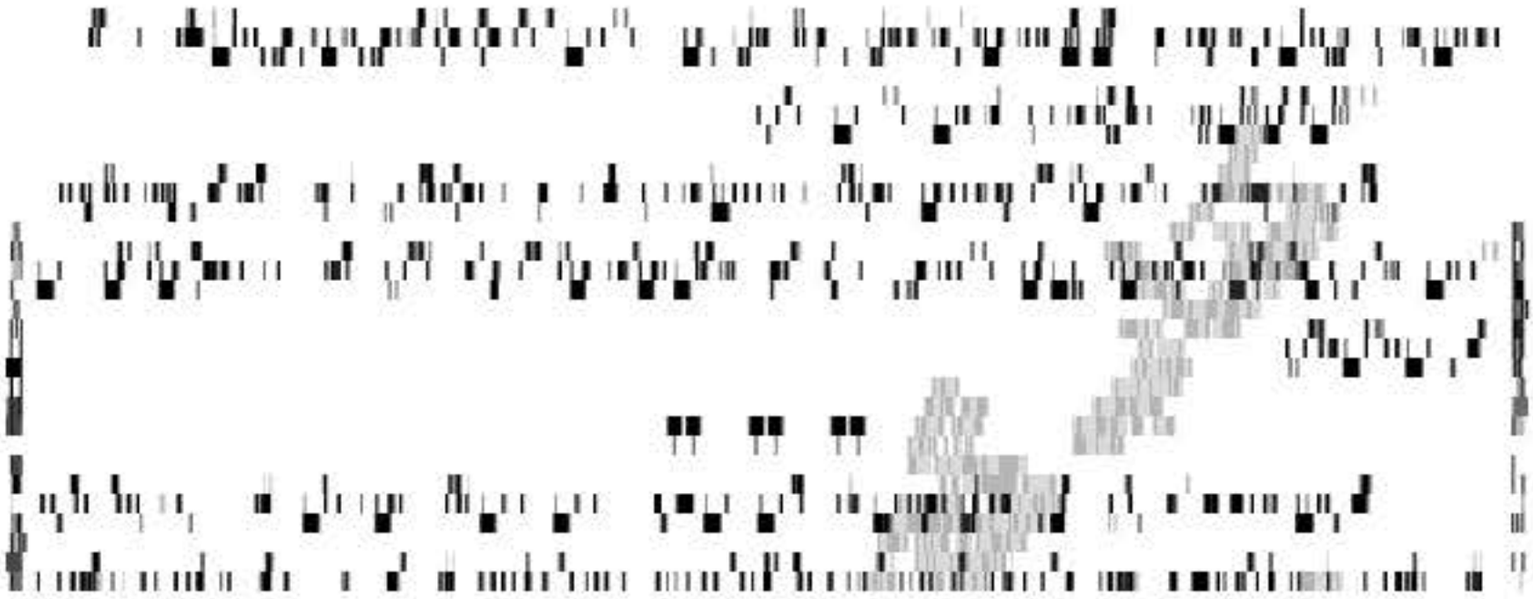
''حدِ ادب۔۔ بدتمیز۔۔۔ بدتہذیب۔۔ دنیا میں کسی ہونے والے بہنوئی نے اپنے مجوزہ سالے کے ساتھ ایسی ہرزہ سرائی نہیں فرمائی ہوگی۔!''

''کیا۔۔۔؟'' قدیر نے اس زور سے بریک لگائے کہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی۔ خود میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم۔۔؟''

''جو تم نے سنا۔۔۔!'' میں نے کہا۔ ''قادری سرکار کیا فرماتے ہیں۔ تعلق کو جب تک کوئی نام نہیں دیا جاتا وہ معلق ہی رہتا ہے۔!''

''تم۔۔تم۔۔!'' قدیر نے اچانک کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''بڑا کمینہ ہے۔ تو بڑا دھوکے باز ہے۔ سب کچھ جان کر بھی



چی پیدا ہوئی تی۔ عوام اور خواص دونوں ہی اس سے نالاں تھے۔ اس صوبائی اجلاس میں سردار حیات اللہ لونی بلایا گیا تھا۔ وہ پارٹی کا سب سے اہم فنانسر تھا۔

اجلاس شروع ہوا۔ چند رسمی تقریروں کے بعد پارٹی سربراہ نے کہا۔ ''اختلافات رائے کو ہمیشہ پارٹی میں اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن ناراضگی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ پارٹی چھوڑ دی جائے۔ کسی معاملے اور مسئلے میں خرابی اگر اس کی بدانتظامی یا کم فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کو ٹھنڈے دل سے سنبھالنا چاہیے۔ اگر آپ لوگوں نے پارٹی کو پیسہ دیا ہے۔ تعلقات استعمال کر کے اس کو لوگ دیئے ہیں۔ تو یہ نا بھولئے کہ پارٹی نے ہزاروں کی جگہ لاکھوں اور لاکھوں والوں کو کروڑوں کما کے بھی دیئے ہیں۔ اس لئے پرسکون رہنا بہت ضروری ہے۔'' پارٹی سربراہ نے کہا اور ان کی طرف دیکھا۔

ایک سینئر وزیر نے کہا۔ ''آپ کی تمام باتیں بجا، لیکن ہمیں افسوس وزیراعظم صاحب کی کج فہمی کا ہے۔ یہ معاملے کو بگاڑنے کے بعد سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس کو سنبھالتے سنبھالتے بالکل ہی ختم کر دیتے ہیں۔''

''تو پھر کیا کریں۔۔؟'' پارٹی سربراہ نے ان سے پوچھا۔ ''یہ وقت پارٹی بچانے کا ہے۔ عوام میں اپنی ساکھ بحال کرنے کا ہے۔ ہمیں مضبوط اور سخت فیصلے کرنے پڑیں گے۔ چاہے اس میں کوئی خوش ہو یا ناراض۔'' پارٹی سربراہ نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''آپ میری طرف سے آزاد ہیں کھل کے اپنی رائے دیجئے۔!''

''میرا خیال ہے۔۔!'' وزیر خزانہ نے کہا۔ ''ہمیں عوام کے سامنے اپنا پروگرام رکھنا چاہیے، اور ایک ایسی شخصیت کو سامنے لانا چاہیے جس کے اوپر لوگوں کو اعتماد ہو، جس کے متعلق لوگوں کو یقین ہو کہ وہ کچھ ہمارے لئے کر سکتا ہے۔''

''آپ لوگ تجویز کریں۔!'' پارٹی سربراہ نے کہا۔ ''یہ فیصلہ مشترکہ رائے کے بعد ہی کیا جائے گا۔!''

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم صحیح فیصلے کریں اور ان لوگوں کو آگے لائیں جو بغیر کسی لالچ کے پارٹی کے ساتھ ہیں اور جن کے متعلق یہ کہا جا سکے وہ قائد ایوان بننے کے بعد بھی کسی ممبر کی دھونس دھمکی میں آنے کے بجائے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلے کریں گے۔!'' پارٹی کے سینئر نائب صدر نے کہا، اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''میری نظر میں ایسی بااعتماد اور موزوں شخصیت شاہ ہارون گیلانی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔''

سینئر نائب صدر کے نام تجویز کرتے ہی سب بیک وقت بولنا شروع ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے سب ہی کچھ نہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔ چند منٹوں تک یہی صورت حال رہی۔ پھر پارٹی سربراہ نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا۔ ''اطمینان سے باری، باری اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔ اس طرح تو کسی کا بھی نکتہ نظر واضح نہیں ہوگا۔''

''بالکل ٹھیک۔۔!'' سینئر نائب صدر نے کہا۔ ''جو لوگ شاہ ہارون گیلانی کے نام پر متفق ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں تاکہ چند ہی منٹوں میں فیصلہ ہو جائے۔!''

اتنا سنتے ہی سب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر اچانک ہی سب بولنے لگے۔ ''ہارون۔۔ ہارون۔۔ ہارون۔۔ ہارون۔۔!''

شاہ ہارون گیلانی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پارٹی سربراہ نے بڑے غور سے ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر ان کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ شاہ ہارون گیلانی اس پر کوئی رائے دیں۔!'' پارٹی سربراہ نے کہا۔

اچانک جیسے خاموشی چھا گئی۔ تمام نگاہیں شاہ ہارون گیلانی پر مرتکز ہو گئیں۔ شاہ ہارون گیلانی نے اپنے اردگرد دیکھا۔ سب ان کو سننے کو بے قرار تھے۔ انہوں نے نہایت نپی تلی زبان میں کہنا شروع کیا۔ ''آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے گزشتہ پچیس برسوں میں کبھی کسی عہدے کا لالچ نہیں کیا۔ نہ کوئی وزارت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مالی معاملات سے آسودہ رکھا ہے۔ جو کچھ ہو سکا ہم نے پارٹی کے لئے، وطن کے لئے کیا اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ مگر آپ لوگ میری شخصیت کے پہلو جانتے ہیں۔ میں ضدی ہوں۔ کام کے معاملے میں بالکل کھرا ہوں۔ میرٹ کے علاوہ میں کوئی سفارش نہیں مانتا۔ نہ خود بدعنوانی کرتا ہوں، نہ کروں گا اور نہ ہی کسی کو کرنے دوں گا۔ اپنی پالیسی بناؤں گا اور اس پر عمل درآمد کرواؤں گا۔ اس معاملے میں کوئی کچھ کہے گا تو میں نہیں سنوں گا۔ اب دیجئے اپنی رائے۔۔!'' انہوں نے بڑے سکون سے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

ان کی باتیں سن کر لمحہ بھر کے لئے یوں لگا کہ جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بے پناہ خاموش تھے۔ پھر اچانک سینئر نائب صدر نے تالی بجائی۔ دو تین۔ چار۔۔ اور پھر سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ گویا وہ سب ہارون گیلانی سے متفق تھے۔ ان تالیوں کی گونج میں فیصلہ ہوا کہ شاہ ہارون گیلانی پارٹی کے آئندہ وزیراعظم کے طور پر عوام کے سامنے لائے جائیں گے۔ جس کی پارٹی سے وفاداری، ملک سے پیار کو کسی صورت بھی کسی اور سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی پارٹی میں وہ ہی ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنے

بھائی کو قربان کر دیا تھا۔ اور عوام ان کے والہ وشیدا تھے۔ پھر ضمنی انتخاب میں انہوں نے ایک پڑھے لکھے عام شخص کی حمایت کر کے اس کو عوامی نمائندہ بنوایا۔ اس سے وہ عوامی سطح پر بے حد محترم ہو گئے تھے۔ پارٹی جس مسٹر کلین کو سامنے لانا چاہ رہی تھی، وہ اس کو مل گیا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کی صورت میں۔

سب ہارون گیلانی کو مبارکباد دینے لگے۔ ان سے ہاتھ ملانے لگے، گلے ملنے لگے۔ سینئر نائب صدر نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پھر ان سے بڑی گرمجوشی سے گلے ملتے ہوئے ان کے کان میں بولا۔ ''ہارون صاحب اپنے اس خیر خواہ کو یاد رکھئے گا۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے بے پناہ حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ تھا۔ وہ پراسرار مددگار۔ جس نے ہر اہم موقع پر ان کی راہنمائی کی تھی۔ وہ مسکرا دیئے اور بولے ''شاہ ہارون گیلانی کے خون میں احسان فراموشی نہیں ہے۔!''

سینئر نائب صدر مسکرایا اور ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ پہلا آدمی تھا۔ جس نے مستقبل کے وزیر اعظم کو متاثر کر لیا تھا۔ سیاست میں غیر متوقع چال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بازی ہارنے کے بجائے جیت کر ایسی جگہ بٹھا دیتی ہے کہ جہاں سے کامیابی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اور جو اس چال کا ادراک نہیں کر پاتے وہ پھر ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، اور کامیابی ان سے یوں بھاگتی ہے جیسے چھوت کے مریض سے صحت مند لوگ۔۔!

دارالحکومت سے واپسی پر نجانے کیوں شاہ ہارون گیلانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جیت کے لالچ میں بہت کچھ گنوا بھی چکے ہیں۔ دل کے اندر کے احساسات بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ان کے اعداد سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ کبھی ضرب سے تقسیم ہو جاتے ہیں اور کبھی منفی میں سے مثبت ہو جاتے ہیں۔ دل کے اندر کے حساب میں صفر نہیں ہوتا۔ وہ، وجود کو صفر کر دیتے ہیں۔

وہ حویلی پہنچے تو ان سے پہلے ان کی خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ سب ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کوئی مٹھائی لئے کھڑا تھا، کوئی ہار پھول لئے منتظر تھا۔ ان کے استقبال کو سب ہی آئے۔ چھوٹے بڑے اپنے اور غیر۔ مگر عبداللہ شاہ گیلانی نہیں آیا۔

انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے، بڑے قیمتی لائٹر کے شعلے کو دیکھتے ہوئے بہت سرسری انداز میں پوچھا۔ ''عبداللہ کہاں ہے۔؟''

نازاں نے انہیں دیکھا۔ وہ اس کے بجائے لائٹر سے نکلتے ہوئے نیلے شعلے کو دیکھ رہے تھے۔

''وہ انیکسی میں ہیں۔!'' نازاں نے جواب دیا۔

''اگر وہ فارغ ہو تو مجھ سے مل لے۔!'' پہلی بار انہوں نے کسی کی طلبی میں جواز کو اہمیت دی، ورنہ وہ تو صرف غیر مشروط حکم دینا ہی جانتے تھے۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اگر ملنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی شرط ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں گے۔!''

''کیا بات منوانا چاہتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔ ''کچھ کہے گا تو ہی پتا چلے گا نا۔!''

''میں آپ دونوں کے درمیان نہیں آنا چاہتی۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ خود ہی مل بیٹھیں۔ مجھے تو کسی حقیقت کا، کسی معاملے کا علم ہی

نہیں۔!'' نازاں نے اطمینان سے جواب دیا۔

اسی وقت عبداللہ شاہ گیلانی اندر داخل ہوا۔ ''ہمیشہ بڑوں کا احترام ہی سیکھا، اس لئے خود آ گیا ہوں۔ میری شرط یہ ہے کہ آپ وہ چھپن کروڑ ڈالر واپس لائیں جو آپ کے غیر ملکی اثاثے ہیں۔ اس ملک کو پیسے کی ضرورت ہے۔ وہ پیسہ جس کو جمع کرنے کے لئے کوئی حساب کوئی کتاب نہیں رکھا گیا۔''

انہوں نے غور سے دیکھا۔ عبداللہ شاہ گیلانی انہیں اپنی بے حد چمک دار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ جیسے ان کے سامنے عبداللہ شاہ گیلانی نہیں، سکندر شاہ گیلانی کھڑے ہوں اور انہیں دیکھ رہے ہوں۔ ان سے حساب کرنے آ گئے ہوں۔ ان کی نگاہیں جھک گئیں۔

انہوں نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری بات مان لوں تو تم جاؤ گے تو نہیں۔؟''

''نہیں۔۔۔!'' عبداللہ شاہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے فون شاہ ہارون گیلانی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے۔؟'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اور فون تھام لیا۔

''کسی سے، کسی کی آخری گفتگو۔!'' اس نے سرسری انداز میں کہا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔

شاہ ہارون گیلانی صوفے پر یوں دھم سے بیٹھے کہ جیسے کسی نے ان کے گھٹنوں سے اچانک توانائی کھینچ لی ہو۔

قدرت بھی کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ کامیابی اور تنہائی ساتھ ساتھ چلاتی ہے۔ آج انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ انہیں شکست ہوئی ہے۔ وہ بھی ہر محاذ پر۔ گھر میں بھی، سیاست میں بھی۔ بظاہر وہ ہر جگہ کامیاب تھے۔ مگر صرف ملمع کاری سے، انہیں تو ایک بوریہ نشین نے شکست دی تھی۔ دو طرفہ مات، اپنی دعا اور تربیت دونوں سے۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔۔ ان کی بیگم اندر آئیں تو وہ اسی حال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبے پاؤں واپس چلی گئیں۔ وہ ان کے خیالات کے درمیان مخل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ شاہ ہارون گیلانی کو احساس تک نہ ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں۔

☆.....☆.....☆

میں نے اماں کو بتایا کہ قدیر کے گھر والے آج شام کو آ رہے ہیں۔

''کیا تم نے بات کی تھی۔؟'' اماں نے پوچھا۔ ''اس نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔؟''

''اماں۔۔۔!'' میں نے اماں کے پاس بیٹھ کر کے ان کے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں اس وقت رات کے کھانے بعد اماں کے کمرے میں تھا۔ مومی چائے دے گئی تھی۔ جب سے نرگس آئی تھی۔ وہ چائے دیکر تھوڑی ہی دیر میں چلی جاتی تھیں۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں خیال ہو، اگر دوستی اچھی ہو تو اس کو مضبوطی کے رشتے میں باندھنے کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ بقول آپ کے کہ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ جو پہلے ہی خواہش رکھتا ہو، اس سے اظہار مدعا میں کیا مانع۔؟''

میں نے مومی کی دلی آرزو، اماں کو نجانے کیوں بتانے سے گریز کیا۔ کچھ ننھے منے راز چھپانا اچھا لگتا ہے۔

''یہ خوشی کی بات ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''اللہ کے فضل سے یہ معاملہ خیر و عافیت سے طے ہو جائے تو پھر دوسرا معاملہ بھی طے کرتے ہیں۔!''

ان کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ میں ان سنی کر گیا۔

تھوڑی دیر میں اماں نے کہا۔ ''جاؤ بیٹا آرام کر لو۔ مسلسل کئی دنوں سے مصروف ہو۔ آج بھی سارا دن ہی کارڈ بانٹتے رہے۔ اللہ پاک میرے بچے کو بہت ساری کامیابیاں عطا کرے، نظر بد سے بچائے۔!'' انہوں نے دعا دی۔ اور مسکرا کے مجھے شب بخیر کہا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور رات کی مدھم روشنی کا نیلگوں بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

صبح ناشتے کے بعد اماں نے نرگس اور مومی سے کہا کہ ذرا گھر کی جھاڑ پونچھ کر لیں۔ اور شام کے کھانے کے لئے بھی کچھ اہتمام کر لیں۔ فرج میں مرغی، مچھلی، گوشت سب کچھ موجود ہے۔ پلاؤ اور کباب شامی بنا لینا۔ میٹھے میں شاہی ٹکڑے اور فیرنی بنا لینا۔ باقی جو تمہارا دل چاہے۔!''

''اب بھی کچھ بچا ہے۔؟'' مومی ہنسی۔ ''کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں کیا۔؟''

''مہمان تو مہمان ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کی رحمت کیا خاص کیا عام۔!'' اماں نے جواب دیا۔

''یعنی کہ آپ کا بتانے کا دل نہیں۔!'' مومی فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اماں ہنس دیں۔ نرگس مسکرائی۔

''اماں اگر کوئی پھل وغیرہ منگوانے ہو تو بتا دیجئے۔ میں لیتا آؤں گا۔ بلکہ میں شام کو جلد ہی آ جاؤں گا۔!'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ تو بہت اچھا ہو گا۔ تمہاری تقریب جمعے کو ہے نا۔!'' اماں نے میری بات سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ یوں ہلکی پھلکی گفتگو اور صبح ناشتے کی بعد کی محفل برخواست ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

شائد کچھ وقت، کچھ لمحات ہمیں بہت زیادہ خوشیاں دیتے ہیں، حالانکہ ساعتیں وہی ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے احساسات کا رخ بدل جاتا ہے۔ شام تو برسوں سے اس گھر میں آ رہی تھی۔ مگر آج اس شام کا حسن ہی کچھ اور تھا۔ اماں بہت ہشاش بشاش تھیں۔ مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں پھل وغیرہ لیتا ہوا ساڑھے تین بجے ہی گھر آ گیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے مومی سے ایک گرما گرم چائے کی فرمائش کی، تو تھوڑی دیر میں وہ چائے کے ساتھ ساتھ گرم گرم نمک پارے اور سموسے لے آئی۔ مجھے واقعی بھوک سی لگ رہی تھی۔ میں اماں کے کمرے میں ہی تھا۔ مومی چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں چائے پینے لگا۔ ساتھ ساتھ سموسے اور نمک پاروں سے شغل بھی جاری تھا۔ اچانک ایک بڑے سے پیکٹ پر میری نظر پڑی۔ یہ پیکٹ شائد میرے آنے سے پہلے آیا تھا۔ ورنہ میں نے صبح نہیں دیکھا تھا۔ ''اماں کیا کچھ منگوایا ہے آپ نے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''قادری سرکار نے بھیجا ہے۔!'' اماں نے بتایا۔

''اس میں کیا ہے۔؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ میں نے سوچا تمہارے سامنے ہی کھولوں گی۔!'' اماں نے کہا۔

''اچھا۔!'' میں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لیکر پیالی خالی کی۔ ٹشو سے چکنے ہاتھ صاف کئے اور پیکٹ کھولنے لگا۔ پیکٹ کے اندر مزید پیکٹ اور دو سفید لفافے تھے۔ میں نے لفافے اٹھائے ان پر لکھا تھا۔ ''مومی بیٹی کے لئے بہت پیار سے'' دوسرے پر لکھا تھا۔ ''قدیر بیٹے کے لئے بہت پیار سے۔'' تیسرے چھوٹے پیکٹ میں ایک بہت خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔ پانچ سوٹ تھے۔ دو مردانہ، دو زنانہ۔ پانچویں پہ لکھا تھا بھاگ بھری کے لئے۔ مجھے یاد آیا کہ بھاگ بھری قدیر کے ہاں کئی برسوں سے ملازمت کر رہی تھی۔ اسی طرح پانچ سوٹ دوسرے لفافے میں تھے۔ جن میں سے دو مردانہ اور تین زنانہ تھے۔ ایک لفافے پر لکھا تھا برائے دعوت۔ اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔ دوسرے پہ لکھا تھا برائے نرگس اور مومی اس میں دس ہزار روپے تھے۔ دوسرے دونوں سفید لفافوں میں گیارہ، گیارہ ہزار روپے تھے۔ قادری سرکار کے ان تحفوں میں سب کے لئے، دونوں گھروں کے ہر فرد کا خیال رکھا گیا تھا۔

''یہ تو منگنی کا سامان ہے۔!'' اماں نے کہا۔

''لیکن کیسے ہوا یہ۔۔!'' میں بے حد حیران تھا۔ ''قادری سرکار کی اتنی عنایات، اتنی محبتیں۔۔۔!''

''کیا وہ لوگ منگنی کریں گے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔۔۔!'' اماں نے کہا۔ ''مگر ان سب چیزوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قادری سرکار کے علم میں ہے کہ شائد وہ منگنی کی رسم ادا کرنا چاہیں گے۔!''

''یہ انگوٹھی تو یہی ظاہر کرتی ہے۔!'' میں نے کہا۔ ''اگر سرکار نہ بھیجتے، اور وہ اپنی انگوٹھی نکال لیتے تو پھر کیا ہوتا۔؟''

''اگر ایسا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ میرے پاس انگوٹھی رکھی ہے۔ وہ پہنا دیتی۔!'' اماں نے کہا۔ مجھے اماں پر بے حد پیار آیا۔ مائیں کتنے چپکے چپکے اپنے بچوں کے لئے نجانے کیا کیا تیاریاں کرتی رہتی ہیں۔ کتنے خواب الماری میں، اٹیچی میں، پاندان کی تھالی کے نیچے، بستر کے تکیے تلے، اور بچتوں کے ڈبے میں سینت سینت کے رکھے ہوتے ہیں۔

مگر اس وقت قادری سرکار نے جس طرح تحائف کی صورت میں ہمیں یاد رکھا، اس نے ہمیں خرید لیا تھا۔ وہ بہت اچھے بیوپاری ہیں۔ محبت کے سکوں، توجہ کے موتیوں اور پیار کے داموں پر ہر دل کو خریدنے پر قادر۔

اماں کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی تھی۔ نہ میں نے کچھ کہا۔ نہ اماں نے۔ بس ہم دونوں چپ رہے۔

مغرب کی اذان کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ قدیر اس کی امی، بہن اور ابو کھڑے تھے۔ پیچھے ان کی ملازمہ بھاگ بھری ہاتھوں میں ایک بڑا سا ٹوکرا لئے کھڑی ہوئی تھی۔ واضح طور پر وہ مٹھائی تھی۔

میں انہیں سلام کر کے اندر لایا۔ وہ سب اندر آ گئے۔ اماں نے اپنے تخت سے اٹھ کر استقبال کیا۔ وہ سب بڑی گرم جوشی سے مزاج پرسی کرتے ہوئے بڑے کمرے میں آ گئے۔

رسمی گفتگو کے بعد قدیر کی والدہ نے کہا۔ ''بہن ہم آج آپ سے ایک درخواست کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گی۔!'' انہوں نے ذرا رک کے کہا اور میاں کی طرف دیکھا۔

قدیر کے ابا ان کا مدعا سمجھ گئے۔ وہ بولے۔ ''بہن بات سیدھی اور مختصر سی یہ ہے کہ ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ دونوں گھروں کا رہن سہن، ملنا جلنا معلوم ہے۔ پھر قدیر اور تنزیل بچپن کے دوست ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دوستی کے رشتے کو مضبوطی دیں۔ اس لئے قدیر کے لئے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ بے وجہ رسمی تکلفات کا کیا فائدہ۔ ہماری طرف سے تو بسم اللہ ہے۔ آپ کی ہاں کے منتظر ہیں۔!'' قدیر کے ابا نے بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

اماں خاموش تھیں۔

قدیر کی بہن نے کہا۔ ''خالہ جان انکار نہ کیجئے گا۔ مومی تو میرے بچپن کی سہیلی ہے اور اتنی پیاری سہیلی مجھے بھابھی کے روپ میں مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ میری اچھی خالہ جان۔!'' نصرت نے بڑے لاڈ سے کہا اور اماں کے پاس آ بیٹھی۔

''یہ سارے معاملے تو طے ہوتے رہیں گے پہلے آپ لوگ کھانا وغیرہ تو کھا لیں۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔

''کھانا تو کھا لیں گے، مگر پہلے کوئی خوش خبری تو سن لیں۔۔!'' قدیر کی والدہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ کا ہی بچہ ہے دیکھا بھالا۔!''

''ہاں وہ تو ہے۔!'' اماں مسکرائیں۔ ''بچوں کی شادی کرنا تو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ بھلا میں اس سنت سے انکار کر کے گناہگار کیسے ہو سکتی ہوں۔؟'' اماں نے بہت خوبصورتی سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

''تو پھر منہ میٹھا کیجئے۔!'' قدیر کی امی نے برجستہ کہا۔ اور اپنے ہمراہ لائی ہوئی مٹھائی کا ٹوکرا کھول کے اس میں سے ایک لڈو نکالا اور اماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔

اماں نے لڈو تھام لیا اور پہلے ان کو کھلایا، پھر خود کھایا، پھر اچانک ہی جیسے نصرت بولی۔ ''ارے یہ ہم خود ہی لڈو کھا رہے ہیں ذرا بھلا میں اپنی ہونے والی بھابھی کو تو لے آؤں۔'' نصرت اٹھی اور باہر نکل گئی۔

قدیر کے والد نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈبی نکالی، میز پر رکھی اور بولے۔ ''بہن بلاوجہ کی رسموں پر پیسہ ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ میں آپ کی اجازت سے بیٹی کی انگلی میں انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔ شادی کی تاریخ دے دیجئے۔ جہیز کی مجھے ضرورت نہیں۔ سلیقہ، ادب اور گھر داری کے قرینے سے بڑا جہیز کوئی نہیں ہوتا۔ جب آپ حکم کریں گی بارات لے کر حاضر ہو جائیں گے۔''

اماں نے میری طرف دیکھا میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر بعد نصرت اور نرگس مومی کو لئے اندر داخل ہو گئیں۔

شرم سے مومی دوھری ہوئی جارہی تھی۔اس کے چہرے پر شرم، حیااور مسرت کا بے حد خوبصورت امتزاج تھا۔اسے لاکر بڑے صوفے پر بٹھا دیا۔قدیر کے والدین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ان کی بیگم نے ایک زری کا دوپٹہ مومی کے سر پر ڈالا۔انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔

میں نے قدیر کو بازو سے تھاما اور لاکر مومی کے ساتھ بٹھا دیا۔

امی نے قدیر کو انگوٹھی پہنائی، اور ایک لفافہ قدیر کی گود میں رکھا۔اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کو دعائیں دیں۔

میں نے دیکھا کہ قدیر کے روئیں روئیں سے مسرت کی روشنی نکل رہی ہے۔ایسی ہی روشنی مومی کے بدن سے نکل رہی تھی۔میں نے سر جھٹک کے دیکھا۔مگر روشنی بدستور نکل رہی تھی۔''کیا خوشیاں رنگ کی صورت ہوتی ہیں۔۔؟ کیا خوشیاں سب کو دکھائی دیتی ہیں۔۔؟''

''نہیں تنزیل میاں۔۔!'' مجھے ایک جانی پہچانی نرم آواز سنائی دی۔''خوشیاں محسوس تو سب کو ہوسکتی ہیں۔مگر ان کا ادراک اور ان کی روشنی صرف آنکھوں والوں کو ہی دکھائی دیتی ہے۔جب اندر کی آنکھ کھل جاتی ہے تب۔!'' قادری سرکار کی وضاحت کے ساتھ ہی جیسے اچانک سب کچھ بدل گیا۔اور روشنیاں غائب ہوگئیں۔

''تنزیل بیٹے مبارک ہو آپ کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی۔!'' قدیر کے والد میرے پاس کھڑے کہہ رہے تھے۔میں اٹھا اور ان سے گلے ملا۔پھر قدیر سے گلے ملا۔اور اسے مبارکباد دی۔اس نے گلے لگتے ہوئے آہستہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔''شکریہ یار۔!''

میں ہنس دیا۔

مومی چند منٹ بیٹھی رہی۔پھر اماں کے اشارے پر نرگس اور نصرت اسے اندر لے گئیں۔اماں بھی اٹھ کر کھانے کا انتظام دیکھنے چلی گئیں۔قدیر کی والدہ بھی تھوڑی دیر بیٹھی رہیں پھر وہ بھی اندر چلی گئیں۔گھر میں سب بول رہے تھے۔ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔جو مجھے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

قدیر نے کہا۔''کل تقریب ہے، کافی لوگ آرہے ہیں۔تمہیں بھی کچھ کہنا پڑے گا۔!''

قدیر کے ابا نے کہا۔''یہ پہلی کتاب ہے جو اس نے ایسی چھاپی ہے کہ بک رہی ہے۔ورنہ ہمیشہ اس کو نقصان ہی ہوا۔اس لئے میں سخت خلاف ہوں ایسی کتابوں کے۔!''

''ابا اللہ کا شکر ہے کہ پریس کی کوئی مشین کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی۔پھر یہ شوق تو علم وادب کے لئے صدقۂ جاریہ ہے۔بڑے بڑے معروف لوگ اتنی سکت نہیں رکھتے کہ کتاب چھپوا سکیں، نام بڑا اور درشن چھوٹے۔اگر ان کی کتاب چھپ جائے تو کیا مضائقہ۔'' قدیر نے کہا''علم وحرف پھیلانے والوں میں ہمارا نام تو لکھا گیا۔!''

قدیر کے ابا ہنس دیئے۔''جیسے تمہاری مرضی۔!''

اسی وقت قدیر کے موبائل پر بیل ہوئی۔قدیر نے فون کی طرف دیکھا اور بولا''ارے سرکار کا فون ہے۔!''

''اسلام علیکم۔!'' دوسری طرف سے قادری سرکار کی نرم آواز آئی۔''کہاں ہیں آپ۔؟''

''جی سرکار یہاں تنزیل کے گھر ہوں۔!''

''اچھا بھئی بہت بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو خوش وآباد رکھے۔!'' انہوں نے دعا دی۔

''سرکار یہ سب آپ کی دعاؤں کے طفیل ہے۔!'' قدیر نے عاجزی سے کہا۔

''اچھا یہ بتایئے کہ آپ کی تقریب کا مہمانِ خصوصی کون ہے۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

جواباً قدیر نے دو تین نام لئے مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ ان میں سے کسی نے ابھی تک باقاعدہ حامی نہیں بھری ہے۔

قادری سرکار نے فرمایا۔''عبداللہ شاہ گیلانی کا فون آیا تھا۔آپ کے کارڈز ان تک پہنچ گئے ہیں۔وہ چاہتا ہے کہ اگر کوئی مہمان خصوصی نامزد نہیں کیا ہے تو وہ شاہ ہارون گیلانی کو لانا چاہتا ہے۔اگر آپ لوگ چاہیں تو۔!''

''بالکل ٹھیک جیسا سرکار کا حکم۔!'' قدیر نے فوراً جواب دیا۔

''یہ حکم نہیں بلکہ آپ لوگوں کی صوابدید پر منحصر ہے!'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''سرکار کی زبان سے اظہار ہونا بھی ہمارے لئے حکم ہے۔!'' قدیر نے کہا۔

''تاج ور، کشور، غلام حسین، خادم حسین، حافظ سلمان، حنیف صحرائی وغیرہ بہت سے لوگ بھی آرہے ہیں۔ان کے خلیفہ جی کی کتاب کی تقریب رونمائی جو ہے۔''سندیسے جو کھو گئے'' مگر لوگوں کو مل گئے۔!'' انہوں نے نہایت معنی خیز بات کی اور سلام کے بعد فون بند کر دیا۔

''تنزیل یار تو تو گیا شوں۔!'' قدیر نے گرمجوشی سے ہاتھوں کا تیر بنا کے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔''جس تقریب میں قادری سرکار، شاہ ہارون گیلانی جیسے لوگ آرہے ہوں، جن کی پیشگوئی سے ایک عالم واقف ہے تو اس تقریب کی کوریج کے لئے میڈیا ٹوٹ پڑے گا۔ہر چینل چاہے گا کہ مستقبل کے وزیراعظم کی زیادہ سے زیادہ کوریج کرے اور ابھی سے بہتر تعلقات بنائے۔!''

''اللہ مالک ہے!'' میں نے جواب دیا۔مجھے خوشی ہوئی۔لیکن نجانے کیوں ایسا لگا کہ جیسے خوشی مجھے بے قابو کرنے کے بجائے میرے اندر جذب ہو گئی ہو۔

اسی وقت نرگس نے آکر کہا۔''کھانا تیار ہے تمام لوگ آجائیں۔!''

کھانے کی ٹیبل پر سب اکٹھا ہو گئے۔بہت اچھا لگ رہا تھا۔مومی نہیں تھی۔اس کو شرم آرہی تھی۔بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔نرگس ہر معاملے میں پیش پیش رہی۔کھانے کے بعد اماں نے سب کو تحائف دیئے۔سب سے زیادہ خوشی بھاگ بھری کو ہوئی۔اس نے بے شمار دعائیں دیں۔تھوڑی دیر میں سب رخصت ہو گئے۔جاتے جاتے قدیر کے والد کہہ گئے کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ نصرت کے ساتھ ساتھ ہی قدیر کی شادی بھی رکھ لیں تاکہ ایک بیٹی جائے تو دوسری آئے۔اماں نے کہا کہ نصرت کی تاریخ جب پکی کر لیں تو انہیں بتا دیں۔اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

ان کے جانے کے بعد جب اماں کمرے میں آئیں تو مومی وہیں موجود تھی۔ اماں نے اسے گلے سے لگالیا۔ مومی اماں کے گلے لگتے ہی رونے لگی۔ اماں خود بھی روتی رہیں۔ وہ بھی روتی رہی۔ نرگس تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی پھر چلی گئی۔

میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں اس وقت ان کے درمیان کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں کا اپنا ایک علیحدہ رشتہ، علیحدہ زبان ہوتی ہے۔ ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ گرم نمکین پانی کے یہ قطرے بڑے دیالو ہوتے ہیں۔ کبھی اندر کی کثافت باہر نکالتے ہیں۔ کبھی خوشی کی بجلیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، کبھی کوئی مٹھاس دے جاتے ہیں۔ کبھی شکوے کا عنوان بن جاتے ہیں۔ کبھی تسلی، کبھی مرہم، کبھی پھاہا بن جاتے ہیں۔ گرم نمکین پانی کے قطرے بڑے دیالو ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہی سنبھل گئیں۔ اور خود ہی ہنسنے لگیں۔ اتنی دیر میں نرگس چائے لے آئی۔

''اس وقت واقعی بڑی طلب ہو رہی تھی۔'' میں نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

''جو پوری ہو جائے وہ طلب کہاں؟'' نرگس نے آہستہ سے کہا۔ کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا۔

☆.....☆.....☆

تقریب رونمائی میں بہت سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ قدیر کے کس قدر ملنے والے ہیں۔ اخبار نویس، کالم نویس، مصنف، ڈرامہ رائٹر، شاعر، نقاد، سول سوسائٹی کے نمایاں افراد، میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا۔ ان سب میں تجسس تھا ملنے کا، ''سندیسے جو کھو گئے'' کے مصنف سے۔ پھر اچانک شور ہوا، معلوم ہوا شاہ ہارون گیلانی آ گئے ہیں۔ تقریباً تمام مہمان آ چکے تھے۔ انتظار تھا تو صرف قادری سرکار، وہ اس تقریب کے صدر تھے۔ پھر اچانک لوگ کھڑے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرگوشیوں میں پھیل گیا۔ قادری سرکار آ گئے۔ کسی نے نہیں کہا، مگر جو لوگ انہیں جانتے تھے وہ کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ چند لمحوں میں پورا ہال کھڑا ہو کے انہیں تعظیم دے رہا تھا۔ سچ ہے جو اللہ کے حضور جھک جائے۔ زمانہ اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

قادری سرکار کے کرسی صدارت سنبھالتے ہی قرآنِ مجید کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں چند مقررین نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ پھر ہارون شاہ گیلانی نے اپنے مختصر خطاب میں کہا۔ ''ہمارے نوجوانوں میں بہت توانائی ہے۔ اگر اس توانائی کو ملک کی ترقی اور تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے زندگی ہی نہیں ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمیں ایسے سوچنے والے، پیار کرنے والے، ایثار کرنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ جو قلم کے ذریعے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جہاں امن محبت اور پیار ہو۔ مجھے یقین ہے کہ قادری سرکار کے شاگرد، ان کے خلیفہ، ان کی خانقاہ سے منسلک نوجوان ایک ایسا فکری انقلاب لائیں گے، جو اس معاشرے کو بدل دے گا۔ میں تنزیل میاں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کے موضوع پر لکھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔!'' تالیوں کی گونج میں ان کا خطاب ختم ہوا۔

اس کے بعد میزبان نے مجھے ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ میں نے اجازت طلب نگاہوں سے قادری سرکار کی طرف

دیکھا۔انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔

میں نے ڈائس پر آ کر سامنے دیکھا۔پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔میں نے کہا۔''میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ اس تعفن زدہ معاشرے میں، جہاں قتل، اغوا، ڈکیتی، اور دیگر جرائم روز کا معمول بنتے جا رہے ہوں، وہاں محبت کی پذیرائی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اندر سے امن، محبت پیار اور ایثار کے لئے نا صرف تیار ہیں، بلکہ اس کو سراہنے میں کسی قسم کے بخل سے بھی کام نہیں لیتے۔یہ کتاب کی یا میری کامیابی نہیں یہ آپ کی محبت سے تعلق کی کامیابی ہے۔قادری سرکار نے فرمایا۔''سندیے جو کھو گئے، مگر لوگوں کو مل گئے''میں آپ کے خلوص کا جواب نہیں دے سکتا۔یہ صرف قرض کی صورت مجھ پر واجب رہے گا۔اور یہی قرض مجھے محبت کے لئے اکساتا رہے گا۔اللہ محبت ہے، وہ محبت دلوں میں ڈالتا ہے۔میں آپ سے، آپ مجھ سے ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔بس اسی احساس کو محسوس کرنے اور اس کی تفہیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔مجھے اجازت دیجئے۔''میں نے سر جھکا کے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

جب میں اپنی نشست پر آ کے بیٹھا تو قادری سرکار نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔اور مسکرا دیئے۔اس کے بعد قادری سرکار نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا۔

''آپ سب اہل علم، حرف کی دنیا کے شناور ہیں۔میں تو بس ایک طالب علم ہوں، ایک فقیر ہوں۔جس نے دنیا کو صرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔یہ دنیا بُری سہی، لیکن بنائی تو آپ کے اور میرے خالق نے ہے۔اور بنی تو میرے اور آپ کے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔پھر ہم اس کی برائی سے، اس کے خبث سے، نفرت کے بجائے محبت سے کیوں نا بہتر کرنے کی کوشش کریں۔محبت تو ترک ہے۔ ایثار ہے۔اعتبار ہے۔جو محبت کو جان گیا، محبت کو سمجھ گیا اس نے اس دنیا کو، کائنات کو فتح کر لیا۔ہم سب محبت چاہتے ہیں، ہمیں اپنا آپ سراہا جانا اچھا لگتا ہے، مگر ہمیں دوسروں کو بھی محبت دینی چاہیے، دوسروں کو بھی سراہنا چاہیے۔محبت کا جواب فقط محبت کے سوا کچھ نہیں۔میں عزیزی تنزیل کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے محبت کو سمجھا، اور محبت کے دوسرے رخ ایثار کو اپنا لیا۔ترک کو سمجھ لیا، اس سمجھنے میں ہی برکتیں ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے میں محبت اور ایثار کی اس فضا کو قائم رکھے اور قدیر میاں جیسے علم دوستو کو عزم و حوصلہ عطا فرمائے۔جو ایسی کتابوں کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں کہ جس سے محبتوں کا سفر آگے بڑھ سکے۔اور معاشرہ بھرپور صحت مند سرگرمیوں میں پنپ سکے۔''

انہوں نے تقریب کے منتظمین کو کامیاب تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دیکر اپنا خطاب ختم کر دیا۔

تقریب کے اختتام پر اسٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو لوگ کتاب خرید کر مصنف کے دستخط لینا چاہتے ہوں، وہ کتاب خرید کر کے مصنف کے دستخط لے سکتے ہیں۔ان کے اس اعلان کے بعد کئی لوگوں کا رخ ایک طرف بنے خوبصورت سے اسٹال کی جانب ہو گیا۔جہاں کتاب کا ایک بڑا سا ٹائٹل بنا ہوا تھا۔اس کے ساتھ ہی میز پر کافی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

قادری سرکار اور ہارون گیلانی فوراً ہی چلے گئے۔میں لوگوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ ان کو باقاعدہ خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔تاج ور اور کشور دونوں نے کتاب خریدی۔مجھ سے اس پر دستخط لئے۔تاج ور نے بہت خلوص سے مبارک باد دی۔بولی''ہم اپنے خلیفہ جی کا یہ

روپ تو جانتے ہی نہیں تھے۔"

قدیر نے برجستہ کہا۔"سرکار کے ہیرے ہزار پہلو تراشے ہوتے ہیں ہر رخ خیرہ کرنے والا ہوتا ہے۔!"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔!" تاج ور مسکرائی۔"آپ کو منگنی مبارک ہو۔!"

"شکریہ۔" قدیر نے کہا۔"چلیں اب چائے پی لیں۔!" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔ جہاں چائے کا اہتمام تھا۔

لوگ ملتے رہے، تبصرے کرتے رہے۔ سب بہت خواب آور تھا۔ بہت دل کش، مگر نجانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سب میرے لئے ہونے کے باوجود میرا نہیں۔ کیا خوشیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی شدتوں کے بغیر ہوں۔ خوشی میں شدت بیقراری نہ ہو تو وہ چنگاری کے طرح اپنے ہی خول میں بجھ جاتی ہے۔

تقریب ختم ہوگئی۔ قدیر بہت خوش تھا۔ یہ اس کی پہلی تقریب تھی جو اس کو بحیثیت پبلشر متعارف کروا گئی۔ کئی نامور ادیبوں نے اس سے اپنی کتاب چھپوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے تعلقات کی انتہاؤں کو سب نے دیکھا تھا۔ سیاست اور مذہب دونوں ہی جگہ اس کے تعلقات مثالی تھے۔ کامیابی کے لئے بس ایک دھکے کے ہی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو وہ دھکا مل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔

☆.....☆.....☆

حسبِ معمول خانقاہ میں ہجوم عشاق جمع تھا، اور قادری سرکار اپنے مخصوص تخت پر دھیمے لہجے میں اپنا درس دے رہے تھے۔

"نعمتیں سب کے لئے یکساں تقسیم ہوتی ہیں۔ زمین اپنا سینہ فراغ کرتی ہے تو اناج ملتا ہے۔ ثمر ملتے ہیں۔ سمندر، دریا اپنا دامن کھولتے ہیں تو وہاں بھی انسان کی پذیرائی کے لئے انواع واقسام غذائیں ہیں۔ موتی ہیں مونگے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھو تو ستارے ہیں۔ چاندنی ہے۔ طیور ہیں۔ ابر باراں ہے۔ سورج کی دل کش حرارت ہے۔ غرض ہر جا تیری قدرت کا نظارہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اللہ پاک ان نعمتوں کی تقسیم میں رنگ، نسل، مذہب، خطے کی تخصیص نہیں رکھتا۔ سب کو ان کی ضروریات کے مطابق نعمتیں ملتی ہیں۔ مگر برا ہو حرص کا، ہوس کا، ہم ان نعمتوں کو ذخیرہ کرتے ہیں۔ پابندیاں لگاتے ہیں۔ کہیں یہ عالم کہ مارے افراط کے ضائع کرنا پڑے، اور کہیں یہ معاملہ کہ ایک مٹھی اناج کے لئے عصمتیں بیچی جائیں، بچے فروخت کئے جائیں۔ کیا یہ اس ذات پاک کا مقصود ومنشاء تھا؟"

انہوں نے ذرا ٹھہر کے اپنے مخاطبین کی جانب دیکھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔۔!" ایک معمولی وقفے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

"قادرِ مطلق ہر نعمت کو شمار رکھتا ہے۔ اور جو اس کا شمار بگاڑتے ہیں۔ ان معاشروں پر، ان خطوں پر، ان ممالک پر عذاب الٰہی مسلط ہونے لگتا ہے۔ کبھی زلزلے، کبھی بارشیں، کبھی قحط کبھی بیماریاں۔ غرض وقفے وقفے سے آفتیں اس خطے کا رخ کر لیتی ہیں۔ معاشرہ عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم صرف اپنی جیب بھرنے لگتے ہیں۔ خیر وفلاح کے معالات زیادہ سے زیادہ امداد اکھٹی کرنے سے مشروط ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سب ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو رہے ہیں جہاں بندگان خدا کی مجبوریوں کو، بے بسی کو، پامالی کو، مالِ تجارت

کی طرح بیچا جارہا ہے۔ ایسا معاشرہ فلاح و خیر سے خالی ہوجاتا ہے۔ یااللہ۔۔۔ہمارے دلوں کی درستگی فرما۔۔۔ہماری اصلاح فرما۔۔۔!"

حسب معمول پتا نہیں کیسے ان کا درس آخر میں دُعا کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

"اے اللہ ہمیں معاف فرما۔۔ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما۔۔۔ ہماری بداعمالی کو معاف فرما۔۔۔۔ یااللہ کرم فرمادے۔ہم گناہگار ہیں تو غفار ہے۔ہم عیب سے بھرے ہیں تو ستار ہے۔ہم فانی ہیں تو حی القیوم ہے۔ہم جھوٹے ہیں تو سچا ہے۔ہم ظلمت ہیں تو نور ہے۔ہم تیرے بندے ہیں تو ہمارا پالن ہار ہے۔اللہ معاف کردے۔یااللہ معاف کردے۔۔!"

آنسوؤں کی جھڑی، معافی کی تکرار، ہر آدمی، ہر نفس سے ایک ہی صدا بلند ہورہی تھی۔یااللہ معافی۔۔۔اللہ معافی۔۔۔ساعت دم بخود۔۔۔یااللہ معافی۔۔۔نطق بے جان۔۔اللہ معافی۔۔یوں جیسے خانقاہ کو نور کے دائرے اوپر سے نیچے اپنی گرفت میں لینے کو عرش سے اُتر رہے ہوں۔۔اللہ معافی۔۔۔نور۔۔۔روشنی۔۔زندگی۔۔بندگی۔۔۔عاشق معشوق کے انتظار میں۔۔مہجور ملاقات کے خیال میں۔۔اللہ معافی۔۔۔اللہ معافی۔۔۔ہر بن و مو سے صدا بلند ہورہی تھی۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔اور پھر روشنی کی شدت۔۔۔۔معلوم سے نامعلوم کا سفر۔۔۔۔ہست سے نیست کی جانب۔۔۔نیست سے ہست کا شعور اور پھر شعور اعلیٰ کے رنگ کے آگے سب بے رنگ۔۔۔بے کیف۔۔۔اصل کیف۔۔۔۔اصل رنگ تو ہی ہے۔۔۔تو ہی ہے۔۔۔تو ہی۔۔۔تو ہی تو۔۔۔اے اللہ۔۔۔تو ہی تو۔۔!"

حواس رخصت ہوگئے۔ایک میں ہی کیا۔۔وہاں موجود سب ہی بے حواس تھے۔سب ہوش و خرد سے بے گانہ ہورہے تھے۔سب ہی اُس رنگ ساز کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔جو کھرچ کھرچ کر زنگ اتار کر اپنا رنگ چڑھا رہا تھا۔ارض و سما۔۔۔تو ہی تو۔۔۔ یااللہ۔۔۔یااللہ۔۔۔یااللہ

☆.....☆.....☆

ختم شد